سوانح فضلِ عمر

جلد دوم

حضرت فضلِ عمر مرزا بشیر الدّین محمود احمد
المصلح الموعود خلیفۃ المسیح الثانی
کے
سوانحِ حیات

تصنیف
مرزا طاہر احمد

ناشرین
فضلِ عمر فاؤنڈیشن ربوہ

فہرست مضامین "سوانح فضلِ عمر" جلد دوم

عناوین	صفحہ	عناوین	صفحہ
عہدِ خلافتِ ثانیہ	۱	دوسری شادی	۴۵
حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی ایک پُرتاثیر دعا	۱	۱۹۱۴ء کا جلسہ سالانہ	۴۶
انکارِ خلافت کا پہلا فتنہ	۶	اہلِ قادیان کو نصیحت	۴۷
دعا۔ عزم اور توکّل علی اللہ	۱۳	ملاقات کے آداب	۴۸
احمدیہ کانفرنس کا انعقاد و تقریر منصبِ خلافت	۱۷	مقامِ خلافت	۴۸
زبانیں سکھانے کا پروگرام	۲۱	آپ کے طرزِ استدلال کا ایک نمونہ	۵۰
زکوٰۃ خلیفۂ وقت کے پاس آنی چاہیئے	۲۲	ازدواجی رشتے طے کرنے کے لئے رہنما اصول	۵۳
ترقّیٔ تعلیم	۲۲	زکوٰۃ کی اہمیّت	۵۷
جماعت کی دُنیوی ترقّی	۲۳	تعلیمی ترقّی کے لئے سکولوں کا قیام	۵۸
جماعتی ترقّی کا مسلسل محاسبہ	۲۳	سب سے زیادہ حسین	۶۰
کالج کا قیام	۲۴	ایک نئے اخبار کا اجراء	۶۸
خلافت پر عمومی اعتراضات کے جوابات	۲۴	احمدیہ ہوسٹل کا قیام	۶۹
متفرق مصروفیات	۲۶	سفرِ لاہور	۷۱
چندہ جات کا نظام مستحکم کرنے کے بارہ میں		سفرِ شملہ	۷۷
ایک اہم اقدام	۲۶	اطاعتِ امیر	۸۰
انجمن ترقّیٔ اسلام	۳۶	آپس کی محبّت	۸۱
قادیان ایک عظیم درسگاہ	۴۱	حضرت مسیح موعود کا اندازِ تربیت	۸۱
تحفۃ الملوک	۴۲	خلیفۂ وقت پر اعتراض	۸۱
بعض دیگر علمی کاوشیں	۴۴	خلیفۂ وقت کے مشاغل	۸۲
منارۃ المسیح کی تکمیل	۴۵	حقیقتِ حال سے بےخبر اعتراض کرتے ہیں	۸۳

عناوین	صفحہ
بعض غیر مسلم زائرین سے اِنفرادی ملاقاتیں	۸۹
تین یورپین عیسائی علماء کی قادیان میں آمد اور حضرت خلیفۃ المسیح سے دلچسپ تبادلہ خیالات	۸۹
قادیان میں پروفیسر مارگولیتھ کی آمد اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے دلچسپ گفتگو	۹۲
جماعتِ احمدیہ کے باہمی معاملات میں قانونِ شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ کا مطالبہ	۱۱۰
ایک نئے تبلیغی مشن کا قیام	۱۱۱
تبلیغ میں تزکیۂ نفس سے غافل نہ ہوں	۱۱۱
روزہ	۱۱۲
کتابیں اپنی خریدو	۱۱۳
سوال اور خوشامد کی عادت نہ ڈالو	۱۱۳
اللہ پر توکل کرو وہ خود تمہارا کفیل ہوگا	۱۱۴
لوگوں سے تعلقات	۱۱۵
دعائیں کرتے رہو	۱۱۵
جو بدی کسی قوم میں ہو اس کی تردید میں جرأت سے لیکچر دو۔	۱۱۶
اپنے کام کی پڑتال کرتے رہو	۱۱۸
قادیان آنے کی تاکید کرتے رہو	۱۱۹
جلسہ سالانہ ۱۹۱۵ء	۱۱۹
اسلوبِ بیان میں تبدیلی	۱۲۵
نظامِ جماعت احمدیہ کی تشکیل و ترویج	۱۲۶
صدر انجمن احمدیہ	۱۲۸
نظارت بیت المال	۱۳۱
نظارت تعلیم	۱۳۲
دونوں انجمنوں کا ادغام	۱۳۳
کارکنوں کا اِنتخاب	۱۳۵
نظارت علیا	۱۳۵
نظارت تالیف و تصنیف	۱۳۶
نظارت تعلیم و تربیت	۱۳۷
نظارت امورِ عامہ	۱۴۱
نظارت زراعت	۱۴۲
نظارت تجارت	۱۴۳
نظارت ضیافت	۱۴۴
نظارت بہشتی مقبرہ	۱۴۵
اِنٹرنیشنل انجمن	۱۴۶
صَدر انجمن احمدیہ کی رہنمائی اور اس کی سفارشات پر حضور کے فیصلہ کا طریق۔	۱۴۷
کارکنان کے حقوق کی حفاظت اور قدردانی	۱۵۱
ناظروں کی رہنمائی	۱۵۲
روزمرہ کے اِنتظامی امور میں طریقِ کار عمومی نگرانی اور محاسبہ۔	۱۵۶
حضور کی رہائش و سادگی	۱۶۰
حُسنِ سلوک	۱۶۰
محاسبہ کے متعلق آپ کے اصولی ارشادات اور طریقِ کار۔	۱۶۱
نظامِ امارت	۱۶۶
امارت کے فرائض	۱۶۷

عناوین	صفحہ
امیر کی پوزیشن	۱۶۸
اطاعت کی رُوح پَیدا کرو	۱۶۸
مجلسِ مشاورت کا باقاعدہ قیام	۱۷۵
آدابِ مشورہ	۱۸۰
مجلسِ شوریٰ کا طریقِ کار	۱۸۷
سَب کمیٹیوں کی تشکیل کے متعلق ہدایات	۱۸۹
نظامِ مجلسِ شوریٰ کی امتیازی خصوصیات اور تدریجی ترقّی۔	۱۹۲
عورتوں کی نمائندگی	۱۹۴
حاضری کا معیار	۱۹۶
مجلسِ شوریٰ کے ایجنڈا کی ترتیب اور ردّشدہ تجاویز۔	۱۹۷
فیصلوں کی منظوری کا طریق	۱۹۸
حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا کثرتِ رائے سے اختلاف	۲۰۱
مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کی اہمیّت	۲۰۳
مجلسِ شوریٰ کا منصب	۲۰۴
مجلسِ مشاورت کا پاکیزہ اور بے مثال ماحول	۲۰۵
بعض اہم تقاریر و تصانیف ۱۹۱۷ء-۱۹۲۰ء	۲۱۳
اِنفلوئنزہ کی عالمی وَبا اور حضور پر اس کا اثر	۲۲۹
اِسلام میں اِختلافات کا آغاز	۲۳۴
عرفانِ الٰہی	۲۳۵
ایک قادر الکلام کا اِعجاز	۲۴۴
تقدیرِ الٰہی	۲۴۵
ملائکۃ اللہ	۲۵۱

عناوین	صفحہ
مِلّتِ اِسلامیہ کی سیاسی خدمات۔ مقاصد اور لائحہ عمل۔	۲۶۳
مسٹر مانٹیگو کی ہندوستان آمد اور بعض اہم سیاسی مشورے۔	۲۷۱
معاہدہ ترکیہ۔ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات	۲۷۴
مذہبی معاملہ میں مسلمان مسٹر گاندھی کی اقتداء میں	۲۹۹
اِس وقت اس مجرّب نسخہ موالات کو استعمال کرو جو ہلاکو خاں کے ہاتھ سے عباسی سلطنت کے مٹنے پر استعمال کیا گیا نہ کہ اس کے برعکس ترکِ موالات کا نسخہ۔	۳۰۱
تحریکِ شُدھی	۳۱۱
تحریکِ شُدھی اور اس کا پیشگوئی مصلح موعود کے ساتھ ایک خاص تعلق۔	۳۲۶
اِسلامی معاشرہ میں عورت کو اس کا مقام دلوانے کی جدّوجُہد۔	۳۳۵
عورتوں کے حقوق کی حفاظت	۳۳۸
عورت کے حقوقِ وراثت کی بحالی	۳۳۸
بیاہ شادی میں عورت کی رضامندی کا حق	۳۴۰
طلاق کی حوصلہ شکنی	۳۴۰
عورتوں کی تربیت	۳۴۱
عورتوں کا اوّلین مقام	۳۴۲
عورت کا منصب آپ کے اپنے الفاظ میں	۳۴۳
مساوات کے نتیجہ میں عائد ہونے والی ذمّہ داریاں	۳۴۵
احمدی عورت سے آپ کی توقعات	۳۴۶

عناوین	صفحہ
اندازِ تربیت اور ٹھوس عملی پروگرام	۳۴۷
احمدی خواتین سے ایک منفرد قربانی کی تحریک	۳۴۷
نیکی کی عادت ڈالنا	۳۵۳
لجنہ اماءاللہ کا قیام	۳۵۵
اِصلاحی امور میں باریک بینی	۳۶۲
تعلیمِ نسواں	۳۶۶
مجلس شوریٰ میں عورتوں کی نمائندگی	۳۶۹
مسلمان عورتوں کے حالات میں تغیر	۳۷۱
حصولِ مقاصد میں لجنہ کی کامیابی کا مختصر ذکر	۳۷۹
لجنہ اماءاللہ کی تنظیم اغیار کی نظر میں	۳۸۲

عہدِ خلافتِ ثانیہ

۱۴؍مارچ بروز ہفتہ بعد نماز عصر حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے مطابق مخلصینِ جماعت احمدیہ کی دردمندانہ دُعاؤں کے ساتھ مسندِ خلافت پر متمکّن ہوئے۔ آپ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السّلام کی پُردرد اور مقبول دعاؤں کا ثمرہ تھے۔ آپ کا وجود قبولیتِ دُعا کا ایک زندہ اور مجسّم نشان تھا۔ دُعاؤں کے ساتھ آپ کو ایک عجیب نسبت تھی۔ دُعاؤں نے ہی آپ کو خلعتِ وجود بخشا۔ دُعائیں ہی آپ کا سرمایۂ حیات رہیں۔ دُعاؤں کی لوریاں سنتے ہوئے آپ کا بچپن گذرا۔ گنگناتی ہوئی دُعائیں آپ کو تھپک تھپک کر سُلایا کرتی تھیں اور دُعاؤں کی نرم و ملائم آواز ہی آپ کو خوابِ راحت سے بیدار کرتی تھی۔ آپ کی تعلیم دعاؤں کے ساتھ ہوئی۔ آپ بیمار ہوئے تو دُعاؤں سے اچھے ہوئے۔ آپ کمزور ہوئے تو دعاؤں نے آپ کو توانائی بخشی۔ زندگی کے ہر گذرے ہوئے دَور نے دعاؤں کے ساتھ آپ کو الوداع کہی۔ زندگی کے ہر آنیوالے دَور نے دعاؤں کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ ہر دروازہ جو آپ پر کھُلا دُعاؤں کے ساتھ کھُلا۔ اور ہر باب جو آپ پر بند ہُوا دُعاؤں کے ساتھ بند ہُوا۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّل ؓ کی ایک پُرتاثیر دُعا

آئیے ہم کچھ دیر کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے دَورِ خلافت کے آخری ایّام کی طرف ایک مرتبہ پھر نظر دوڑائیں۔ یہ ان ایّام کا ذکر ہے جب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل بیمار تھے۔ اور بسا اوقات بیماری اتنی شدّت اختیار کرجاتی تھی کہ جینا دُوبھر

ہوجاتا۔ ایک ایسے ہی وقت میں جبکہ آپ سخت تکلیف میں مبتلا تھے آپؓ نے اپنے بعد آنے والے کے حق میں ایک پُر درد دُعا کی جس کا ذکر خود آپ کے ہی الفاظ میں درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"آج مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ مَیں نے سمجھا اب اس دُنیا میں نہیں رہُوں گا۔ سو مَیں نے دُو رکعت نماز پڑھی اور الحمد شریف کے بعد پہلی رکعت میں سُورۃ الضحٰی اور دوسری رکعت میں اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ کی تلاوت کی۔ پھر مَیں نے دُعا کی۔ الٰہی! ہم پر ہر طرف سے غدر ہو گیا....... الٰہی اسلام پر بڑا تبر چل رہا ہے۔ مسلمان اوّل تو سُست ہیں پھر دینِ اسلام۔ قرآنِ کریم اور نبی کریمؐ سے بے خبر۔ تُو ان میں ایسا آدمی پیدا کر جس میں قوّتِ جاذبہ ہو وہ کاہل و سُست نہ ہو ہمّت بلند رکھتا ہو۔ باوجود ان باتوں کے وہ کمال استقلال رکھتا ہو۔ دُعاؤں کا مانگنے والا ہو تیری تمام یا اکثر رضاؤں کو پُورا کیا ہو۔ قرآن وحدیث سے باخبر ہو۔ پھر اس کو ایک جماعت بخش اور وہ جماعت ایسی ہو جو نفاق سے پاک ہو۔ تباغض ان میں نہ ہو۔ اس جماعت کے لوگوں میں خوب ہمّت اور استقلال ہو۔ قرآن وحدیث سے واقف ہوں اور ان پر عامل اور دُعاؤں کے مانگنے والے ہوں۔ ابتلاء تو ضرور آویں گے۔ ان ابتلاؤں میں اُن کو ثابت قدمی عطا فرما۔ ان کو ایسے ابتلاء نہ آئیں جو اُن کی طاقت سے باہر ہوں۔" (مطبوعہ الحکم ۱۴/اپریل ۱۹۱۴ء)

آج وہ دن تھا کہ اس دُعا کی قبولیّت کا مجسّم نشان، بے پناہ قوّتِ جاذبہ کا مالک، بلند ہمّت اور کمال درجہ کا استقلال رکھنے والا، دُعاؤں کا بکثرت مانگنے والا اور رضائے الٰہی کے پورا کرنے میں ہمیشہ مُستعد، قرآن وحدیث سے باخبر، ایک ایسا باہمّت اور اولوالعزم رہنما، جماعت کو عطا ہُوا جس کی کامیاب سیادت میں جماعت احمدیّہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک ترقی کی بلند سے بلند تر منازل طے کرتی چلی گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ

نے اس باہمّت نوجوان کو وہ جماعت بھی بخشی جو نفاق اور تباغض سے پاک تھی، ہے اور رہے گی (انشاء اللہ) اس میں جذب اور ہمّت اور استقلال کے حامل اور قرآن وحدیث کے ایسے عاشق باعمل پیدا کئے جو دعاؤں کا سہارا لیتے ہوئے خطرناک سے خطرناک ابتلاؤں میں بھی ثابت قدم رہے، اور ان کے پائے ثبات واستقلال میں کبھی کوئی لغزش نہ آئی اور صدق ووفا بڑھتا ہی رہا۔

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدّین محمُود احمد صاحب کا مسندِ خلافت پر متمکّن ہونا گویا آپ کی زندگی میں ایک خَلقِ آخر کا مقام رکھتا تھا۔ اور ایک نئی حیثیّت سے ایک نئے خلعت کے ساتھ آپ جماعت احمدیّہ اور دُنیا کے سامنے ظاہر ہوئے۔ اس موقعہ پر ذہن اس خلقِ اوّل کی طرف پھر رجوع کرتا ہے جبکہ آپ کی پیدائش سے قبل آپ کے دشمنوں نے بڑی تعلّی کے ساتھ آپ کے بچپن ہی میں ہلاک ہو جانے اور سلسلہ عالیہ احمدیّہ کے تباہ ہونے کی پیشگوئی کی تھی۔ اس خَلقِ آخر کے دَوران بھی کم وبیش ویسی ہی صورت پیدا ہوئی اور آپ کے ذاتی مخالفین اور معاندین نے بڑی شدّت کے ساتھ یہ دعوے کئے کہ یہ خلافت چند دن کی مہمان ہے جلد ہی صفحۂ ہستی سے مٹ کر نسیًا منسیا ہو جائے گی اور ساتھ ہی جماعت احمدیّہ قادیان کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا۔ جس طرح خلقِ اوّل کے وقت دشمنوں کی پیشگوئی باطل اور محض ایک نفسانی آرزو ثابت ہوئی اسی طرح خَلقِ آخر کے وقت بھی وہی منظر دُنیا نے دیکھا اور جس خلافت کے متعلق کہا جاتا تھا کہ چند سال سِسک سِسک کر دم توڑ دے گی وہ ۵۲ سال تک دُنیا میں بڑے جاہ وجلال اور تمکنت کے ساتھ مسند افروز رہی اور خدا نے اس نوجوان کو اس کے نفسی نقطۂ آسمان کی طرف نہ اُٹھایا جب تک وہ کلام اللہ کا مرتبہ ظاہر کر کے زمین کے کناروں تک شہرت نہ پا گیا۔ لیکن ابھی ان باتوں کے ظاہر ہونے کا وقت نہ آیا تھا۔ ابھی تو اولوالعزمی کے امتحان کے دن تھے۔ ابھی تو یہ سوال تھا کہ مخالفت کی شدید آندھی کے مقابل پر یہ نازک پودا قائم بھی رہ سکیگا یا نہیں۔ جیسا ابتلاء اس وقت آیا تھا اور جس طرح گھر گھر پر ایک زلزلہ کی سی کیفیّت طاری ہوئی تھی۔ گو بعد میں بھی بہت ابتلاء آئے لیکن اولوالعزمی کے امتحانوں میں بلا شُبہ یہ ایک خاص امتحان تھا اس موقعہ پر آپ کی ایک رؤیا کا ذکر مناسب ہوگا جس میں آپ کو آئندہ پیش آنے والے مہیب خطرات سے پہلے ہی متنبّہ کر دیا گیا تھا۔ اور ان

سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا رُوحانی طریق بھی سکھا دیا گیا تھا۔ اس رؤیا کا ذکر کرتے ہوئے جو ۱۹۱۳ء میں اپنے قیامِ شملہ کے دَوران آپ نے دیکھا آپ فرماتے ہیں:-

"مَیں نے دیکھا کہ کوئی بہت بڑا اور اہم کام میرے سپُرد کیا گیا ہے اور یُوں معلوم ہوتا ہے کہ میرے رستہ میں مشکلات کے پہاڑ ہیں۔ مَیں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر جانا چاہتا ہوں ایک فرشتہ میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ تمھیں پتہ ہے اس کام کی تکمیل کے راستہ میں بہت سی رُکاوٹیں ہیں۔ یہ راستہ بڑا خطرناک ہے۔ اس میں بڑے مصائب اور ڈراونے نظارے ہیں ایسا نہ ہو تم ان سے متأثر ہو جاؤ اور منزل پر پہنچنے سے رہ جاؤ اور پھر کہا کہ مَیں تمھیں ایسا طریق بتاؤں جس سے تم محفوظ رہو۔ مَیں نے کہا ہاں بتاؤ۔ اس پر اس نے کہا کہ بہت سے بھیانک نظارے ہوں گے مگر تم اِدھر اُدھر نہ دیکھنا اور نہ ان کی طرف متوجّہ ہونا۔ "خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ"۔ "خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ" کہتے ہوئے سیدھے چلے جانا۔ اُن کی غرض یہ ہوگی کہ تم ان کی طرف متوجّہ ہو جاؤ۔ اگر تم ان کی طرف متوجّہ ہوگئے تو اپنے مقصد کے حصُول میں ناکام رہ جاؤ گے۔ اس لئے اپنے کام میں لگ جاؤ۔ چنانچہ مَیں جب چلا تو مَیں نے دیکھا کہ نہایت اندھیرا اور گھنا جنگل تھا۔ اور ڈر اور خوف کے بہت سے سامان جمع تھے۔ اور جنگل بالکل سنسان تھا۔ جب مَیں ایک خاص مقام پر پہنچا جو بہت ہی بھیانک تھا تو بعض لوگ آئے اور مجھے تنگ کرنا شروع کیا تب مجھے معاً خیال آیا کہ فرشتہ نے مجھے کہا تھا کہ "خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ" کہتے چلے جانا۔ اس پر مَیں نے ذرا بلند آواز سے یہ فقرہ کہنا شروع کیا اور وہ لوگ چلے گئے۔ اس کے بعد پھر پہلے سے بھی زیادہ خطرناک راستہ آیا

اور پہلے سے بھی بھیانک شکلیں نظر آنے لگیں حتیٰ کہ بعض سر کٹے ہوئے جن کے ساتھ دھڑ نہ تھے ہوا میں معلّق میرے سامنے آئے اور طرح طرح کی شکلیں بنانے اور مُنہ چڑانے۔ مجھے غصّہ آتا لیکن معاً فرشتے کی نصیحت یاد آجاتی اور مَیں پہلے سے بھی بلند آواز سے " خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ " کہنے لگتا اور پھر وہ نظارہ بدل جاتا یہاں تک کہ سب بلائیں دُور ہوگئیں اور مَیں منزل پر خیریّت سے پہنچ گیا۔"

(الفضل ۷ر اپریل ۱۹۳۵ء المو عود صفحہ ۱۱۳ تقریر جلسہ سالانہ ۱۹۴۴ء)

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمّہ داریاں سنبھالتے ہی نہایت مشکل اور صبر آزما حالات اور ابتلاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے آپ کو ہر مشکل وقت میں اپنے خاص " فضل اور رحم" کا سہارا دیا اور خطرناک سے خطرناک وادی سے آپ اپنی جماعت کو نہایت کامیابی اور کامرانی سے بچاتے ہوئے فتح و نصرت کی نئی منازل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

دوست تو الگ رہے اولوالعزمی کے اس پیکر کو وہ مشاہیر بھی خراجِ تحسین پیش کئے بغیر نہ رہ سکے جو دوستوں کے زُمرہ میں شامل نہ تھے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی شدید مخالفانہ حالات میں آپ کے ثباتِ قدم سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:-

" مخالفت کی آندھیوں میں اطمینان سے کام کرکے اپنی مُغلئی جوانمردی کو ثابت کر دیا ہے۔"

("قلمی چہرے" مصنّفہ خواجہ حسن نظامی)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ "مغلئی جوانمردی مت کہو کہ یہ جوانمردی تو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ دفن ہو کر ایک قصّۂ پارینہ بن گئی۔ کہو تو یُوں کہو کہ لاریب اس نے مخالفت کی آندھیوں میں اطمینان سے کام کرکے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک صاحبِ شکوہ و عظمت اولوالعزم " مرد تھا جس کے سر پہ خدا کا سایہ تھا۔

انکارِ خلافت کا پہلا فتنہ

سب سے پہلے آپ کو فتنہ انکارِ خلافت کا سامنا کرنا پڑا۔ جماعت احمدیہ پر ایک کڑا وقت آن پڑا تھا۔ قادیان میں حاضر احمدیوں میں سے اگرچہ جمہور نے بڑے اخلاص اور پاک نیت کے ساتھ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد کے ہاتھ پر بیعت کر کے نظامِ خلافت کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا تھا لیکن نظامِ جماعت کے اہم عہدوں پر ابھی تک منکرینِ خلافت قابض تھے۔ پریس کا بیشتر حصہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ روپے پیسے کی کنجیاں ان کے پاس تھیں اور ایسی معروف اور بظاہر عظیم شخصیتیں ان کی ہمخیال تھیں جن کا اثر جماعت پر بلاشبہ بڑا گہرا اور وسیع تھا۔ ان میں مولانا محمد علی صاحب پیش پیش تھے جن کو دنیاوی علم کی برتری کے باعث اور انگریزی تفسیر القرآن کا مقدس کام تفویض ہونے کے سبب نیز صدر انجمن احمدیہ کے سیکرٹری ہونے کی وجہ سے جماعت میں ایک غیر معمولی عزت اور احترام کا مقام حاصل تھا۔ پھر سلسلہ کے بعض اور اہم افراد جن میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب خواجہ کمال الدین صاحب وکیل، شیخ رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں بھی اس گروہ میں شامل تھے۔ اور مولوی محمد علی صاحب کی سرکردگی میں منکرینِ خلافت کی صفِ اوّل میں کھڑے تھے (اگرچہ خواجہ صاحب اس وقت مُلک سے باہر تھے۔ لیکن ان کا اس گروہ سے گہرا تعلق اور بشدّت اُن کا ہمخیال ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی) ان میں سے اکثر صدر انجمن احمدیہ کے ممبر ہونے کی وجہ سے بھی جماعت میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ انتخابِ خلافت کے ساتھ ہی انہوں نے جماعت کے تمام ابلاغ و اشاعت کے ذرائع بروئے کار لاتے ہوئے سارے ہندوستان میں نظامِ خلافت کی تردید میں ایک خطرناک اور زہریلے پراپیگنڈا کی مہم بڑی سرعت کے ساتھ شروع کر دی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پراپیگنڈا کا یہ منصوبہ خفیہ طور پر خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی تیار ہو کر آپ کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آنے کا منتظر تھا۔ اس منصوبہ کے تحت بکثرت جماعتوں میں یہ مہلک خیال پھیلایا گیا کہ مرزا محمود احمد اور اُن کے رفقاء نے اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کی

خاطر نظامِ خلافت کا یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام واضح طور پر صدر انجمن احمدیہ کو اپنا جانشین مقرر فرما گئے تھے۔ نیز یہ کہا گیا کہ ابھی سے ان لوگوں نے دین کو بگاڑنا شروع کر دیا ہے اور اگر اس نعوذ باللہ گمراہ کُن غیر ذمہ دار کچّی عمر کے نوجوان کی قیادت کو جماعت احمدیہ نے قبول کر لیا تو دیکھتے دیکھتے احمدیّت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور قادیان پر عیسائیت قابض ہو جائے گی۔ اس قسم کے زہریلے پراپیگنڈہ سے لیس بیسیوں کارندے ہر طرف جماعتوں میں دَوڑا دیئے گئے اور انہیں خلافت کی بیعت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ان حالات کے پیشِ نظر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے خلافت پر متمکّن ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بکثرت رسائل اور اشتہارات کے ذریعے جماعت پر اصل صورتِ حال واضح فرمائی اور منکرینِ خلافت کے ہر قسم کے اعتراضات کا مؤثر جواب دیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے آپ کا اشتہار "کون ہے جو خدا کے کام کو روک سکے" بشدّت ہماری توجّہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ یہ اشتہار جہاں ایک طرف ہمیں آپ کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور واضح قوّتِ استدلال سے روشناس کرواتا ہے وہاں آپ کے توکّل علی اللہ، عزمِ صمیم، یقینِ کامل اور خلوصِ قلب کی بھی روشن دلیل ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

> "مجھے اس مضمون کے لکھنے کی اس لئے ضرورت پیش آئی ہے کہ مَیں دیکھتا ہوں کہ جماعت میں تفرقہ کے آثار ہیں بعض لوگ خلافت کے خلاف لوگوں کو جوش دلا رہے ہیں یا کم سے کم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خلیفہ ایک پریذیڈنٹ کی حیثیت میں ہو اور یہ کہ ابھی تک جماعت کا کوئی خلیفہ نہیں ہوُا۔ مگر مَیں اس اعلان کے ذریعہ سے تمام جماعت کو اطلاع دیتا ہوں، کہ خلیفہ کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ مَیں ثابت کر چکا ہوں۔ اس کی بیعت کی بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح حضرت خلیفۂ اوّلؓ کی تھی۔ یہ بات بھی غلط مشہُور کی جاتی ہے کہ جماعت کا اس وقت تک کوئی خلیفہ مقرر نہیں ہوُا۔ بلکہ خدا نے جسے خلیفہ بنانا تھا بنا دیا اور اب جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے، وُہ

خدا کی مخالفت کرنا ہے۔

مَیں نے کسی سے درخواست نہیں کی کہ وہ میری بیعت کرے، نہ کسی سے کہا کہ وہ میرے خلیفہ بننے کے لئے کوشش کرے اگر کوئی شخص ایسا ہے تو وہ علی الاعلان شہادت دے کیونکہ اس کا فرض ہے کہ جماعت کو دھوکے سے بچائے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ خدا کی لعنت کے نیچے ہے اور جماعت کی تباہی کا عذاب اس کی گردن پر ہوگا۔ اے پاک نفس انسانو! جن میں بدظنّی کا مادہ نہیں مَیں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں نے کبھی انسان سے خلافت کی تمنّا نہیں کی اور یہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے بھی کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ وہ مجھے خلیفہ بنا دے یہ اس کا اپنا فعل ہے یہ میری درخواست نہ تھی۔ میری درخواست کے بغیر یہ کام میرے سپرد کیا گیا ہے اور یہ خدا تعالےٰ کا فعل ہے کہ اس نے اکثروں کی گردنیں میرے سامنے جھکا دیں مَیں کیونکر تمہاری خاطر خدا تعالےٰ کے حکم کو ردّ کروں مجھے اس نے اسی طرح خلیفہ بنایا جس طرح پہلوں کو بنایا تھا۔ گو مَیں حیران ہوں کہ میرے جیسا نالائق انسان اُسے کیونکر پسند آگیا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو اس نے مجھے پسند کر لیا اور اب کوئی انسان اس کُرتہ کو مجھ سے نہیں اُتار سکتا جو اس نے مجھے پہنایا ہے یہ خدا کی دین ہے اور کونسا انسان ہے جو خدا کے عطیہ کو مجھ سے چھین لے۔ خدا تعالےٰ میرا مددگار ہوگا۔ مَیں ضعیف ہوں مگر میرا مالک بڑا طاقتور ہے۔ مَیں کمزور ہوں۔ مگر میرا آقا بڑا توانا ہے۔ مَیں بلا اسباب ہوں مگر میرا بادشاہ تمام اسبابوں کا خالق ہے۔ مَیں بے مددگار ہوں مگر میرا ربّ فرشتوں کو میری مدد کے لئے نازل فرمائیگا انشاء اللہ۔ مَیں بے پناہ ہوں مگر میرا محافظ وہ ہے جس کے ہوتے ہوئے

کسی پناہ کی ضرورت نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں مَیں جھوٹا ہوں اور یہ کہ مَیں مدّتوں سے بڑائی کا طلب گار تھا اور فخر میں مبتلا تھا جاہ طلبی مجھے چین نہ لینے دیتی تھی۔ مگر مَیں ان لوگوں کو کہتا ہوں کہ تمہارا اعتراض تو وہی ہے جو ثمود نے صالح پر کیا یعنی بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ[1] وہ تو جھوٹا اور متکبّر اور بڑائی کا طالب ہے اور مَیں بھی تم کو وہی جواب دیتا ہوں جو حضرت صالح علیہ السّلام نے دیا کہ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ[2] ذرا صبر سے کام لو، خدا تعالیٰ کچھ دنوں تک خود بتا دے گا کہ کون جھوٹا اور متکبّر ہے اور کون بڑائی کا طلب گار ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلافت کے انتخاب کے لئے ایک لمبی میعاد مقرر ہونی چاہیئے تھی کہ کُل جماعتیں اکٹھی ہوتیں اور پھر انتخاب ہوتا لیکن اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی جاتی کہ ایسا کیوں ہوتا نہ تو ایسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہؤا اور نہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی وفات پر ہؤا۔ حضرت مولوی نورالدّین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بعیت کرنے والے بارہ سو آدمی تھے اور چوبیس گھنٹے کا وقفہ ہؤا تھا۔ لیکن اب اٹھائیس گھنٹے کے وقفہ کے بعد قریبًا دو ہزار آدمی نے ایک شخص کے ہاتھ پر بعیت کی....... حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر تو ابتداء میں صرف تین آدمیوں نے بعیت کی تھی یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے مہاجرین میں سے اور قیس ابن سعدؓ نے انصار میں سے اور بعیت کے وقت بعض لوگ تلواروں کے ذریعے بعیت کو روکنا چاہتے تھے دیکھ کر لوگوں کو اُٹھانا چاہتے تھے اور بعض تو ایسے جوش میں تھے کہ طعنہ دیتے تھے اور بعیت کو لغو قرار دیتے تھے

---

[1] سورۂ قمر آیت ۲۶ - [2] سورۂ قمر آیت ۲۷

توکیا اس کا نتیجہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ نعوذ باللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت کی خواہش تھی کہ صرف تین آدمیوں کی بیعت پر آپ بیعت لینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور باوجود سخت مخالفت کے بیعت لیتے رہے یا یہ نتیجہ نکالا جائے کہ آپ کی خلافت ناجائز تھی مگر جو شخص ایسا خیال کرتا ہے وہ جھوٹا ہے....

پس خدا کا خوف کرو اور اپنے منہ سے وہ باتیں نہ نکالو جو تمہارے لئے مصیبت کا باعث ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو اور وہ سلسلہ جو اس کے مامور نے سالہا سال کی مشقّت اور محنت سے تیار کیا تھا اُسے یُوں اپنے بُغضوں اور کینوں پر قربان نہ کرو۔

مجھ پر اگر اعتراض ہوتے ہیں کیا ہوُا ؟ مجھے وہ شخص دکھاؤ جس کو خدا نے اس منصب پر کھڑا کیا جس پر مجھے کیا اور اس پر کوئی اعتراض نہ ہوُا ہو۔ جبکہ آدم پر فرشتوں نے اعتراض کیا تھا۔ تو مَیں کون ہوں جو اعتراضوں سے محفوظ رہوں فرشتوں نے بھی اپنی خدمات کا دعویٰ کیا تھا۔ اور ابلیس نے بھی اپنی بڑائی کا دعویٰ کیا تھا۔ مگر بے خدمت آدم جو اِن کے مقابلہ میں اپنی کوئی بڑائی اور خدمت نہیں پیش کر سکتا تھا۔ خدا کو وہی پسند آیا اور آخر سب کو اس کے سامنے جُھکنا پڑا۔

وہ لوگ جو میری مخالفت کرتے ہیں یا اب تک بیعت میں داخل نہیں ہوئے آخر کیا چاہتے ہیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ آزاد رہیں۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ ان کا ایسا کرنا اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے مترادف ہو گا۔ پھر کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی اور خلیفہ مقرر کریں اگر وہ ایسا چاہتے ہیں تو یاد رکھیں کہ ایک وقت میں دو خلیفہ نہیں ہو سکتے اور شریعتِ اسلام اِسے قطعًا حرام قرار دیتی ہے پس اب وہ جو کچھ بھی

کریں گے اس سے جماعت میں تفرقہ پیدا کریں گے........

میرا دل اس تفرقہ کو دیکھ کر اندر ہی اندر گھُلا جاتا ہے اور مَیں اپنی جان کو پگھلتا ہؤا دیکھتا ہوں رات اور دِن مَیں غم و رنج سے ہم صحبت ہوں اس لئے نہیں کہ تمہاری اطاعت کا مَیں شائق ہوں بلکہ اس لئے کہ جماعت میں کسی طرح اتحاد پیدا ہو جائے۔ لیکن مَیں اس کے ساتھ ہی کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا جو عہدۂ خلافت کی ذلت کا باعث ہو۔ وہ کام جو خدا نے میرے سپرد کیا ہے خدا کرے کہ عزت کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہو سکوں اور قیامت کے دن مجھے اپنے مولے کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

اب کون ہے جو مجھے خلافت سے معزول کر سکے۔ خدا نے مجھے خلیفہ بنایا ہے اور خدا تعالےٰ اپنے انتخاب میں غلطی نہیں کر سکتا اگر سب دنیا مجھے مان لے تو میری خلافت بڑی نہیں ہو سکتی اور اگر سب کے سب خدانخواستہ مجھے ترک کر دیں تو بھی خلافت میں فرق نہیں آسکتا۔ جیسے نبی اکیلا بھی نبی ہوتا ہے اسی طرح خلیفہ اکیلا بھی خلیفہ ہوتا ہے۔ مبارک ہے وہ جو خدا کے فیصلے کو قبول کرے۔

خدا تعالیٰ نے جو بوجھ مجھ پر رکھا ہے وہ بہت بڑا ہے اور اگر اسی کی مدد میرے شاملِ حال نہ ہو تو مَیں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس پاک ذات پر یقین ہے کہ وہ ضرور میری مدد کرے گی میرا فرض ہے کہ جماعت کو متحد رکھوں اور انہیں متفرق نہ ہونے دُوں۔ اس لئے ہر مشکل کا مقابلہ کرنا میرا کام ہے اور انشاء اللہ آسمان سے میری مدد ہوگی۔ مَیں اس اعلان کے ذریعہ ہر ایک اس شخص پر جو ابتک بعیت میں داخل نہیں ہؤا یا بعیت کے عہد میں متردّد ہے۔ حجّت

پُوری کرتا ہوں اور خدا کے حضور میں اب مجھ پر کوئی الزام نہیں خدا کرے میرے ہاتھ سے یہ فساد فرو ہوجائے اور یہ فتنہ کی آگ بجھ جائے تاکہ وہ عظیم الشان کام جو خلیفہ کا فرضِ اوّل ہے یعنی کُل دُنیا میں اپنے مطاع کی صداقت کو پہنچانا مَیں اس کی طرف پوری توجّہ کرسکوں۔ کاش مَیں اپنی موت سے پہلے دنیا کے دُور دراز علاقوں میں صداقتِ احمدیت روشن دیکھ لوں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز۔......

فتنے ہیں اور ضرور ہیں مگر تم جو اپنے آپ کو اتحاد کی رسّی میں جکڑ چکے ہو خوش ہو جاؤ کہ انجام تمہارے لئے بہتر ہوگا تم خدا کی ایک برگزیدہ قوم ہوگے اور اس کے فضل کی بارشیں انشاء اللہ تعالےٰ تم پر اس زور سے برسیں گی کہ تم حیران ہو جاؤ گے........

خاکسار مرزا محمود احمد از قادیان
۲۱ر مارچ ۱۹۱۴ء

(اشتہار بعنوان "کون ہے جو خدا کے کام کو روک سکے"
مندرجہ ضمیمہ اخبار الفضل قادیان ۲۵ر مارچ ۱۹۱۴ء)

دُعاء۔ عزم اور توکّل علی اللہ

اس دَور میں سب سے نمایاں خصوصیّت جو حضرت خلیفۃ المسیح کے کردار میں نظر آتی ہے وہ دُعاء۔ عزم اور توکل علی اللہ کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ فتنہ انکارِ خلافت کے مقابلہ کے لئے حدِّ امکان تک جو ظاہری اسباب اختیار کئے جا سکتے تھے وہ آپ نے کئے لیکن ایک لحظہ کے لئے بھی کبھی ان اقدامات پر بھروسہ نہ کیا اور انہیں کافی نہ سمجھا بلکہ مسلسل عاجزانہ دعاؤں کے ذریعہ آپ نے اللہ تعالےٰ سے مدد مانگی۔ اور جماعت کو بھی بار بار اس طرف توجّہ دلاتے رہے۔ صاحبِ عزم تو آپ تھے ہی دُعاؤں نے اس عزم کو دو بالا کر دیا۔ اور دعاء اور عزم کے ملاپ سے ایک ایسا توکّل آپ کے اندر پیدا ہؤا جس کی نظیر دنیوی رہنماؤں میں تلاش کرنا محض عبث اور بے معنی ہے۔ آپ کے عزم اور توکّل کا امتزاج نورٌ علیٰ نور کا ایک دلکش منظر پیش کرتا تھا ایک طرف آپ دُعا کرتے۔ خدا تعالےٰ کی طرف جھکتے اور جماعت کو بھی اس کی تلقین فرماتے تو دوسری طرف بار بار بلا اشتباہ یہ بات واضح کرتے چلے جاتے کہ یہ کوئی کارِ دُنیا نہیں مَیں محض خدا تعالےٰ کی رضا کے مطابق فیصلے کروں گا اور اس کے بعد مجھے ایک ذرّہ بھی اس بات کی پرواہ نہیں ہوگی کہ دُنیا میں کوئی اور میرا ساتھ دیتا ہے یا نہیں۔ آپ کے اس کردار کو نمایاں طور پر سمجھنے کے لئے ۹ر مارچ ۱۹۱۴ء کی ایک تقریب کے دَوران آپ کے مندرجہ ذیل ملفوظات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ اس اعلان کے ایک دوسرے حصّہ کو ملا کر پڑھا جائے جو آپ نے ۶ر اپریل ۱۹۱۴ء کو شائع فرمایا تو تصویر مکمّل ہو جاتی ہے۔

”خوب یاد رکھو اس وقت موجودہ صورت میں وہ کام جو پچیس ۲۵
سال میں حضرت مسیح موعود علیہ السّلام اور ان کے بعد ۶ سال
تک حضرت خلیفۃ المسیح نے کیا تھا خطرہ کی حالت میں ہے
ایک جماعت ہے جو اس کے ٹکڑے کر دینے میں فرق نہیں کرتی
ان کو مدِّ نظر ہے کہ مقابل والوں کو شکست دے دیں۔ وُہ

زور لگا رہے ہیں۔ اپنے علم اور طاقت کو اس مقصد کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک طاقت ہیں اور ہم یہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ ہم تو بالکل ناتواں ہیں۔ ہاں ہمارا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔ وہ بڑی طاقتوں اور قدرتوں والا ہے۔ وہ اپنے سلسلہ کو ہر ایک شر اور ضرر سے بچا سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بچائے گا۔

مَیں اِس وقت اُس دل کو متقی نہیں سمجھتا جس میں اس کے لئے درد نہ ہو۔ پس مَیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے حضور میں گر جاؤ اور کہو کہ اے مولیٰ کریم! یہ نظارہ تو ہمارے وہم میں بھی نہ تھا کہ وہ جماعت جس کو تونے اپنے ہاتھ سے بنایا اور ۳۱ سال سے توُ اس کی حفاظت کرتا آیا ہے اب اس پر یہ ابتلاء آیا ہے کہ وہ غیروں کے نہیں اپنوں کے ہاتھ سے خطرہ میں ہے۔ مجھے تو اس تصوّر اور وہم سے ہی جنون ہونے لگتا ہے کہ وہ جماعت جو بڑی کوشش اور عقدِ ہمّت۔ سوز و گداز سے تیار کی گئی تھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاوے۔ مگر خدا تعالیٰ سے ڈھارس آتی اور اس سے تسلّی ملتی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ پس تم راتوں کو اُٹھ کر تہجّد پڑھو۔ جو روزے رکھ سکتے ہیں وہ روزے رکھیں۔ صدقات اور خیرات کریں اور دن کی عبادتوں میں بھی زیادتی کرو۔ ایک شخص نے مجھے کہا کہ نماز کے لئے آنکھ نہیں کھلتی۔ مجھے اس پر رونا آیا کہ اس کو نیند کس طرح آتی ہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ روزے اور عبادت زیادہ کرنے صدقات و خیرات سے مصائب ٹل جایا کرتے ہیں۔ پس تم تہجّد اور نوافل میں سُستی نہ کرو۔ اور مل کر دُعائیں کرو کہ مولیٰ کریم احمدی جماعت کو ایک نقطہ پر متحد کر دے۔ مجھے تسلّی

اور یقین ہے اور ذرا بھی وہم نہیں۔ خدا تعالےٰ مظفّر و منصور کرے گا اور ضرور کرے گا۔ مگر خدا تعالےٰ کی نصرت اور تائید کے لئے اپنے آپ کو اہل ثابت کردو۔ بدر کی جنگ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دُعاؤں میں لگے ہوئے تھے کہ کیا آپ سے اللہ تعالےٰ کے وعدے نہیں ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ وعدے ہیں مگر مَیں غنا سے ڈرتا ہوں۔ پس یاد رکھو کہ اس کے بڑے بڑے وعدے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ہیں۔ وہ اس سلسلہ کو غالب کرے گا۔ اس کی حفاظت کرے گا ضرور کرے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے غنا سے مَیں بھی ڈرتا ہوں۔ اس لئے ہمیں اپنے اعمال سے بتا دینا چاہیئے کہ ہم ان وعدوں کے مستحق ہیں۔

دکھ ایک دن کا بھی بُرا ہے۔ دن تو پھر دن ہے آدھ گھنٹہ کا بھی برا ہوتا ہے۔ جان نکلنے لگتی ہے اب تو اس مصیبت پر پانچ دن گذر گئے۔ یہ چھوٹا سا غم نہیں۔ کسی کا چھوٹا سا بچّہ بیمار ہو تو وہ گھبرا جاتا ہے۔ یہاں تو وہ بیمار ہیں جنہیں برسوں میں پرورش کیا گیا۔ (الفضل ۲۵ مارچ ۱۹۱۴ء صفحہ ۳-۴)

(ب) "میرا فرض ہے کہ جماعت کو ایک نقطہ پر جمع کروں۔ اس لئے خواہ اس کام میں میرے راستہ میں کتنی ہی مشکلات پیش آئیں مَیں اللہ تعالےٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے توفیق دے گا کہ جرأت سے ہر ایک دقّت کا مقابلہ کروں۔

مَیں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ میرا ساتھ دینگے

یا نہیں۔ میرا اللہ تعالےٰ پر بھروسہ ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جو میرا کوئی نقصان کر سکے یا مجھے کوئی نفع دے سکے۔
پس اگر مَیں لوگوں کے جذبات کے ماتحت چل کر اتحادِ جماعت کے خیال کو چھوڑ دوں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مَیں حکومت کا خواہاں ہوں نہ کہ خادمِ سلسلہ ہوں۔ پس مَیں اللہ تعالےٰ کے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ اُسی کی توفیق سے ہی مَیں ہر ایک ایسی تدبیر کروں گا۔ جس سے جماعت کو پھر ایک فردِ واحد کے ہاتھ پر جمع کرنا ممکن ہو۔ میں اللہ تعالےٰ پر امید رکھتا ہوں کہ وہ میرا دل بھی حضرت ابُو بکر رضی اللہ عنہ کی طرح مضبوط کر دے اور مَیں بھی کہہ سکوں کہ خواہ تم سب مجھے چھوڑ دو اور جنگل کے درندے بھی میرے مخالفوں کے ساتھ مل کر مجھ پر حملہ کریں تو مَیں اکیلا ان کا مقابلہ کروں گا جب تک کہ وہ میرے ہاتھ پر اسی طرح نہ اکٹھے ہو جائیں جس طرح کہ خلیفہ اوّل کے ہاتھ پر اکٹھے ہو گئے تھے واللہ المستعان۔" (الفضل ۶ر اپریل ۱۹۱۴ء صفحہ ۱۶)

اس دعاء، اس عزم، اس توکّل، اس انابت الی اللہ اور سعیٔ پیہم کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ منتشر ہوتی ہوئی جماعت بڑی سرعت کے ساتھ پھر ایک ہاتھ پر اکٹھی ہونے لگی اور بکھرتے ہوئے اوراق پھر مجتمع ہو کر ایک مضبوط شیرازے میں بندھ گئے وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا[1] کا وعدہ ایک مرتبہ پھر پورا ہوا۔ ایک بار پھر یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ اسلام کی زندگی اس کی تمکنت اور اس کا امن ہمیشہ کے لئے نظامِ خلافت سے وابستہ ہو چکے ہیں۔

---

[1] سورۂ نور آیت ۵۶۔

احمدیہ کانفرنس کا انعقاد اور تقرر منصبِ خلافت

منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی فتنہ انکارِ خلافت سے پیدا ہونے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور آئندہ جماعت احمدیہ کو ایک ٹھوس لائحہ عمل دینے کی خاطر آپ نے ۱۲ر اپریل کو جماعت احمدیہ کے نمائندگان کی ایک کانفرنس بلائی جسے "احمدیہ کانفرنس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کانفرنس میں ایسے اہم اور دُور رس فیصلے کئے گئے جن سے ہمیشہ کے لئے مقامِ خلافت واضح اور روشن ہو کر جماعت کے سامنے آ گیا۔ اور اس بارہ میں فتنہ و فساد اور شکوک و ابہام کے خطرات ختم ہو گئے اگرچہ الٰہی سلسلوں پر فتنے ہمیشہ آتے ہی رہتے ہیں اور ان کی تطہیر کی غرض سے ابتلاء ان کا مقدر ہے لیکن جہاں تک اس سوال کا تعلق تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا حقیقی جانشین کون ہے اور کسی انجمن کو خلافت کے مقابل پر کیا حیثیت حاصل ہے اس کانفرنس میں اس سوال کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا گیا اور اس کے بعد جماعت مبائعین کو کبھی اس بارہ میں وسوسہ یا تردّد پیدا نہ ہوا۔ نہ انشاء اللہ آئندہ کبھی ہو گا یہ بنیادی فیصلہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ حسب ذیل تھا:۔

> "اس قاعدہ میں حسب حالات ترمیم ہونی چاہیئے جس میں صدر انجمن احمدیہ اور امامِ وقت کے تعلق کی وضاحت کی گئی ہے۔
> تاکہ جماعت میں تفرقہ اور دو عملی کے حالات پیدا نہ ہوں
> اور جماعت کا حقیقی اتحاد قائم رہے۔"

بعد میں مختلف مقامی جماعتوں کی اکثریت نے بھی مجلس مشاورت کے اس فیصلہ کی تائید میں ریزولیوشن پاس کئے اور مجلس معتمدین سے درخواست کی کہ وہ جماعت کی خواہش کے مطابق اس مسئلہ سے متعلق قاعدہ نمبر ۱۸ میں مجوزہ تبدیلی کا فیصلہ کرے۔ چنانچہ مجلس معتمدین نے اس جماعتی مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے اپنے اجلاس مورخہ ۲۶ر اپریل ۱۹۱۴ء میں زیر ریزولیوشن نمبر ۱۹۸ فیصلہ کیا کہ صدر انجمن احمدیہ کے قاعدہ نمبر ۱۸ میں الفاظ "حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام" کی جگہ "حضرت

خلیفۃ المسیح مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفہ ثانی" درج کئے جاتے ہیں۔ لہذا اس ترمیم کے بعد قاعدہ نمبر ۱۸ کا پورا متن اس طرح پر ہوگا:۔

"ہر ایک معاملہ میں مجلس معتمدین اور اس کی ماتحت مجلس یا مجالس اگر کوئی ہوں اور صدر انجمن احمدیہ اور اس کی کل شاخہائے کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۂ ثانی کا حکم قطعی اور ناطق ہوگا۔"

سی کانفرنس سفارش پر جماعت سے مشورہ کے بعد مجلس معتمدین نے ۱۲ راپریل ۱۹۱۴ء کو اُسے باضابطہ صدر انجمن کے دستوری تحریر کی صورت میں داخل کیا۔ یہ فیصلہ نظامِ خلافت کی ایک عظیم الشان فتح تھی۔ اور اس کا ہمیشہ کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی رُوحانی جانشینی کا سوال حل ہو گیا

اس کانفرنس کی دوسری اہمیّت یہ تھی کہ اس نے آئندہ جماعت احمدیہ میں نظامِ شوریٰ کی بنیاد ڈالی اور اس مسئلہ کو خوب اچھی طرح واضح کر دیا کہ خلیفہ وقت کے مقابل پر مجلس شوریٰ کی کیا حیثیت ہے اور خلیفۂ وقت اور مجلس شوریٰ کا باہمی تعلق کن اسلامی اصولوں پر استوار ہے۔

تیسرا اہم فائدہ اس کانفرنس سے یہ ہُوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اس کانفرنس سے مخاطب ہونے ہوئے اپنی وہ تاریخی تقریر فرمائی جس میں جماعت کے لئے ایک عظیم الشان اور وسیع لائحہ عمل کا ڈھانچہ پیش کیا۔ خلافت اور نبوّت کے باہمی تعلق کو واضح کیا خلافت کے کاموں کی تعیین کی اور ان حدود کو واضح کیا جن کے اندر رہتے ہوئے ایک رُوحانی خلافت اپنے فرائض کو سرانجام دیتی ہے۔ پھر ان فرائض کو واضح کیا جو بیعتِ خلافت کے نتیجے میں جماعت مبائعین پر عائد ہوتے ہیں۔ اس تقریر کو آپ کے لٹریچر اور علمِ کلام میں ایک بنیادی حیثیّت حاصل ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے اپنی ابتدائی تصنیف "فتح اسلام" میں اسلام کے احیائے نو اور ترقی کی جس عمارت کا خاکہ کھینچا تھا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس خاکے میں رنگ بھرے اور خطوط کو مزید واضح اور اُجاگر کیا یہاں تک کہ جماعت احمدیہ کے لئے اس چھوٹی سی تقریر میں گویا ایک ہزار سالہ منصوبہ پیش کر دیا گیا۔ اس تقریر

کو ایسی بنیادی اہمیّت حاصل ہے کہ اگر طوالت کا خوف مانع نہ ہوتا تو اس موقعہ پر اسے من وعن پیش کر دیا جاتا مگر فی الوقت اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ کہ قارئین کے سامنے اس کے چند اہم اقتباس پیش کر دیئے جائیں۔

"میرا مذہب یہ ہے لَا خِلَافَةَ اِلَّا بِالْمَشْوَرَۃِ خلافت جائز ہی نہیں جب تک اس میں شوریٰ نہ ہو۔ اسی اصول پر تم لوگوں کو یہاں بُلوایا گیا ہے۔" (صلا)

"مَیں دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف سے محض دین کی خاطر اسلام کی عزّت کے لئے اپنا روپیہ خرچ کر کے اور اپنے وقت کا حرج کر کے احباب آئے ہیں۔ مَیں جانتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ میرے مخلص دوستوں کی محنت کو ضائع نہیں کرے گا وہ بہتر سے بہتر بدلہ دے گا۔"......

"ان دوستوں کو دیکھا تو میرا دل خدا تعالےٰ کی حمد اور شکر سے بھر گیا.... پھر میرے دل میں اور بھی جوش پیدا ہُوا جب مَیں نے دیکھا کہ وہ میرے دوستوں کے بلانے ہی پر جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے آج رات کو مَیں نے بہت دعائیں کیں اور اپنے ربّ سے یہ عرض کیا کہ الٰہی مَیں تو غریب ہوں مَیں ان لوگوں کو کیا دے سکتا ہوں۔ حضور آپ ہی اپنے خزانوں کو کھول دیجئے اور ان لوگوں کو جو محض دین کی خاطر یہاں جمع ہوئے ہیں اپنے فضل سے حصّہ دیجئے۔"......

"پھر مَیں نے اس کے حضور دُعا کی کہ مَیں ان لوگوں کے سامنے کیا کہوں؟ تُو آپ مجھے تعلیم کر اور آپ مجھے سمجھا...... اس نے میرے قلب کو اسیؔ آیت کی طرف متوجّہ کیا اور مجھ پر ان

ؔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (سورۃ بقرہ آیت ۱۳۰)

حقائق کو کھولا جو اس میں ہیں۔ مَیں نے دیکھا کہ خلافت کے تمام فرائض اور کام اس آیت میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ تب مَیں نے اسی کو اس وقت تمہارے سامنے پڑھ دیا۔"

(صفحہ ۲-۳-۴)

پہلا فرض خلیفہ کا تبلیغ ہے۔ جہاں تک مَیں نے غور کیا ہے مَیں نہیں جانتا کیوں بچپن ہی سے میری طبیعت میں تبلیغ کا شوق رہا ہے۔ اور تبلیغ سے ایسا اُنس رہا ہے کہ مَیں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مَیں چھوٹی سی عمر میں بھی ایسی دُعائیں کرتا تھا اور مجھے ایسی حرص تھی کہ اسلام کا جو کام بھی ہو میرے ہی ہاتھ سے ہو۔ مَیں اپنی اس خواہش کے زمانہ سے واقف نہیں، کہ کب سے ہے مَیں جب دیکھتا تھا اپنے اندر اس جوش کو پاتا تھا اور دعائیں کرتا تھا کہ اسلام کا جو کام ہو میرے ہی ہاتھ سے ہو پھر اتنا ہو اتنا ہو کہ قیامت تک کوئی زمانہ ایسا نہ ہو جس میں اسلام کی خدمت کرنے والے میرے شاگرد نہ ہوں۔ مَیں نہیں سمجھتا تھا اور نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ جوش اور اُنس اسلام کی خدمت کا میری فطرت میں کیوں ڈالا گیا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ یہ جوش بہت پُرانا رہا ہے۔ غرض اسی جوش اور خواہش کی بناء پر مَیں نے خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کی کہ میرے ہاتھ سے تبلیغِ اسلام کا کام ہو۔ . . . . . اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی خادم اور غلام توفیق دیا جاوے کہ ایک حد تک تبلیغِ اسلام کے کام کو کرے تو یہ اس کی اپنی کوئی خوبی اور کمال نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام ہے۔ میرے دل میں تبلیغ کے لئے اتنی تڑپ تھی کہ مَیں حیران تھا اور سامان کے لحاظ سے بالکل قاصر۔ پس مَیں اس کے حضور ہی جُھکا اور دُعائیں کیں۔

اور میرے پاس تھا ہی کیا؟ مَیں نے بار بار عرض کی کہ میرے پاس نہ علم ہے نہ دولت نہ کوئی جماعت ہے نہ کچھ اَور ہے جس سے مَیں خدمت کرسکوں۔ مگر اب مَیں دیکھتا ہوں کہ اس نے میری دعاؤں کو سُنا اور آپ ہی سامان کردیئے اور تمھیں کھڑا کردیا کہ میرے ساتھ ہوجاؤ۔" (صلا۔۱۶۔۱۷)

"چونکہ مجھے تبلیغ کے لئے خاص دلچسپی رہی ہے۔ اس دلچسپی کے ساتھ عجیب عجیب ولولے اور جوش پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اس تبلیغی عشق نے عجیب عجیب ترکیبیں میرے دماغ میں پیدا کی ہیں۔ ایک بار خیال آیا کہ جس طرح پر اشتہاری تاجر اخبارات میں اپنا اشتہار دیتے ہیں مَیں بھی چین کے اخبارات میں ایک اشتہار تبلیغِ سلسلہ کا دوں۔ اور اس کی اُجرت دے دُوں۔ تاکہ ایک خاص عرصہ تک وہ اشتہار چھپتا رہے مثلاً یہی اشتہار کہ مسیح موعود آگیا بڑی موٹی قلم سے اس عنوان سے ایک اشتہار چھپتا رہے۔ غرض مَیں اس جوش اور عشق کا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچ سکتا۔ جو اس مقصد کے لئے مجھے دیا گیا ہے۔" (صلا۔۲۲۔۲۳)

زبانیں سکھانے کا پروگرام

"یہ ضروری سوال ہے کہ مبلّغ کہاں سے آویں؟ اور پھر چونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہر قوم اور ہر زبان میں ہماری تبلیغ ہو، اس لئے ضرورت ہے کہ مختلف زبانیں سکھائی جاویں۔ حضرت خلیفۃ المسیح کی زندگی میں مَیں نے ارادہ کیا تھا کہ بعض ایسے طالب علم ملیں جو سنسکرت پڑھیں اور پھر وہ ہندوؤں کے گاؤں میں جاکر کوئی مدرسہ کھول دیں۔ اور تعلیم کے ساتھ تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھیں۔ اور ایک

عرصہ تک وہاں رہیں۔ جب اسلام کا بیج بویا جائے تو مدرسہ کسی شاگرد کے سپرد کرکے آپ دوسری جگہ جا کر کام کریں۔ غرض جس رنگ میں تبلیغ آسانی سے ہوسکے کریں۔" (صـ۲۴)

زکوٰۃ خلیفۂ وقت کے پاس آنی چاہیئے!

"حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں بھی یہ تجویز میں نے پیش کی تھی پہلے تو میں ان سے بے تکلف تھا۔ دو دو گھنٹہ تک مباحثہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن جب وہ خلیفہ ہوگئے تو کبھی میں اُنکے سامنے چوکڑی مار کر بھی نہیں بیٹھا کرتا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں خواہ مجھے تکلیف بھی ہوتی مگر یہ جرأت نہ کرتا اور نہ اُونچی آواز سے کلام کرتا۔ کسی ذریعہ سے میں نے انہیں کہلا بھیجا تھا کہ زکوٰۃ خلیفہ کے پاس آنی چاہیئے۔"

ترقیٔ تعلیم

"میں نے بتایا تھا کہ یُزَکِّیْھِمْ کے معنوں میں اُبھارنا اور بڑھانا بھی داخل ہے اور اس کے مفہوم میں قومی ترقی داخل ہے اور اس ترقی میں علمی ترقی بھی شامل ہے اور اسی میں انگریزی مدرسہ۔ اشاعتِ اسلام وغیرھما امور آجاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میرا خیال ہے کہ ایک مدرسہ کافی نہیں ہے جو یہاں کھولا ہوا ہے۔ اس مرکزی سکول کے علاوہ ضرورت ہے کہ مختلف مقامات پر مدرسے کھولے جائیں۔ زمیندار اس مدرسہ میں لڑکے کہاں بھیج سکتے ہیں۔ زمینداروں کی تعلیم بھی تو مجھ پر فرض ہے پس میری یہ رائے ہے کہ جہاں جہاں بڑی جماعت ہے۔ وہاں سرِدست پرائمری سکول کھولے جائیں۔ ایسے مدارس یہاں کے مرکزی سکول کے ماتحت ہوں گے۔

ایسا ہونا چاہیئے کہ جماعت کا کوئی فرد عورت ہو یا مرد باقی نہ رہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ صحابہؓ نے تعلیم کے لئے بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ جنگ کے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر فرمایا ہے کہ وُہ مسلمان بچوں کو تعلیم دیں۔ جب دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کیا فضل لے کر آئے تھے تو جوشِ محبّت سے رُوح بھر جاتی ہے۔ آپ نے کوئی بات نہیں چھوڑی۔ ہر معاملہ میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ پھر حضرت مسیح موعود اور حضرت خلیفۃ المسیح نے بھی اس نقشِ قدم پر چل کر ہر ایسے امر کی طرف توجہ دلائی ہے جو کسی بھی پہلو سے مفید ہو سکتا ہو۔" (صـ۳۵-۳۶)

جماعت کی دُنیوی ترقی

تعلیم کے سوال کے ساتھ ہی یہ بھی قابلِ غور امر ہے کہ جماعت کی دنیوی ترقی ہو۔ ان کو فقر اور سوال سے بچایا جائے جو واعظین تبلیغ اور تعلیم شرائع کے لئے جائیں اُن کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ جماعت کی مادّی ترقی کا بھی خیال رکھیں"۔ (صـ۳۶)

جماعتی ترقی کا مسلسل محاسبہ

"واعظین اپنے دَوروں میں اس امر کو خصوصیّت سے مدِّنظر رکھیں کہ جماعتیں بڑھ رہی ہیں یا گھٹ رہی ہیں اور تعلیمی اور دنیوی ترقی کیا ہو رہی ہے؟ عملی پابندیوں میں جماعت کی کیسی حالت ہے۔ باہم اخوّت اور محبت کے لحاظ سے وہ کس قدر ترقی کر رہے ہیں۔ ان میں باہم نزاعیں اور جھگڑے تو نہیں۔ یہ تمام اُمور ہیں جن پر واعظوں کو نظر رکھنی ہو گی اور اس کے متعلق مفصّل رپورٹیں میرے پاس آتی رہیں"۔ (صـ۳۷)

کالج کا قیام

"اس بات کی بھی ضرورت ہے۔ کہ ہمارا اپنا ایک کالج ہو۔ حضرت خلیفۃ المسیح کی بھی یہ خواہش تھی۔ کالج ہی کے دنوں میں کیریکٹر بنتا ہے۔"

خلافت پر عمومی اعتراضات کے جوابات

بعض کہتے ہیں کہ خلیفہ نے انجمن کا حق غصب کر لیا۔ پھر کہتے ہیں کہ یہ لوگ شیعہ ہیں۔ مَیں جب ان باتوں کو سُنتا ہوں تو مجھے افسوس آتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا؟ کہتے ہیں بیٹے کو خلافت کیوں مل گئی؟ مَیں حیران ہوں کہ کیا کسی ولی یا نبی کا بیٹا ہونا ایسا ناقابلِ عفو جرم ہے کہ اس کو کوئی حصّہ خدا کے فضل سے نہ ملے اور کوئی عہدہ وہ نہ پائے؟ اگر یہ درست ہے تو پھر نعوذ باللہ کسی نبی یا ولی کا بیٹا ہونا تو ایک لعنت ہوئی برکت نہ ہوئی۔ پھر انبیاء علیہم السّلام اولاد کی خواہش یُوں ہی کرتے تھے۔"

"سوچ کر بتاؤ کہ شیعہ کون ہوئے؟ شیعہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا منشاء تھا کہ حضرت علیؓ خلیفہ ہوں۔ آپ کے خیال و وہم میں بھی نہ تھا کہ ابوبکر عمر عثمان رضی اللہ عنہم خلیفہ ہوں تو جیسے ان کے اعتقاد کے موافق مسئلہ خلافت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے منشاء کو لوگوں نے بدل دیا اسی طرح یہاں بھی ہُوا۔ افسوس کیا حضرت مسیح موعود کی کوئی عزت اور عظمت تمہارے دلوں میں ہے کہ تم قرار دیتے ہو کہ وہ اپنے منشاء میں نعوذ باللہ ناکام رہے۔ خدا سے ڈرو اور توبہ کرو۔

پھر ایک تحریر لئے پھرتے ہیں۔ اور اس کے فوٹو چھپوا کر

شائع کئے جاتے ہیں - یہ بھی وہی شیعہ والے قرطاس کے اعتراض کا نمونہ ہے - وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے قرطاس نہ لانے دیا۔ اگر قرطاس آجاتا تو ضرور حضرت علیؓ کی خلافت کا فیصلہ کر جاتے - یہ لوگ کہتے ہیں کہ افسوس قرطاس لکھ کر بھی دے گئے پھر بھی کوئی نہیں مانتا۔ بتاؤ شیعہ کون ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ قرطاس ہوتا تو کیا بنتا - وہی کچھ ہونا تھا جو ہوگیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ لکھوایا اور شیعہ کو خلیفہ ثانی پر اعتراض کا موقع ملا - یہاں مسیح موعود نے لکھکر دیا اور اب اس کے ذریعہ اس کے خلیفہ ثانی پر اعتراض کیا جاتا ہے "۔ (صـــ۳۹)

متفرق مصروفیات

چندہ جات کا نظام مستحکم کرنیکے بارہ میں ایک اہم اقدام

یہ ایام حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے لئے انتہائی مصروفیت کے ایام تھے۔ دشمن کے بیرونی حملے ایک طرف اور کئی اپنے کہلانے والوں کی طرف سے طرح طرح کی اذیتیں دوسری طرف۔ غیر مبائعین نے تو احمدیت کا مشن ہی یہ سمجھ رکھا تھا کہ کسی طرح مبائعین کی شاخ کو یکسر کاٹ ڈالا جائے۔ اور (حضرت) مرزا محمود احمد کو ناکام و نامراد کرکے دکھا دیا جائے۔ گویا نعوذ باللہ یہی احمدیت کے قیام اور حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے مشن کی غرض و غایت تھی۔ ان کے اعتراضات کے جوابات دینا، جماعت کو ان کے زہریلے پروپیگنڈے سے مامون و محفوظ رکھنا۔ نئی جماعتوں کے ایمان کی تقویّت کے سامان پیدا کرنا۔ جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو از سرِ نو مجتمع کرنا۔ خلافت کی اہمیت اور اصل منصب کو جماعت پر واضح کرنا۔ کثرت سے آنے والے زائرین سے ملاقاتیں کرنا اور خطوط کا جواب دینا۔ درسِ قرآن کریم اور پانچ وقت نماز کی امامت کے علاوہ رات کو تہجّد میں گریہ وزاری کے ذریعہ اپنے رب سے مدد مانگنا۔ جماعت کے پریشان حال افراد کی ڈھارس کے سامان پیدا کرنا اور ان کے لئے دُعائیں کرنا۔ انجمن کے ایسے ممبران کی پیدا کردہ مشکلات کا ازالہ کرنا جو بیعتِ خلافت میں داخل نہ تھے۔ اس کے علاوہ جماعت کی ترقی کے لئے کئی عارضی اور مستقل اقدامات کرنا، غیر از جماعت اور غیر مسلم زائرین کے سوالات اور اعتراضات کے جواب زبانی اور تحریری طور پر دینا۔ غرضیکہ آپ کی زندگی ایک مصروف ترین انسان کی زندگی تھی۔ اللہ! اللہ! پچیس برس کی عمر میں کتنے بوجھ تھے جو اسلام کے غم میں آپ نے اپنے نوجوان کندھوں پر اُٹھا لئے تھے۔ اس ایک دُکھ کے لئے کتنے دُکھ تھے جو آپ کے جواں سال دل میں سما گئے۔ کتنے فکر تھے جو ہجوم کرکے آئے اور آپ کے ذہن کی فضا پر چھا گئے ...... لیکن اس میں آپ کا اختیار بھی کیا تھا

یہ علیم و خبیر خدا کا انتخاب تھا جس نے یہ گراں قدر امانت آپ کے سپرد کی اس عظیم ذمہ داری کا لباس خدا نے ہی آپ کو پہنایا تھا۔ پس ممکن نہ تھا کہ کوئی انسان آپ سے یہ لباس چھین سکے۔ اور حق یہ ہے کہ آپ کا ہر سانس آخر دم تک اس عہد کے نباہنے میں گزرا۔ اور زندگی کی آخری رمق تک آپ اس پر قائم و دائم رہے۔ یہ تو زندگی بھر نفس نفس کا ساتھ تھا جسے ہر طور نباہنا تھا۔ دُکھ میں بھی اور آرام میں بھی۔ صبح اور شام دن اور رات خلافت کی عظیم ذمّہ داریوں کو سینے سے لگائے دل و جان سے عزیز تر رکھتے ہوئے زندگی کے آخری سانس تک آگے ہی آگے بڑھنا تھا۔

آپ نے ایسے ہی کیا اور زندگی کی آخری رمق تک ایسا ہی کئے چلے گئے اور ہر صبح اور ہر شام نے گواہی دی کہ خدا کا انتخاب غلط نہ تھا۔ آپ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کے الٰہی فرمان کی ایک زندہ اور مجسّم تفسیر بن گئے۔

آپ کے روزانہ مشاغل کی تفصیل کو چھوڑ کر جو مختصر روئداد سلسلہ کے اخباروں میں چھپتی رہی اگر وہی پیش کی جائے تو بھی ابتدائی چند سالوں کے ذکر سے ہی ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ لہذا محض چند اہم اور دُور رس نتائج کے حامل اقدامات اور بعض دنیاوی اہمیت کی تقاریر یا پھر بطور نمونہ ایک آدھ ملاقات کا واقعہ بیان کر کے ہم آپ کی خلافت کے پہلے سال کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

جماعتی انتظام کو بخوبی چلانے کے لئے سب سے پہلی ضرورت روپے کی تھی اس وقت حالت یہ تھی کہ سلسلہ کا تمام روپیہ اس انجمن کے قبضہ میں تھا جس میں ایک خاصی تعداد بیعت نہ کرنے والوں کی تھی اور یہ اشخاص کسی وقت بھی مالی رکاوٹیں کھڑی کر سکتے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے یہ تو مناسب نہ سمجھا کہ روپیہ کسی اَور نام پر جمع ہو مگر یہ شرط لگا دی کہ تمام بیعت کنندگان اپنا ہر قسم کا چندہ حضرت خلیفۃ المسیح کی معرفت بھجوائیں۔ اس سے ایک طرف تو یہ خطرہ دُور ہو گیا کہ انجمن کے مخالف ممبران اس روپیہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں۔ دُوسری طرف مبائعین اور غیر مبائعین کے چندوں میں امتیاز کی ایک عمدہ صورت پیدا ہو گئی۔ اس ضمن میں ایک اَور خطرہ بھی سامنے آیا۔ کہ منکرینِ خلافت کے اخبار "پیغام صلح" نے جو ہمہ تن خلافت کی مخالفت کے لئے وقف تھا جماعت سے مختلف چندوں کی اپیلیں شروع کر دیں

چونکہ ابھی تک مبائعین اور غیر مبائعین کے نظام میں کوئی واضح اور غیر مبہم امتیاز پیدا نہ ہوا تھا اور سادہ لوح دیہاتی جماعتیں سلسلہ کے پُرانے کارکنوں کی ہر تحریک پر لبیک کہنا موجبِ سعادت سمجھتی تھیں اس لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جماعت کو ایک نہایت اہم اور دُور رس نتائج کی حامل یہ نصیحت فرمائی کہ سلسلہ احمدیہ میں کسی چندہ مانگنے والے کو چندہ نہ دیا جائے خواہ چندہ مانگنے والا کوئی ہی کیوں نہ ہو۔ اور چندہ کیسے ہی نیک کام کے لئے کیوں نہ مانگا جائے۔ جب تک اس کام کو خلیفۂ وقت کی منظوری حاصل نہ ہو۔ یہ ہدایت نہ صرف وقتی غلط فہمیوں کی روک تھام کے لئے مفید ثابت ہوئی بلکہ اس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے جماعت احمدیہ کے چندے کا نظام محفوظ اور مستحکم ہو گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"بہت سے احباب خطوط کے ذریعہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم چندوں کا کیا کریں آیا انجمن کو بھیجیں یا نہ بھیجیں۔ ان سب دوستوں کی اطلاع کے لئے ایسا ہی اُن دوسرے احباب کی اطلاع کے لئے جو میرے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں مَیں اشتہار کے ذریعہ اعلان کرتا ہوں کہ چندے برابر صدر انجمن میں آنے چاہئیں۔ ہاں چونکہ ابھی تک مجھے اطمینان نہیں کہ انجمن اس موجودہ فتنہ میں کیا حصّہ لے گی اس لئے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ انجمن کے سب چندے میری معرفت ارسال ہوں۔ مَیں انہیں خزانۂ انجمن میں داخل کر کے انجمن کی رسید بھجوا دوں گا۔ ایسے مقامات جہاں کے سیکرٹری یا محاسب نے ابھی بیعت نہیں کی وہاں یہ انتظام ہو سکتا ہے کہ اگر محاسب یا سیکرٹری اس انتظام کو منظور کر لیں تو فبہا ورنہ ان کی بجائے کوئی اور شخص مقرر کر دیا جاوے جو مبائعین کا چندہ وصول کر کے بھیج دیا کرے ....

دوسری بات مَیں یہ بھی کہنی چاہتا ہوں کہ آئندہ انجمن کے چندوں

کے علاوہ کوئی چندہ آپ اس وقت تک نہ دیں جب تک کہ
میری طرف سے اجازت شائع نہ ہو کیونکہ اس سے اب تک
جماعت کو بہت کچھ نقصان ہو چکا ہے۔ اور آئندہ خطرہ ہے
خواہ کیسے ہی مفید کام کے لئے چندہ کی تحریک ہو اگر
میری طرف سے اجازت شائع ہوتی ہے تو اس میں
چندہ دیا جاوے ورنہ نہیں۔ میری اس نصیحت کو
یاد رکھو اور اپنی انجمنوں کے دفاتر یا اپنے گھروں
میں لٹکا رکھو۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے تمہاری
طاقت بہت کچھ مضبوط ہو جائے گی۔ اور ہر ایک کام
تبھی مفید ہو سکتا ہے جبکہ ایک مرکز کے ماتحت ہو۔"[1]

جہاں تک انفرادی ملاقاتوں اور گفت و شنید کا تعلق ہے اس کے اثرات اور کیفیت کا اندازہ مولوی عمر دین صاحب شملوی کی حسب ذیل روایت سے ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے جو ایک ناقدانہ نظر رکھتے تھے ہمارے نامور ادیب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی مرحوم کو ایک مرتبہ یہ واقعہ سنایا کہ

"حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہونے کے چند ماہ بعد امریکہ کا ایک بڑا پادری قادیان آیا جو بڑا عالم فاضل بھی تھا اور اپنے علم و فضل پر نازاں بھی۔ قادیان پہنچ کر اُس نے ہم لوگوں کے سامنے چند مذہبی سوالات پیش کئے جو نہایت دقیق اور بڑے اہم تھے۔ اور ساتھ ہی کہا کہ میں امریکہ سے چل کر یہاں تک آیا ہوں۔ اور میں نے مسلمانوں کی ہر مجلس میں بیٹھ کر ان سوالات کو دُہرایا ہے۔ مگر آج تک مجھے مسلمانوں کا بڑے سے بڑا عالم اور فاضل ان سوالوں کا تسلّی بخش جواب نہیں دے سکا۔ میں یہاں ان سوالوں کو آپ کے خلیفہ صاحب کے سامنے پیش کرنے کے لئے خاص طور پر آیا ہوں۔ دیکھئے خلیفہ صاحب ان سوالوں کا کیا جواب دیتے ہیں؟

---

[1] الفضل قادیان ۶/اپریل ۱۹۱۴ء

سوالات اتنے پیچیدہ اور عجیب قسم کے تھے کہ انہیں سُنکر مجھے یقین ہو گیا کہ حضرت صاحب ابھی بالکل نوجوان ہیں اور الٰہیات کی کوئی باقاعدہ تعلیم بھی انہوں نے نہیں پائی۔ عمر بھی چھوٹی ہے۔ اور واقفیت بھی بہت تھوڑی ہے۔ وہ ان سوالوں کا جواب ہرگز نہیں دے سکیں گے اور اس طرح سلسلہ احمدیہ کی بڑی بدنامی اور سُبکی ساری دنیا میں ہو گی۔ کیونکہ جب حضرت صاحب اس کے سوالوں کا جواب نہ دے سکے تو یہ امریکن پادری واپس جاکر ساری دُنیا میں اس امر کا پروپیگنڈا کرے گا کہ احمدیوں کا خلیفہ کچھ بھی نہیں جانتا اور عیسائیت کے مقابلہ میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ صرف نام کا خلیفہ ہے ورنہ علمیّت خاک بھی نہیں رکھتا۔

اس صورتِ حال سے میں کافی پریشان ہوا۔ اور میں نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ امریکن پادری - حضرت صاحب سے نہ ملے اور ویسے ہی واپس چلا جائے۔ مگر مجھے اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ امریکن اس بات پر مُصر رہا کہ میں ضرور خلیفہ صاحب سے مل کر جاؤں گا ناچار میں گیا اور میں نے حضرت صاحب سے کہا کہ ایک امریکن پادری آیا ہے اور آپ سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہے۔ اب کیا کریں؟ اس پر حضرت صاحب نے بغیر توقف کے اور بلا تامّل فرمایا کہ "بُلا لو"۔ ناچار میں اُسے لے کر حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ دونوں کے درمیان ترجمان میں ہی تھا۔

امریکن پادری نے کچھ رسمی گفتگو کے بعد اپنے سوالات حضرت صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔ جن کا ترجمہ میں نے آپ کو سُنا دیا۔ حضرت صاحب نے نہایت سکون کے ساتھ ان سب سوالوں کو سُنا اور پھر فوراً اُن کے ایسے تسلّی بخش جوابات دیئے کہ میں سُنکر حیران ہو گیا۔ مجھے ہرگز یقین نہ تھا کہ ان سوالوں کے حضرت صاحب ایسے پُر معارف اور بےنظیر جواب دے سکیں گے۔ جب میں نے یہ جوابات انگریزی میں امریکن پادری کو سُنائے تو وہ بھی حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ میں نے آج تک ایسی

معقول گفتگو اور ایسی مدلّل تقریر کسی مسلمان کے مُنہ سے نہیں سُنی''۔ [۱]

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی عیسائی مذہب سے گہری علمی واقفیت صرف احمدیوں پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی تھی بلکہ خود تجربہ کار عیسائی منّاد بھی حضور کی علمی قابلیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک مسیحی دوست نے جو قادیان ٹھہر کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے مذہبی تبادلہ خیالات کر رہے تھے اپنا تأثر نمائندہ الفضل سے ان الفاظ میں بیان کیا:-

''میرا زمانۂ تجربہ ۲۵ سال کا ہے اور اس شخص (حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ) کی عمر ۲۵ سال ہے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ مسیحی مذہب کا علم ان کو مجھ سے زیادہ ہے۔ مَیں نے بہت وعظ اور تقاریر سنی ہیں مگر یہ حالت نہیں دیکھی یہ تو خدا داد قابلیّت ہے''

(الفضل ۲ر مارچ ۱۹۱۵ء)

یہ تأثر بیان کرنے کے چند روز بعد جب ان کو حضور سے گفت و شنید اور صحبت سے استفادہ کرنے کا مزید موقع ملا۔ تو ان کی حالت میں ایک غیر معمولی تبدیلی واقع ہو گئی اور ایک دن اپنی قلبی کیفیّت کا اظہار قادیان کی ایک مجلس میں ان الفاظ میں کیا:-

''مَیں نے عیسائیوں کی اعلیٰ سوسائٹی میں تربیت پائی ہے بہت سے ملکوں میں پھرا ہوں مگر مجھے اس جماعت کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ کاش یہ رُوحانیت عیسائیوں میں ہوتی۔ بڑے تو بڑے مَیں نے یہاں کے بچّوں میں بھی وہ شائستگی دیکھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کا شوقِ عبادت آپ کی مہمان نوازی آپ کی تواضع دیکھکر مجھے یسعیاہ کا وہ باب یاد آتا ہے جس میں مسیح کی آمدِ ثانی کے متعلق لکھا ہے کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے اور ناگ بچّوں سے کھیلیں گے۔ مَیں نے یہاں دیکھا کہ سرحدی جو بہت آزاد اور اکھڑ قوم ہے ان کے ایک فرد نے اندھیرے میں میرا جُوتا تلاش کر کے میرے آگے نہایت تواضع

---

[۱] تاریخ احمدیت جلد پنجم صفحہ ۱۸۱

سے رکھ دیا۔ پھر آپ کے سردار حضرت صاحب باوجود اس نوجوانی کے وہ روشن ضمیری رکھتے ہیں کہ مَیں نے کئی مولویوں اور مقرروں کے وعظ سُنے مگر یہ اثر یہ جادو بیانی ان میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ مَیں جب آپ کی صحبت میں بیٹھا تو کئی اعتراضات لے کر بیٹھا مگر بغیر اس کے کہ مَیں انہیں زبان پر لاؤں حضرت صاحب نے ایسی تقریر شروع کی کہ وہ خود بخود دُور ہو گئے۔ باوجود عیسائی ہونے کے پیغمبرِ عربؐ کی اب مطلقاً نفرت میرے دل میں نہیں بلکہ بہت بڑی عزّت ہو گئی۔ قرآن مجید کو پہلے لغو کتاب سمجھتا تھا اب مَیں اسے اعلیٰ کتاب سمجھتا ہوں۔ میرے دل میں ایک جنگ شروع ہو گئی ہے مَیں نے جو کچھ حضرت صاحب نے فرمایا سب نوٹ کر لیا ہے اب مَیں اطمینان سے اس پر غور کروں گا۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ میرے حق میں دُعا کریں گے کہ جو خدا کے نزدیک راہِ راست ہے وُہ مجھے دکھائے مَیں پھر اقرار کرتا ہوں کہ حضرت صاحب کے بیان میں ایک جادو کا اثر ہے اور نہایت اعلیٰ معلومات رکھتے ہیں اور مَیں بہت شکر گزار ہوں۔" (الفضل ۲۳ مارچ ۱۹۱۵ء)

اسی طرح ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب خاکی راولپنڈی کی ایک روایت بھی پڑھنے کے لائق ہے جو مناظرہ کے وقت آپ کی حاضر جوابی اور بائیبل سے گہری واقفیت کے موضوع پر عمدہ روشنی ڈالتی ہے۔ ماسٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک عیسائی جس نے ۲۵ یا ۲۶ سال تک عیسائیت کی تبلیغ کی تھی، قادیان میں آیا۔ مغرب کی نماز کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے گفتگو شروع کی۔ حضرت حافظ روشن علی صاحب بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ گفتگو کے دوران حضور نے کسی بات پر اگر کا لفظ استعمال فرمایا۔ یعنی فرمایا کہ اگر ایسا ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔ اس پر پادری نے کہا کہ اگر والی بات تو کمزور ہوتی ہے

اس پر حضور نے فرمایا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اگر میں چاہوں تو دس ہزار فرشتے میری مدد کو آسکتے ہیں۔ کیا حضرت مسیح علیہ السلام کی بات کمزور تھی ؟ یہ بات سُن کر وہ پادری ہنس پڑا۔ اور لاجواب ہو گیا۔ یہ خلافت ثانیہ کے بالکل ابتدائی زمانے کی بات ہے۔"

ایسی ملاقاتوں کا بعض اوقات فوری نتیجہ ظاہر ہوتا۔ چنانچہ پشاور کے ایک قابل پادری عبدالخالق صاحب جو قبل ازیں اسلام سے ارتداد کر کے پادری بن چکے تھے اور انہیں بائیبل پر اتنا عبور تھا کہ وہ فخریہ کہا کرتے تھے کہ میرے علم کا پادری شاذونادر ہی کوئی اَور ملے گا۔ مناظرے کے ماہر اور منطقی داؤ پیچ سے خوب واقف، اس پادری کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ بڑے بڑے مولویوں کو منطقی داؤ پیچ سے شکستِ فاش دے کر اہلِ اسلام پر اپنی برتری ثابت کرتے۔ یہ پادری صاحب شوقِ مبارزت لئے اپریل کے شروع میں قادیان آنکلے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے تبادلہ خیالات کی خواہش ظاہر کی خیال تو ان کا یہ تھا کہ ایک نوجوان رہنما ہے، عیسائیت کا تو سوال ہی کیا خود اپنے دینی علوم میں بھی سند یافتہ نہیں، چند ہی اعتراضات میں شکستِ فاش دے کر اپنا نام بلند کروں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اَور ہی منظور تھا۔ بحث اس حال پر ختم ہوئی کہ اُن کا ذہن اسلام قبول کر چکا تھا اور دل مطمئن ہو چکا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مسیح موعود یقین کرتے ہوئے جناب سابق پادری صاحب نے حضرت مرزا محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سلسلہ احمدیہ میں داخل ہونے کا عہدِ بیعت کیا۔

یہ پادری صاحب جن کا نام عبدالخالق تھا۔ کسی وقتی اور ہنگامی جذبہ کے تحت ازسرِنو مسلمان نہیں ہوئے بلکہ حضرت خلیفۃ المسیح کے خداداد علم میں کچھ ایسی قوّتِ قدسیہ تھی کہ وہ ان کے عقل اور دل دونوں کو مسلمان کر گئی۔ مکرم پادری عبدالخالق صاحب بڑی عمر پاکر آج سے چند سال قبل فوت ہوئے۔ راقم الحروف نے خود ان کو دیکھا ہے۔ ان سے بائیبل پڑھی ہے۔ اور عیسائیت کے بارہ میں معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی شخصیّت سے بے حد متأثر تھے اور ان کے دل پر آپ کے علم اور تقویٰ کا ایسا رعب تھا کہ ہمیشہ غیر معمولی عجز و انکسار اور احترام کے ساتھ آپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔

اس ذکر میں محبت کی چاشنی شامل تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح کے اس احسان کو انہوں نے کبھی دل سے فراموش نہ ہونے دیا۔ کہ آپ کی بدولت ان کو اسلام کی دولت از سرِ نو نصیب ہوئی۔ یہ بات نہیں تھی کہ انہیں اپنے علم پر ناز نہ رہا ہو۔ یہ ناز آخر وقت تک قائم رہا اور کیوں نہ رہتا حقیقتاً آپ بائیبل کے ایک متبحّر عالم تھے ہزاروں آیات حفظ تھیں کثرت سے حوالے نوکِ زباں تھے۔ عیسائی ہو یا مسلمان کسی دوسرے عالم کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہاں حضرت خلیفۃ المسیح ایک ایسا استثناء تھے جن کے سامنے ایک فرمانبردار با ادب شاگرد کی طرح ہمیشہ زانوئے ادب تہہ کئے رہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح غیر از جماعت دوستوں کے علاوہ احباب جماعت احمدیہ سے بھی بکثرت ملاقاتیں فرمایا کرتے۔ آپ ان کے سوالات کا شافی جواب دیتے۔ انکی مشکلات میں انہیں قیمتی مشوروں سے نوازتے حوصلہ دیتے اور ڈھارس بندھاتے۔ مصائب میں ان کے لئے دردمندانہ دُعائیں کرتے اور دلی تسکین اور راحت کا سامان پیدا کرتے ساتھ ہی نہایت دلکش انداز میں تزکیۂ نفس کا کام بھی جاری رہتا۔ کوئی کمزوری دیکھتے تو اسے نہایت پیارے انداز میں دُور کرنے کی کوشش فرماتے۔ مکرم مرزا احمد بیگ صاحب ساہیوال اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "ابتدائے خلافت سے ہی حضور کو احباب کی اصلاح کا شدید خیال تھا۔ چنانچہ میرے ماموں جان حضرت مرزا غلام اللہ مرحوم رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ فرمایا کہ مرزا صاحب دوستوں کو حُقّہ چھوڑنے کی تلقین کیا کریں۔ اب درحقیقت ماموں صاحب خود حقّہ پیا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا بہت اچھا حضور۔ گھر میں آئے۔ اپنا حُقّہ جو دیوار کے ساتھ کھڑا تھا اس کا نیچہ ٹوپی وغیرہ توڑ دی۔ ممانی جان نے سمجھا کہ آج شاید حُقّہ دھوپ میں پڑا رہا ہے اس لئے یہ فعل ناراضگی کا نتیجہ ہے لیکن جب انہوں نے کسی کو بھی کچھ نہ کہا تو ممانی صاحبہ نے پوچھا۔ آج حُقّے پر کیا ناراضگی آگئی تھی۔ فرمایا مجھے حضرت صاحب نے حُقّہ پینے سے لوگوں کو منع کرنے کی تلقین کے لئے ارشاد فرمایا ہے۔ اور مَیں خود حُقّہ

پیتا ہوں ۔ اس لئے پہلے اپنے حُقّے کو توڑا ہے ۔ پھر وہ نمازوں کے اوقات میں بھی اور دوسرے وقتوں میں لوگوں کو حُقّہ چھوڑ دینے کی تلقین کرتے رہے اور خود مرتے دم تک حُقّے کو منہ نہ لگایا"

انجمن ترقیٔ اسلام

مجلس شورٰی ۱۹۴۴ء کی روئداد کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تفصیلی رہنمائی کی روشنی میں جماعت احمدیہ نے تبلیغِ اسلام کا جو وسیع منصوبہ بنایا اس پر خوش اسلوبی اور تیزی سے عمل درآمد کرنے کے لئے حضور نے ایک نئی انجمن۔ "انجمن ترقیٔ اسلام" کے نام سے قائم فرمائی۔ آپ نے پوری احتیاط کے ساتھ یہ واضح فرما دیا، کہ یہ انجمن پُرانی انجمن کی متبادل نہیں ہے بلکہ خالصۃً تبلیغِ اسلام کے کام تک ہی اپنی دلچسپیاں مرکوز رکھے گی۔ اور صدر انجمن احمدیہ کے دیگر فرائض حسب سابق صدر انجمن احمدیہ ہی ادا کرتی رہے گی۔

اس انجمن کے قیام کے تھوڑے دنوں کے بعد اپریل کے آخری ہفتہ میں آپ نے ایک مضمون "شکریہ اور اعلان ضروری" کے عنوان کے تحت شائع فرمایا جس میں خلافت احمدیہ کے گرد پروانہ وار اکٹھے ہونے والے احباب جماعت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جماعت کو قربانی کے ایک نئے میدان کی طرف بُلایا اور پُرزور اور پُردرد تحریک فرمائی کہ انجمن ترقیٔ اسلام کے مقاصد پُورا کرنے کی خاطر جماعت احمدیہ ۱۲ ہزار روپیہ بطور چندہ ادا کرے۔ ۱۲ ہزار اس زمانہ میں چندوں کے معیار کے لحاظ سے اور روپے کی رائج قیمت کے اعتبار سے ایک بہت بڑی اپیل شمار کی جاسکتی ہے۔ یہ اعلان کاتب کو دینے سے قبل ہی آپ نے درسِ قرآن کے وقت حاضر احباب کو پڑھ کر سُنایا جس کے چند اقتباسات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش ہیں:۔

"مَیں اپنے مولا کے احسانات کا شکریہ کس مُنہ سے ادا کروں۔
اور اس کے احسانات کو کس زبان سے گنوں کہ میرا منہ اور میری
زبان اس کام کو پُورا نہیں کر سکتے میرے جسم کا ذرّہ ذرّہ بھی
اگر گویا ہو تو اس کے بحرِ عطایا کے ایک قطرہ کا شکریہ ادا نہ ہوسکے
ایسے خطرناک متلاطم سمندر میں سے جماعت کا جہاز گزرے
اور میرے جیسے ناتجربہ کار اور ناواقف اور کمزور ملاّح کے

ہاتھوں میں اس کی پتوار ہو۔ اور پھر بھی کشتی سلامت گذر جائے
یہ کس کا کام ہو سکتا ہے صرف خدا کا۔ خلیفہ اوّل ایک شان
رکھتا تھا اور اس کے کاموں کو اس کی طرف منسوب کیا بھی جا سکتا
تھا۔ مگر مَیں کیا ہوں کہ کسی کو یہ خیال گذر بھی سکے کہ اس فتنہ
کے دُور کرنے میں کچھ میرا بھی ہاتھ تھا۔ یہ طاقت نمائی شرک
کے تمام شائبوں سے پاک تھی۔ اور انبیاء اولیاء کا محبُوب
بے نقاب اس وقت دنیا پر ظاہر ہُوا تاکہ ان شرک کے ایام
میں لوگوں کو بتا دے کہ ایک مٹی کے ڈلے اور لکڑی کے کُندہ
سے بھی مَیں وہ کام لے سکتا ہوں جو دُنیا کے بادشاہ نہیں کر سکے"
"اے میرے رب! تیرے حضور مَیں عاجزانہ عرض کرتا ہوں
اسے قبول فرما کہ بادشاہوں کے دروازوں پر سے گداگر خالی
ہاتھ نہیں لَوٹا کرتے۔ جس طرح تُو نے اس جماعت کے کثیر حصّہ
کو مجتمع اور متّحد کر دیا ہے قلیل کو بھی ہمارے ساتھ ملا دے۔
میرے پیارے رب تُو جانتا ہے کہ مجھے اپنی بڑائی کی خواہش
نہیں مجھے حکومت کا شوق نہیں لیکن جماعت کا اتحاد مجھے مطلوب
ہے اور تفرقہ کو دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ پس خدایا اپنا
فضل کیجئے میرے زخمی دل پر مرہم کافور لگائیے۔ مجھے جو کچھ بھی
حضور نے دیا امید سے بڑھ کر دیا۔ مگر مولیٰ مجھے اس معاملہ
میں حرص سے معذور رکھیئے۔ ابھی میری حرص کی آگ نہیں
بجھی اور میرے دل میں تڑپ ہے کہ کسی طرح سب کی سب
جماعت پھر ایک سلک میں پروئی جائے۔ اور ہم سب مل کر
تیرے نام کو دنیا پر روشن کریں۔ طاقتور شہنشاہ! یہ تیرے لئے
کچھ مشکل نہیں۔ احمد کے نام کو دو ٹکڑے ہونے سے بچا لے۔ پیارے
یہ جماعت تیری پیاری جماعت ہے اور کون چاہتا ہے کہ اپنے
پیاروں کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھے" (صٰ)

"اللہ تعالیٰ نے اس کام کو پُورا کرنے کے لئے میرے دل میں
ڈالا ہے کہ مَیں اب اسلام و احمدیّت کی اشاعت کے لئے خاص
جدّوجہد کروں۔ اور میں نے فی الحال اندازہ لگایا ہے کہ اس
کام کا ایک سال کا خرچ بارہ ہزار روپیہ ہوگا......
مَیں نے بہت دعاؤں کے بعد اس بات کا اعلان کیا ہے
اور اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ میری دعاؤں کو ضرور قبول
کرے گا اور خود اشاعتِ اسلام کے لئے سامان کر دے گا۔ اور
جو لوگ اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں گے ان پر خاص فضل فرمائیگا
میرے دوستو! بارہؔ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم بظاہر بہت
معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس رب نے مجھے اس کام پر مقرر کیا ہے
اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ وہ بڑے خزانہ والا ہے۔ وہ خود
آپ لوگوں کے دل میں الہام کرے گا اور آپ ہی اس کے لئے
سامان کر دے گا" (صـ۳)

(از اشتہار "شکریہ اور اعلان ضروری" مندرجہ ضمیمہ الفضل قادیان ۲؍مئی ۱۹۱۴ء)

اس وقت تک حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا جماعت پر کیسا گہرا اثر پیدا ہو چکا تھا۔ اور خلافت کے شیدائیوں کو آپ سے کتنی گہری محبّت اور عقیدت کا تعلّق تھا اس کا کچھ اندازہ اس اعلان کے اثرات سے لگایا جا سکتا ہے۔ قادیان کی غریب جماعت نے ایک عجیب جوش اور خلوص کے ساتھ اپنے امام کی مالی قربانی کی اس تحریک پر لبّیک کہا درس سے فارغ ہوتے ہی حضور کا یہ اعلان گھر گھر پہنچا دیا گیا اور دوسرے ہی روز ایک بڑے ہی پُر جوش جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں اہلِ قادیان نے مسابقت کی ایک عجیب رُوح کے ساتھ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر وعدے لکھوائے اور اسی جلسہ میں تقریباً تین ہزار کے وعدے اور پانچ صد سے زیادہ نقد وصول ہو گئے۔ جماعت کے آج کے حالات پر نظر کرنے والے شاید اس رقم کو معمولی سمجھیں لیکن ان دنوں جماعت کی غربت کا یہ حال تھا کہ یہ تین ہزار روپیہ بھی غیر معمولی اور دل گداز قربانیوں کے ذریعہ سے اکٹھا کیا گیا۔ ایسے مخلصین بھی ان میں تھے جنہوں نے اپنی ساری زمین تبلیغِ اسلام

کے لئے پیش کر دی ۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے اپنی عمر بھر کا اندوختہ حاضر کر دیا ۔ تنخواہ داروں سے ایک ایک مہینہ کی تنخواہ دی اور عورتوں نے اپنے زیورات دینِ اسلام کی ترقی کی نذر کئے ۔ قادیان کی اس غیر معمولی قربانی کے مظاہرے سے قبل ہی قادیان کی اس درویش جماعت کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو یہ نظارہ دکھایا گیا تھا کہ

"ایک شخص عبد الصمد کھڑا ہے اور کہتا ہے مبارک ہو قادیان کی غریب جماعت تم پر خلافت کی رحمتیں یا برکتیں نازل ہوتی ہیں"۔

(منصبِ خلافت صہ ۳۳)

یہ مختصر سا واقعہ اس لحاظ سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے آئندہ ہمیشہ کے لئے جماعت کی مالی قربانیوں اور خلیفۂ وقت کی آواز پر والہانہ انداز میں لبیک کہنے کی ایک ایسی روایت قائم کر دی جس کے نیک اور میٹھے ثمرات آج تک جماعت احمدیہ پا رہی ہے ۔ اس دن سے لے کر خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی وفات کے دن تک کبھی جماعت کا قدم پیچھے نہیں ہٹا بلکہ خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آج جبکہ خلافتِ ثالثہ پر بارہ سال گذر چکے ہیں ۔ جماعت مالی قربانی میں اور اپنے امام کی آواز پر لبیک کہنے میں مسلسل آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے ۔ اور سخت مخالفانہ حالات میں بھی اس نے کبھی ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا ۔ پس یہ رؤیا جس میں قادیان کی غریب جماعت کو یہ عظیم الشان نمونہ دکھانے پر مبارکباد پیش کی گئی تھی برحق اور سچا تھا اور قیامت تک جماعت کی قربانیاں قادیان کی اس غریب جماعت پر سلام بھیجتی رہیں گی ۔

۱۹۱۴ء یعنی آپ کی خلافت کا پہلا سال جماعت احمدیہ کی تاریخ میں اس لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس سال جماعت کو دین کی خاطر مالی قربانی کے نئے میدانوں کی طرف بلایا گیا ۔ اور وہ غیر معمولی رفتار متعین کر دی گئی جس کو برقرار رکھتے ہوئے جماعت احمدیہ نے دینِ حق کی خاطر اپنے اموال لٹانے تھے ۔ پھر اس لحاظ سے بھی یہ سال خاص اہمیت کا حامل ہے کہ وقفِ زندگی کی تحریک کا بیج جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دستِ مبارک سے بویا تھا اس سال مزید لہلہاتی ہوئی کونپلوں کی صورت میں رونما ہوا ۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے آقا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے

بڑی شدّت اور بڑے جذبے کے ساتھ احمدی نوجوانوں کو ترکِ دُنیا کرکے دینِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے درویشانہ چلے آنے کی تلقین فرمائی اور اس اپیل کے گہرے خلوص سے متأثر ہوتے ہوئے بکثرت نوجوان حضور کی آواز پر لبّیک کہکر اور نذرِ جاں لئے ہوئے مرکزِ احمدیّت میں حاضر ہونا شروع ہو گئے۔ آپ کو جس اعلیٰ کردار کے نوجوانوں کی ضرورت تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں :-

"یہ نوجوان ایسے ہوں جو دینِ اسلام کی خدمت کے لئے دن کو دن اور رات کو رات خیال نہ کریں۔ بہت تھوڑے گذارہ پر اوقات بسری کر سکیں اخلاص اور محبّت سے کام کریں۔ ایسے نوجوانوں کے مختلف حصّے کرکے بعض کو مسیحی مذہب کے مقابلہ کے لئے تیار کیا جاوے گا۔ بعض کو آریہ مذہب کے مقابلہ کے لئے بعض کو سکھ مذہب کے مقابلہ کے لئے بعض کو جینیوں بعض کو سناتن دھرمیوں اور بعض کو بُدھوں کے مقابلہ کے لئے تعلیم دی جاوے گی ایک دو سال تک ان کو ان مذاہب کی تعلیم کے ساتھ خود اسلام کی تعلیم دے کر خدمتِ اسلام پر مختلف مقامات پر مامور کیا جاویگا پس جو مخلصین کہ اس موقعہ پر السابقون الاوّلون میں داخل ہو کر ثواب حاصل کرنا چاہیں بہت جلد مجھ کو اطلاع دیں اور قادیان آنے کے لئے تیار ہو جاویں۔ میرے پیارو! لوگ چند روپوں کے لئے اپنی جانیں لڑا دیتے ہیں۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ احمدی جماعت میں ایسے لوگوں کی کمی ہو گی جو دین کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔ خوب یاد رکھو کہ جو قوم قربانی نہیں کر سکتی وہ ترقی بھی نہیں کر سکتی " (الفضل قادیان ۲۳ر جولائی ۱۹۱۴ء)

وقفِ زندگی کی یہ وہ تحریک تھی جس پر لبّیک کہتے ہوئے بہت سے نوجوانوں نے اپنی زندگیاں اسلام کی خدمت کے لئے پیش کر دیں۔ لیکن ان واقفین کی مثال ابھی بارش کے ابتدائی قطروں کی طرح تھی یہ وہ ابتدائی بگل تھا جو اسلام سے محبّت کرنے والوں کو بیدار کرنے کے لئے بجایا گیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ یہ بگل آپ نے پے بہ پے پُوری قوّت

اور پوری شان کے ساتھ بجایا یہاں تک کہ اس کی دل ہلا دینے والی پُر شوکت آواز سے احمدیت کے ایوان گونجنے لگے۔ اس آواز میں ایک اثر تھا۔ اس آواز میں جذب و مستی تھی اس آواز میں ایک ایسا درد تھا جو دلوں کو بیتاب کرتا تھا۔ ایک ایسی کشش تھی جو دینِ محمدؐ کی طرف والہانہ کھینچتی تھی۔ اور دُنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ ہائید بانیر کی کہانی تو آخر ایک کہانی تھی اور بنسی کی وہ آواز محض ایک افسانہ ہی تو تھی جسے سُنکر بچے ماؤں سے الگ ہو کر بنسی بجانے والے کی طرف دَوڑ پڑتے تھے۔ لیکن تاریخِ احمدیت گواہ ہے کہ اس بنسی بجانے والے نے حقیقتًا ایک ایسی پُر اسرار آسمانی سُر میں بنسی بجائی کہ ہزاروں ماؤں کے لال کشاں کشاں گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنی جانوں کے نذرانے لئے ہوئے دینِ محمدؐ کی قربان گاہوں کی طرف بڑھنے لگے۔

قادیان ایک عظیم درسگاہ

تبلیغِ اسلام کا کام اچھے ٹھوس قابل اور مخلص عُلماء کا تقاضا کرتا تھا۔ اس غرض کے لئے قادیان آپ کی سرپرستی میں بزرگ اور باخدا گھرے اور ٹھوس علماء پیدا کرنے کا ایک کارخانہ بن گیا۔ قرآن کریم کا درس آپ خود بھی دیتے تھے لیکن باقاعدہ تبلیغی کلاسیں جاری فرما کر آپ نے قرآن کریم کے درس کے علاوہ مشکوٰۃ و قدوری کے درس بھی جاری فرمائے جو مسجد مبارک اور مسجد اقصےٰ میں روزانہ ہوتے تھے۔ اور سلسلہ کے جیّد علماء مثلاً حضرت قاضی سیّد امیر حسین صاحبؓ۔ حضرت سیّد محمد سرور شاہ صاحبؓ اور حضرت میر محمد اسحٰق صاحبؓ وغیرہ تدریس میں حصّہ لیتے تھے۔ ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے انجمن ترقیٔ اسلام جلد جلد ترقی کرنے لگی۔ اور چند ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی مبلّغینِ اسلام کی تعداد صدر انجمن احمدیّہ کے زیرِ اہتمام کام کرنے والے چار مبلغین سے بڑھ کر پندرہ تک جا پہنچی جو مندرجہ ذیل علاقوں میں تبلیغِ اسلام کا فریضہ سرانجام دیتے رہے:۔

پشاور۔ انبالہ۔ گوجرانوالہ۔ گجرات۔ مالوہ۔ آگرہ۔ بہار
بنگال۔ کلکتہ۔ کٹک۔ گورداسپور۔ لنڈن۔ مصر۔ شام۔

(الفضل قادیان ۱۰ر جون ۱۹۱۴ء)

تحفۃُ الملوک

خلافت کے ابتدائی مہینوں مئی جون ۱۹۱۴ء میں آپ نے ایک مختصر کتاب بعنوان "تحفۃُ الملوک" تصنیف فرمائی جو شاہِ دکن کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھی اور اس میں بڑے دلکش انداز میں انہیں احمدیت قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس کتاب کی تصنیف کا باعث یہ ہے کہ آپ کو ایک دلچسپ طویل رؤیا میں ایک رئیسِ اعظم کو تبلیغ کا طریق سکھایا گیا۔ اسی رؤیا کی بناء پر سکھائے ہوئے طریق کے مطابق آپ نے تاجدارِ دکن کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کتاب رقم فرمائی۔ کتاب کا مسوّدہ مکمل ہونے پر طباعت سے قبل ہی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے احبابِ قادیان کے ایک جلسہ میں بعد نماز عصر اسے خود پڑھ کر سُنایا ——— اس وقت سامعین کی جو کیفیت تھی اس کا کسی قدر اندازہ نمائندہ الفضل کے مندرجہ ذیل الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے :۔

> "باوجود گرمی کی تپش اور ہوا کی بندش کے سامعین بُت بنے بیٹھے تھے اور ایک عجیب عالمِ محویّت طاری تھا۔ ہمارے خواجہ کرم داد صاحب (جموّں) تو ایسے وجد میں آئے کہ چالیس منٹ تک سجدے میں پڑے رہے۔ حضور نے ایک گھنٹہ میں مضمون کا بہت سا حصّہ سُنا دیا۔ پھر نماز مغرب ادا کی گئی بعد ازاں باقی حصّہ سنانے میں پینتیس منٹ خرچ ہُوئے۔ اگر ٹھہر ٹھہر کر سُنایا جائے تو اڑھائی گھنٹوں میں ختم ہو۔" (الفضل قادیان ۲۰ر جون ۱۹۱۴ء)

بعد ازاں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اعلیحضرت نظامِ دکن کے علاوہ دیگر اربابِ حکومت کو بھی بھجوائی گئی۔ اس کے مطالعہ کے نتیجہ میں بکثرت احباب احمدیّت کی طرف مائل ہوئے۔ بالخصوص دکن کی ایک بہت بڑی شخصیّت کو اس کے ذریعہ قبولِ حق کی توفیق ملی۔ ہماری مراد حضرت سیٹھ عبد اللہ الہ دین صاحبؓ سے ہے جو اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور دکن کے ایک بڑے ہی متموّل اور صاحبِ حیثیّت گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ کہنے کو تو آپ ایک تھے لیکن فی الحقیقت پوری جماعت کی شان آپ میں جھلکتی تھی۔ سیٹھ صاحب کا

علم و فضل۔ آپ کی دلکش صُورت اور فرشتہ سیرت اور دیگر اوصافِ حمیدہ اس علاقہ میں احمدیّت کے لئے بڑی کشش کا موجب بنے۔ اور متعدد دوسرے دوستوں کو آپ کے ذریعہ احمدیت میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہُوا۔ لیکن آپ کی تبلیغی کوششوں کی حد شخصی تعلّقات تک ہی نہ تھی۔ آپ نے اپنی دولت کا بیشتر حصّہ تبلیغِ احمدیّت کے لئے وقف کر دیا اور بکثرت اشتہاروں اور رسالوں کے ذریعہ سے ہندوستان کے طول و عرض میں حضرت مسیح موعُود علیہ السّلام کا پیغام پہنچایا اور آپ کے شائع کردہ لٹریچر کے اثر سے دور و نزدیک سے بہت سی سعید رُوحیں قادیان کی طرف کھنچی چلی آئیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اپنے مبایعین میں سے ان لوگوں کا خاص احترام فرمایا کرتے تھے، جو عالم فاضل، متقی اور خدا رسیدہ ہوں اور غیر معمولی محبّت ان سے رکھتے تھے۔ بکثرت ایسے لوگوں کے لئے دعائیں کرتے اور بسا اوقات اپنے کلمات اور تقریروں میں بھی پیار سے ذکر کر کے ان کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت سیٹھ صاحب کا ذکر بھی حضور بڑی ہی محبت کے انداز میں فرمایا کرتے۔ اللہ تعالےٰ نے رؤیا میں بھی آپ کو حضرت سیٹھ صاحب کا مقام اس رنگ میں دکھایا کہ آپ ایک تخت پر بیٹھے ہیں اور آسمان سے ایک نُور ان پر گر رہا ہے اور وُہ ذکرِ الٰہی میں مصروف ہیں۔" (بشاراتِ رحمانیہ جلد اوّل صفحہ ۱۷۴-۱۷۶)

یہ کتاب اپنے گہرے خلوص اور پُر زور دلائل کی بناء پر دین داروں پر ہی نہیں بیدینوں پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ایک دوست ڈاکٹر کرم الٰہی صاحب اپنے ایک دہریہ شناسا پر اس کتاب کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ایک دہریہ نے حضور کا تحفۃ الملوک پڑھا۔ کہتا تھا کہ یہ شخص اس طاقت اور قوّت کا معلوم ہوتا ہے کہ جس پر کوئی بھی انسان غالب نہیں آ سکے گا۔" پھر اس نے "القول الفصل" پڑھ کر بھی رائے قائم کی کہ یہ ایک عجیب ہی شان کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ جس کے کلام میں بچپن یا جوشِ شباب یا ناتجربہ کاری یا پست ہمتی کا شائبہ تک نہیں بلکہ بہت بڑے دماغ اور عجیب شان کا انسان ہے جس کے کلام میں قوت عظمت اور جلال کی رُوح پائی جاتی ہے۔"

(الفضل ۲۱ مارچ ۱۹۱۵ء)

بعض دیگر علمی کاوشیں

۱۹۱۴ء کی تاریخی مجلس مشاورت کے اہم فیصلوں میں یہ امر بھی شامل تھا کہ سلسلہ کے لٹریچر کو اُردو کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں خصوصًا عربی اور انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خود حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے بلادِ اسلامیہ تک مسیح موعود علیہ السلام کا پیغام پہنچانے کے لئے "الدین الحی" کے نام سے عربی زبان میں ایک ٹریکٹ لکھا جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی ایک ایسی پیشگوئی کا ذکر کیا گیا جو ان دنوں بڑی شان سے پوری ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اہلِ بنگال کو مخاطب کرتے ہوئے ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا بنگالی میں ترجمہ کروا کر جولائی ۱۹۱۴ء میں کلکتہ سے شائع کیا گیا۔ ۱۹۱۴ء کے نہایت مصروف سال میں آپ نے والئ بھوپال کے نام بھی ایک تبلیغی خط تحریر فرمایا اور خلیفۃ المسلمین ترکی کو بھی مخاطب کرتے ہوئے انتباہ کیا کہ ترکی کا جنگِ عظیم میں جرمنی کی طرف سے شامل ہو جانا غیر مناسب اور بے سُود ہے اور ترکی کو حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی وہ پیشگوئی یاد دلائی جس میں ترکی کی نام نہاد خلافت کی زبوں حالی کا ذکر ہے۔ خلافت کے پہلے سال کی شدید مصروفیات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آپ کو ٹھوس علمی تصانیف کے لئے وقت کیسے میسّر آتا تھا لیکن اپنے عظیم باپ کی طرح آپ کو بھی اللہ تعالےٰ نے غیر معمولی استعدادوں سے نوازا تھا جیسا کہ آپ خود اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ

"مَیں تیز قدم ہوں کاموں میں بجلی ہے مری رفتار نہیں"۔ (کلام محمود)

اس سال کی جملہ تصانیف میں امتیازی شان اور غیر معمولی کشش کا حامل آپ کا وہ سلسلہ وار مضمون تھا جو تاریخ اسلام کے وسیع عنوان کے تحت سیرتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ہفتہ وار الفضل میں شائع ہوتا رہا۔ یہ مضمون آپ نے منصبِ خلافت پر متمکن ہونے سے قبل ہی شروع کر رکھا تھا۔ لیکن خلافت کی غیر معمولی اور وسیع ذمہ داریوں کی بناء پر کچھ عرصہ یہ سلسلہ تعطّل کا شکار رہا۔ پھر اچانک آپ کی توجہ اس اہم مضمون کی طرف پھیری گئی اور دیگر مصروفیات کے باوجود آپ نے بالاقساط اس مضمون کو رقم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ الفضل کی جلدوں کو اس مضمون نے ایک عجیب دلکشی اور شانِ محبوبی

عطا کر دی ہے۔ سیرتِ نبویؐ پر ایسے انوکھے۔ سادہ مگر پُر اثر اور دل نشین انداز میں شاید ہی کسی کو قلم اُٹھانے کی توفیق ملی ہو۔ یہ مضمون ایک دریا ہے عشق و عرفان کا جسے طوالت کے خوف سے نہ تو مِن وعَن نقل کرنا سہل ہے اور نہ یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ کس حصّے کو نمونے کے طور پر اخذ کیا جائے اور کسے چھوڑا جائے۔

منارۃ المسیح کی تکمیل

اسی سال آپ نے جماعت کو منارۃ المسیح کی عمارت کی تکمیل کی طرف توجّہ دلائی، جو بنیادوں تک پہنچ کر رُکی ہوئی تھی۔ چنانچہ تعمیرِ نَو کا آغاز کرتے ہوئے آپ نے ۲۷ر نومبر ۱۹۱۴ء کو دردمندانہ دعاؤں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے پہلی اینٹ نصب کی۔ بفضلہٖ تعالیٰ یہ کام دو سال کی مدّت میں مکمّل ہو گیا۔

دُوسری شادی

۱۹۱۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا دوسرا نکاح حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت امۃ الحی صاحبہ سے ہونا قرار پایا۔ یہ نکاح سلسلہ کے مشہور بزرگ اور عالمِ دین حضرت مولانا سیّد محمد سرور شاہ صاحب نے ایک ہزار روپے حق مہر پر ۳۱ر مئی ۱۹۱۴ء کو پڑھایا[1]۔ حضرت صاحبزادی امۃ الحی صاحبہ کی طرف سے اُن کے بھائی میاں عبدالحی صاحب ولی تھے۔ جنہوں نے حاضر احبابِ جماعت سے اجازت لے کر اس نکاح کی منظوری دی۔ اس شادی کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کی زندگی ہی میں آپ کو خیال پیدا ہو چکا تھا۔ اور ایک رؤیا کی بناء پر آپ کو یہ یقین تھا کہ رشتہ یہیں ہوگا لیکن باوجود کئی مرتبہ ارادہ کرنے کے حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں پیغام نہ بھجوا سکے۔ کچھ تو طبعی حجاب مانع رہا اور کچھ جماعت میں ابتلاء کا خوف۔ بہت سے منہ پہلے ہی سو قسم کی باتیں بنا رہے تھے۔ اگر یہ پیغام دے دیا جاتا تو مزید فتنہ پھیلانے کے لئے یہ بہانہ بنایا جاتا کہ داماد بن کر خلافت پر قبضہ کرنے کی مزید کوشش کی جا رہی ہے۔

---

[1] الفضل ۳ر جون ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۲

۱۹۱۴ء کا سال ایک اور پہلو سے بھی جماعت احمدیہ کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد رضی اللہ عنہ کی ولادت کی پیشگوئی میں آپ کو ایک لقب "عالم کباب" بھی دیا گیا تھا۔ جس کا مطلب اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السّلام پر منکشف نہ ہُوا یہ وہ سال ہے جس میں عملاً دنیا کو اس لقب کا مطلب سمجھا دیا گیا اور حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد کے خلافت پر متمکّن ہونے کے بعد اسی سال ایک عالمی جنگ نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر زبانِ حال سے ایک عالم کباب کے ظاہر ہونے کی خبر دی۔ یعنی ایک ایسے وجود کے ظاہر ہونے کی خبر دی جس کے زمانہ میں ایک عالمی جنگ نے دنیا کو کباب کر دینا تھا۔ اس جنگ نے کچھ اس طرح ایک عالم کے جسموں اور دلوں کو کباب کیا کہ اس کی کوئی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ تاریخِ انسانی میں یہ وہ جنگ تھی جس میں حقیقتاً انسان نے انسان پر آگ کی بارش برسائی اور لکھوکھا انسان اور ہزاروں شہر اس جنگ کی نذر ہو گئے۔ یہ وہ پہلی جنگ تھی جس میں ہار جیت کا انحصار کلیۃً آگ کی قوت یعنی FIRE POWER پر تھا۔ یہ وہ پہلی جنگ تھی جسے فی الحقیقت عالمی جنگ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اور کوئی ایک ملک بھی ایسا نہ تھا جو اس کی تباہ کاریوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متأثر نہ ہُوا ہو۔ شہروں کے شہر جل کر خاکستر ہو گئے۔ ملکوں کے ملک ویران ہو گئے۔ اس کی ہلاکت خیزیوں سے ازمنۂ گزشتہ کی ہولناک ترین جنگوں کو بھی کوئی نسبت نہیں۔ ذرا تصوّر کیجیئے کہ صرف مغربی محاذ کے ایک سیکٹر پر ایک ہولناک طویل معرکے میں تین لاکھ برطانوی سپاہی کام آئے بوڑھوں بچّوں اور عورتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اسّی لاکھ صرف ان نوجوانوں کی تعداد ہے جو اس جنگ میں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ مشرقی یورپ کی ایک ریاست سربیا کی نصف آبادی اس جنگ میں ہلاک ہو گئی [۱]

۱۹۱۴ء کا جلسہ سالانہ

اس سال کا ذکر اب ہم ان تقاریر پر ختم کرتے ہیں جو جماعت احمدیہ کے ۱۹۱۴ء کے جلسہ سالانہ کے موقع پر چار دن تک مختلف وقتوں میں آپ نے ۲۶ تا ۲۹ دسمبر احباب جماعت کے سامنے فرمائیں۔ یہ چاروں تقریریں اس لحاظ سے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

---

[۱] A HISTORY OF EUROPE BY RT. HON. H.A.L. FISHER. PP. 1156-1157.

کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ذہن کی پختگی اور وسعت کی یہ ایک روشن دلیل ہیں کوئی ضروری مسئلہ ایسا نہیں جس پر رہنمائی کی ان دنوں جماعت کو ضرورت ہو اور آپ نے اس پر روشنی نہ ڈالی ہو۔ ان تقریروں کا مجموعہ "برکاتِ خلافت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے تفصیلی تعارف کی تو گنجائش نہیں ہاں بعض اقتباسات نمونہ کے طور پر ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں تا کہ اس زمانہ میں مختلف مسائل کے بارے میں آپ کا اندازِ فکر و نظر معلوم ہو سکے۔

اہلِ قادیان کو نصیحت

"وہ لوگ جو قادیان کے رہنے والے ہیں ان کو مَیں نصیحت کرتا ہوں کہ پانچ باتیں جن لوگوں میں پائی جاتی ہوں وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتے اور ان پانچوں میں سے ایک مہمان کی قدر کرنا ہے۔ قادیان کے رہنے والے کہتے ہیں کہ ہماری نسبت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہامات ہیں اور آپ نے ہماری نسبت بہت عمدہ الفاظ فرمائے ہیں مَیں ان باتوں کو مانتا ہوں۔ مگر تم اپنے اعمال سے بھی ثابت کر دکھاؤ کہ واقعی تم ان باتوں کے مستحق ہو۔ پس جو مہمان تمہارے پاس آتے ہیں ان کی خاطر اور تواضع میں لگ جاؤ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ میرے مہمان نہیں ہیں۔ اس لئے مجھے خدمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اور تم اللہ کے بندے ہو تو کیا یہ بندے کا فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے مہمان کی خبر گیری کرے .... اگر تمھیں کسی سے تکلیف بھی پہنچ جائے تو اس کو برداشت کرو۔ اور کسی کی ہتک کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ جو مہمان کی ہتک کرتا ہے وہ اپنی ہی ہتک کرتا ہے کیونکہ مہمان اس کی عزت ہوتا ہے۔ پس اس سے زیادہ احمق کون ہے جو اپنی عزت آپ برباد کرے۔"

(برکاتِ خلافت صـــ)

ملاقات کے آداب

جماعت کے اُن احباب کو جو ملاقات کے وقت آپ کے گھٹنوں اور پاؤں کو ہاتھ لگاتے تھے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"بعض لوگ گھٹنوں یا پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہیں گو وہ یہ کام شرک کی نیّت سے نہیں کرتے بلکہ محبّت اور عقیدت کے جوش میں کرتے ہیں لیکن ایسے کاموں کا انجام ضرور شرک ہوتا ہے۔اس وقت ایسا کرنے والوں کی نیّت شرک کی نہیں ہوتی مگر نتیجہ شرک ہی ہوتا ہے بخاری شریف میں آیا ہے۔ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں حضرت نوحؑ کی قوم کے جن بُتوں کے نام آئے ہیں وہ دراصل مشرک اقوام کے بڑے بڑے آدمی تھے۔ان کے مرنے پر پچھلوں نے ان کی یادگاریں قائم کرنی چاہیں تاکہ ان کو دیکھ کر ان میں جو صفات تھیں ان کی تحریک ہوتی رہے۔اس کے لئے انہوں نے سٹیچو (مجسّمہ) بنا دیئے لیکن ان کے بعد آنے والے لوگوں نے جب دیکھا کہ ہمارے آباء و اجداد ان مجسّموں کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو انہوں نے ان کی اَور عزّت کرنی شروع کردی۔پھر اسی طرح رفتہ رفتہ ان کی تعظیم بڑھتی گئی بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کے آگے سجدے کئے جانے لگے اور ان کی اصل حالت کو بُھلا کر انہیں خدا کا شریک بنا لیا گیا۔تو بعض باتیں ابتداء میں چھوٹی اور بے ضرر معلوم ہوتی ہیں مگر ان کا نتیجہ ایسا خطرناک نکلتا ہے کہ پھر اس کی تلافی ناممکن ہوجاتی ہے۔میری اپنی حالت اور فطرت کا تو یہ حال ہے کہ مَیں ہاتھ چومنا بھی ناپسند کرتا ہوں۔"

مقامِ خلافت

"اب مَیں ایک بات بیان کرنا شروع کرتا ہوں اور وہ خلافت کے متعلق

ہے۔شاید کوئی کہے کہ خلافت کے بڑے جھگڑے سنتے رہے ہیں۔ اور یہاں بھی کل اور پرسوں سے سُن رہے ہیں آخر یہ بات ختم بھی ہوگی یا نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلے جو باتیں تم خلافت کے متعلق سُن چکے ہو وہ تو تمھیں ان لوگوں نے سنائی ہیں جو رہرو کی طرح ایک واقعہ کو دیکھنے والے تھے۔ دیکھو! ایک بیمار کی حالت اس کا تیمار دار بھی بیان کرتا ہے مگر بیمار جو اپنی حالت بیان کرتا ہے وہ اَور ہی ہوتی ہے۔اسی طرح دوسرے لوگوں نے اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق تمھیں باتیں سُنائی ہیں مگر مَیں جو کچھ تمھیں سُناؤنگا وہ آپ بیتی ہوگی جگ بیتی نہیں ہوگی۔ دوسرے کے درد اور تکلیف کا خواہ کوئی کتنا ہی بیان کرے لیکن اس حالت کا وہ کہاں اندازہ لگا سکتا ہے جو مریض خود جانتا ہے اس لئے جو کچھ مجھ پر گذرا ہے اس کو مَیں ہی اچھی طرح سے بیان کر سکتا ہوں۔ دیکھنے والوں کو تو یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہوگی کہ کئی لاکھ کی جماعت پر حکومت مل گئی۔مگر خدا را غور کرو کیا تمھاری آزادی میں پہلے کی نسبت کچھ فرق پڑ گیا ہے۔کیا کوئی تم سے غلامی کرواتا ہے یا تم پر حکومت کرتا ہے یا تم سے ماتحتوں غلاموں اور قیدیوں کی طرح سلوک کرتا ہے کیا تم میں اور ان میں جنہوں نے خلافت سے رُوگردانی کی ہے کوئی فرق ہے کوئی بھی فرق نہیں۔لیکن نہیں ایک بہت بڑا فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ

تمھارے لئے ایک شخص تمھارا درد رکھنے والا۔تمھاری محبّت رکھنے والا۔تمھارے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھنے والا۔ تمھاری تکلیف کو اپنی تکلیف جاننے والا۔تمھارے لئے خدا کے حضور دُعائیں کرنے والا ہے۔

مگر اُن کے لئے نہیں ہے۔تمھارا اسے فکر ہے درد ہے اور وہ

تمہارے لئے اپنے مولیٰ کے حضور تڑپتا رہتا ہے۔ لیکن ان کے لئے ایسا کوئی نہیں ہے۔ کسی کا اگر ایک بیمار ہو تو اس کو چین نہیں آتا لیکن کیا تم ایسے انسان کی حالت کا اندازہ کرسکتے ہو جس کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بیمار ہوں پس تمہاری آزادی میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔ ہاں تمہارے لئے ایک تم جیسے ہی آزاد پر بڑی ذمّہ داریاں عاید ہوگئی ہیں۔"

"خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو ایک پہلے شخص کا کام کرے۔ اور خلیفہ جس کا قائم مقام ہوتا ہے اس کی نسبت اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ [1]۔ کہ ہم نے تیرا وہ بوجھ جس نے تیری کمر توڑ دی تھی اتار دیا ہے۔ تو جب اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ اس بوجھ سے ٹوٹنے کے قریب تھی تو اور کون ہے جو یہ بار اٹھا کر سلامت رہ سکے۔ لیکن وہی خدا جس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بوجھ کو ہلکا کیا تھا اور اس زمانہ میں بھی اپنے دین کی اشاعت کے لئے اس نے ایک شخص کو اس بوجھ کے اٹھانے کی توفیق دی۔ وہی اس کے بعد اس کے دین کے پھیلانے والوں کی کمریں مضبوط کرتا ہے۔"

آپ کی طرزِ استدلال کا ایک نمونہ

"ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ خلیفہ وہ ہوتا ہے جو بادشاہ ہو۔ یا مامور ہو۔ تم کون ہو؟ بادشاہ ہو؟ میں کہتا ہوں نہیں۔ مامور ہو؟ میں کہتا ہوں نہیں۔ پھر تم خلیفہ کس طرح ہو سکتے ہو؟ خلیفہ کے لئے بادشاہ یا مامور ہونا شرط ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے لوگوں نے خلیفہ کے لفظ پر ذرا بھی تدبّر نہیں کیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص درزی کی دکان پر جائے اور دیکھے کہ ایک لڑکا اپنے

---

[1] سورۃ الم نشرح۔ آیت ۳-۴

استاد کو کہتا ہے" خلیفہ جی"۔ وہ وہاں سے آکر لوگوں کو کہنا شروع کردے کہ خلیفہ تو درزی کو کہتے ہیں اور کوئی شخص جو درزی کا کام نہیں کرتا وہ خلیفہ کس طرح ہوسکتا ہے ؟ اسی طرح ایک شخص مدرسہ میں جائے (پہلے زمانہ میں مانیٹر کو خلیفہ کہتے تھے) اور لڑکوں کو ایک لڑکے کو خلیفہ کہتے سُنے اور باہر آکر کہدے کہ خلیفہ تو اسے کہتے ہیں جو لڑکوں کا مانیٹر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ شخص جو لڑکوں کا مانیٹر نہیں وہ خلیفہ نہیں ہوسکتا۔ خلیفہ کے لئے تو لڑکوں کا مانیٹر ہونا شرط ہے۔

اسی طرح ایک شخص دیکھے کہ آدم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے خلیفہ بنایا اور ان کے لئے فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرو۔ وہ کہے کہ خلیفہ تو وہی ہوسکتا ہے جس کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو ملے ورنہ نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ایک اور شخص آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کو دیکھے جن کے پاس سلطنت اور حکومت تھی تو کہے کہ خلیفہ تو اس کو کہتے ہیں جس کے پاس سلطنت ہو اس کے سوا اور کوئی خلیفہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خلیفہ کے لئے سلطنت کا ہونا شرط ہے لیکن ایسا کہنے والے اتنا نہیں سمجھتے کہ خلیفہ کے لفظ کے معنی کیا ہیں ؟ اس کے یہ معنے ہیں کہ جس کا کوئی خلیفہ کہلائے اس کا وہ کام کرنے والا ہو۔ اگر کوئی درزی کا کام کرتا ہے تو وہی کام کرنے والا اس کا خلیفہ ہے۔ اور اگر کوئی طالب علم کسی اُستاد کی غیر حاضری میں اس کا کام کرتا ہے تو وہ اس کا خلیفہ ہے۔

اسی طرح اگر کوئی کسی نبی کا کام کرتا ہے تو وہ اس نبی کا خلیفہ ہے۔ اگر خدا نے نبی کو بادشاہت اور حکومت دی ہے تو خلیفہ کے پاس بھی بادشاہت ہونی چاہیئے اور خدا خلیفہ کو ضرور حکومت دے گا اور اگر نبی کے پاس ہی حکومت نہ ہو تو خلیفہ کہاں سے

لائے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو چونکہ خدا تعالیٰ نے دونوں چیزیں یعنی رُوحانی اور جسمانی حکومتیں دی تھیں اس لئے ان کے خلیفہ کے پاس بھی دونوں چیزیں تھیں۔لیکن اب جبکہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو حکومت نہیں دی تو اس کا خلیفہ کس سے لڑتا پھرے کہ مجھے حکومت دو۔ ایسا اعتراض کرنے والے لوگوں نے خلیفہ کے لفظ پر غور نہیں کیا۔"

"مَیں ایک دفعہ قسم کھا چکا ہوں اور پھر اسی ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے اور جو اس گھر (مسجد) کا مالک ہے اور مَیں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو آسمان اور زمین کا حاکم ہے جس کی جھوٹی قسم لعنت کا باعث ہوتی ہے۔ اور جس کی لعنت سے کوئی جھوٹا بچ نہیں سکتا کہ مَیں نے کسی آدمی کو کبھی نہیں کہا کہ مجھے خلیفہ بنانے کے لئے کوشش کرو۔ اور نہ ہی کبھی خدا تعالیٰ کو مَیں نے یہ کہا ہے کہ مجھے خلیفہ بنائیو۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس کام کے لئے خود اپنے فضل سے چُن لیا ہے تو مَیں کس طرح اسے ناپسند کرتا؟ کیا اگر تمہارا کوئی دوست تمھیں کوئی نعمت دے اور تم اس کو لے کر نالی میں پھینک دو تو تمہارا دوست خوش ہوگا؟ اور تمہاری یہ حرکت درست ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ تو اگر خدا تعالیٰ نعمت دے تو کون ہے جو اس کو ہٹا سکے۔ جب دنیا کے دوستوں کی نعمتوں کو کوئی ردّ نہیں کرتا بلکہ بڑی عزّت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو مَیں خدا تعالےٰ کی دی ہوئی اس نعمت کو کس طرح ردّ کر دوں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کی نعمتوں کو ردّ کرنے والوں کے بڑے خطرناک انجام ہوتے رہے ہیں۔"

"پس اگر مجھے خلیفہ ماننے والے بھی سب کے سب نہ ماننے والے ہوجاتے اور کوئی بھی نہ مانتا اور ساری دُنیا میری دشمن اور جان کی پیاسی ہوجاتی جو کہ زیادہ سے زیادہ یہی کرتی کہ میری جان نکال

لیتی - تو بھی مَیں آخری دم تک اس بات پر قائم رہتا - اور کبھی خدا تعالےٰ کی نعمت کے ردّ کرنے کا خیال بھی میرے دل میں نہ آتا - کیونکہ یہ غلطی بڑے بڑے خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے "

"اُس شخص کو خدا کی معرفت سے کوئی حصّہ نہیں ملا اور وہ خدا کی حکمتوں کے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا جو مجھے کہتا ہے کہ آپ خلافت کو چھوڑ دیں - اس نادان کو کیا معلوم ہے کہ اس کے چھوڑنے کا کیا نتیجہ ہوگا - پس حضرت عثمانؓ کی طرح مَیں نے بھی کہا کہ جو قبا مجھے خدا تعالےٰ نے پہنائی ہے وہ مَیں کبھی نہیں اتاروں گا خواہ ساری دنیا اس کے چھیننے کے درپے ہو جائے - پس مَیں آگے ہی آگے بڑھوں گا خواہ کوئی میرے ساتھ آئے یا نہ آئے - مجھے خدا تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ابتلاء آئیں گے مگر انجام اچھا ہوگا - پس کوئی میرا مقابلہ کر کے دیکھ لے خواہ وہ کوئی ہو انشاء اللہ تعالےٰ مَیں کامیاب رہوں گا"

"بعض دن تو مجھ پر ایسے آتے ہیں کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ شام تک مَیں زندہ نہیں رہوں گا - اس وقت مَیں یہی خیال کرتا ہوں کہ جتنی دیر زندہ ہوں اتنی دیر کام کئے جاتا ہوں - جب مَیں نہ رہوں گا تو خدا تعالےٰ کسی اَور کو اس کام کے لئے کھڑا کر دے گا - مجھے اپنی زندگی تک اس کام کا فکر ہے جو میرے سپرد خدا تعالےٰ نے کیا ہے بعد کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے - یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے ہی چلایا ہے اور وہی اس کا انتظام کرتا رہے گا "

ازدواجی رشتے طے کرنے کیلئے رہنما اصول

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرزِ کلام بھی کیسی پیاری ہے کہ ہر ایک جو فطرتِ صحیحہ رکھتا ہے سُنکر آپؐ پر قربان ہو جاتا ہے - اہلِ عرب میں حسب نسب کا بڑا رواج تھا اس لئے صحابہؓ نے آنحضرت صلعم سے پوچھا - یا رسُول اللہ! سب سے شریف کون ہے؟ اس سے ان کا یہ منشاء تھا کہ آپؐ چند قبیلوں کے نام لے

دیں گے اور انہیں اچھا سمجھا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا۔ سب سے شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ نیک اور متقی ہو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے سوال کا یہ مطلب نہ تھا۔ فرمایا تو پھر سب سے شریف یوسف تھا کیونکہ یوسف نبی تھا اس کا باپ نبی تھا اس کے باپ کا باپ نبی تھا۔ سبحان اللہ! کیا ہی لطیف طرز سے آپؐ نے صحابہؓ کے سوال کا جواب دیا کہ ان کی بات کا جواب بھی آگیا اور ان کی دل شکنی بھی نہ ہوئی۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ہمارا یہ مطلب بھی نہیں تھا۔ فرمایا اچھا تو تم لوگ قبائلِ عرب کے متعلق سوال کرتے ہو۔ ان میں سے جو جاہلیّت میں شریف سمجھے جاتے تھے اسلام میں بھی وہی شریف ہیں مگر شرط یہ ہے کہ دین سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"اخلاق اسی لئے دیکھے جاتے ہیں کہ نتیجہ نیک نکلے۔ اگر کسی کو اپنے اخلاق اور عادات کے مطابق کوئی لڑکا مِل جائے خواہ وہ کسی قوم کا ہو تو اس سے رشتہ کر دینا چاہیئے جو آج وضیع سمجھا جاتا ہے وہ کل شریف ہو سکتا ہے۔ ایک شخص اگر ادنیٰ حیثیّت سے مثلاً چوڑھے سے مسلمان ہو تو مَیں اسی وقت اس کے ساتھ مل کر کھانا کھا لوں گا اور مَیں اس کا جُوٹھا کھا سکتا ہوں اور وہ میرا جُوٹھا کھا سکتا ہے۔ کیونکہ جب اُس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہا تو میرے اور اس میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اسلام کے لحاظ سے جو میرے حقوق ہیں وُہی اس کے ہیں۔ اس میں ذرّہ بھر بھی فرق نہیں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بادشاہ مسلمان ہو کر آیا تھا۔ کعبہ کا طواف کرتے وقت کسی صحابی کے پاؤں کے نیچے اس کا کپڑا آکر گر گیا۔ اس نے اس کو تھپّڑ مارا۔ کسی نے اس سے کہا کہ حضرت عمرؓ تجھ سے اس کا بدلہ لیں گے۔ اس نے کہا کیا مجھ غسّان کے بادشاہ سے اس مفلس کے مارنے کا بدلہ لیں گے؟ اور کیا مجھے بھی نہیں چھوڑیں گے؟ اس نے کہا نہیں۔ اس کو جو زیادہ شک ہوُا تو جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہنے لگا کہ کیا اگر کوئی بڑا آدمی کسی رذیل کو مارے تو آپ اس کا بدلہ تو نہیں لیں گے؟ انہوں نے کہا۔ او جبلہ تو کسی کو مار تو نہیں بیٹھا۔ اگر تم نے کسی کو مارا ہے تو خدا کی قسم مَیں ضرور تم سے اس کا بدلہ

لوں گا۔ یہ سُنکر رات کو وہ بھاگ گیا اور اس کی تمام قوم عیسائی ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہے۔ تو حقوق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ مگر شادی میں صرف اسی بات کا خیال نہیں رکھنا بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ جن دو شخصوں کا پیوند ساری عمر کے لئے ہونے لگا ہے ان میں آپس میں اخلاق کا کوئی فرق تو نہیں۔ اور بعض اقوام کے اخلاق گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس ان سے ضرور علیحدہ رہنا پڑے گا تا کہ ہمیشہ کا جھگڑا نہ پیدا ہو جائے لڑکے لڑکی کے امن اور آرام کی وجہ سے ایک حد تک کفو کا خیال بھی رکھنا پڑے گا۔ لیکن جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں ہر ایک چیز کی حد ہوتی ہے۔ خدا تعالےٰ نے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[1] فرما کر یہ قاعدہ بتا دیا ہے کہ اصل شرافت تقویٰ ہی ہے۔ پس تم کبھی اس بات پر دلیری نہ کرو۔ کہ فلاں قوم کمینی ہے۔ تم بے شک بعض قوموں سے اختلافِ اخلاق و عادات کی وجہ سے رشتہ سے پرہیز کرو لیکن کسی کو وضیع نہ کہو۔ کیونکہ جو آج شریف ہوتا ہے وہ حالات کے بدلنے سے وضیع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے حضور سارے ایک جیسے ہیں۔ جس کے اخلاق اور عادات اچھے ہیں وہی اعلیٰ ہے۔ پس اگر ایسا ہو کہ مرد کے ایسے خیالات اور عادات ہیں جو لڑکی کے خاندان کے خلاف ہیں تو ان کی شادی نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر ایسی شرائط لگانا کہ مغل اور مغل بھی برلاس ہو وغیرہ وغیرہ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ تم نیکی اور تقویٰ کو شادی کے معاملہ میں اوّل دیکھو۔"

"اب ضرورت مجبور کرتی ہے کہ کچھ مدّت کے لئے پھر اسی حکم پر عمل کیا جائے یعنی نہ غیر احمدیوں کو لڑکیاں دی جائیں اور نہ سوائے کسی اشد ضرورت کے ان کی لڑکیاں لی جائیں۔ کیونکہ اس وقت ہماری جماعت تھوڑی ہے اور یہ دقت پیش آرہی ہے کہ احمدی تو غیر احمدیوں کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں اور جو احمدی لڑکیاں ہیں وہ غیروں کے ہاں جا نہیں سکتیں۔ پس ان کے لئے رشتہ ملنے میں دقّت ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض کمزور احمدیوں کو ابتلاء آجاتا ہے اور وہ غیر احمدیوں کو اپنی لڑکیاں دے دیتے ہیں۔ مجھے بہت سے لوگ لکھتے ہیں کہ لڑکی جوان ہے آپ کہیں شادی کا انتظام کر دیں۔ مَیں اس

---

[1] سورۃ حجرات۔ آیت ۱۴

کے لئے جب اپنی جماعت کے لڑکوں پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کی شادیاں غیروں کے گھر ہوتی جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر احمدی لڑکوں کی شادیاں غیر احمدیوں کے ہاں کی جائیں تو احمدی لڑکیاں کہاں جائیں۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ وہ غیر احمدیوں کے ہاں جاکر ابتلاؤں میں پھنسیں۔ پس جماعت وہی قائم رہ سکتی ہے جو اپنے تمام افراد کا خیال رکھے۔ آج کل تم اس بات کا خیال کرکے غیروں کی لڑکیاں نہ لو۔ اور اپنوں کو ابتلاؤں سے بچاؤ تاکہ تمھاری جماعت مضبوط ہو۔" (صفحہ ۵۶)

نماز باجماعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:۔

" نماز باجماعت پڑھنے میں احمدیوں کو ایک دقت ہے۔ اور وہ یہ کہ غیر احمدیوں کے پیچھے تو وہ نماز پڑھ نہیں سکتے۔ اور بعض جگہ احمدی صرف ایک ہی ہوتا ہے اس لئے اسے نماز باجماعت ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اور چونکہ نماز باجماعت ادا کرنے میں انسان کو وقت کی پابندی کرنی پڑتی ہے جب نماز باجماعت نہ ملے تو رفتہ رفتہ انسان سُستی کرنی شروع کر دیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ مَیں نے جماعت کے ساتھ تو نماز پڑھنی ہی نہیں جس وقت چاہوں گا پڑھ لوں گا۔ اس طرح وہ وقت کی پابندی نہیں کرتا اور آخر اوّل وقت نماز پڑھنے کی عادت جاتی رہتی ہے یا جمع کرکے نماز ادا کرنے کی عادت ہوجاتی ہے۔ اور نماز باجماعت ادا کرنے سے تو ایسا غافل ہوجاتا ہے کہ اگر کہیں باجماعت نماز پڑھنے کا موقع مل بھی جائے تو بھی سُستی کر دیتا ہے۔ گو یہ عادت ایک مجبوری کی وجہ سے اسے پڑتی ہے لیکن احمدیوں میں ہرگز ہرگز سُستی نہ ہونی چاہیئے۔ جس وقت سُستی پَیدا ہوئی اسی وقت سے اس جماعت کی تباہی کا آغاز ہوجائیگا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) پس جس گاؤں میں کوئی اکیلا احمدی ہے وہ کوشش کرے کہ دوسرا پَیدا ہوجائے۔ مجھے امید ہے کہ اگر اس طرح کوشش کرے گا تو خدا تعالےٰ ضرور اس کا ساتھی پیدا کر دے گا لیکن اگر دوسرا ساتھی نہ ہو تو دوسرے گاؤں میں جاکر جہاں کوئی احمدی ہو دوسرے تیسرے دن نماز باجماعت پڑھو۔ اور سُستی کی عادت نہ ڈالو۔ اگر تم اس کو بھُولے تو یاد رکھو کہ پھر تم ترقی نہیں کرسکو گے۔

وہ احمدی جو بڑے بڑے شہروں میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے مکان تک ان کا جانا مشکل ہوتا ہے ان کے لئے یہ بات نہایت مشکل ہے کہ ہر نماز کے وقت ایک جگہ جمع ہو سکیں۔ لیکن ان کو چاہیئے کہ اپنے محلہ کے احمدی مل کر باجماعت نماز پڑھا کریں۔ اور کبھی کبھی سارے اکٹھے ہو کر بھی پڑھیں۔ سُستی ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ایسی خطرناک بات ہے کہ اس کے نتائج بہت بُرے نکلتے ہیں۔ مجھے قرآن شریف سے یہی معلوم ہُوا ہے کہ جس کو نماز باجماعت پڑھنے کا موقع ملے اور وہ نہ پڑھے تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ حضرت ابنِ عباسؓ کا بھی یہی مذہب ہے۔" (ص۹۶ تا ص۹۸)

زکوٰۃ کی اہمیّت

"زکوٰۃ کا حکم ایک بے نظیر حکم ہے اور اسلام کی بے انتہاء خوبیوں میں سے ایک روشن خوبی ہے اور بہت سی جماعتوں پر اس کے ذریعہ اسلام کی عظمت کی حجّت قائم کی جاسکتی ہے۔ مثلاً یورپ میں آجکل دو گروہ ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ جتنا کوئی کماتا ہے اسے کمانے دو اور اس کو اپنی محنت کا ثمرہ اُٹھانے دو۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ سارے مُلک کے لوگ کام کرتے ہیں تب ہی دولت آتی ہے اس لئے جو لوگ بہت مالدار ہیں ان سے چھین کر مفلس اور نادار لوگوں کو دینا چاہیئے تاکہ وہ بھُوکے نہ مریں اور مُلک کے کاروبار میں خلل واقع نہ ہو۔ خدا تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کی باتوں کو ردّ کرکے ٹھیک اور درست بات بیان فرمادی ہے۔ اور اسلام نے افراط اور تفریط دونوں کو چھوڑ کر عُمدہ بات لے لی ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر صرف زکوٰۃ کا مسئلہ لے کر یورپ کے سامنے پیش کیا جائے تو کسی کی طاقت نہیں کہ اس کی صداقت اور عمدگی سے انکار کر سکے۔ بعض لوگ زکوٰۃ کو ایک چٹّی خیال کرتے ہیں لیکن زکوٰۃ چٹّی نہیں ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے مَیں تمہیں ایک موٹی بات بتاتا ہوں۔ گورنمنٹ رعایا سے ٹیکس لیتی ہے...... پھر اس ٹیکس سے ملک اور رعایا کی حفاظت کے لئے فوج اور پولیس تیار کرتی ہے۔ رعایا کے آرام کے لئے سڑکیں اور شفاخانے

بناتی ہے اور طرح طرح کے آرام بہم پہنچاتی ہے تو چونکہ گورنمنٹ رعایا کے آرام کے لئے ہی ٹیکس لیتی ہے اس لئے اس کے اس ٹیکس لینے کو کوئی چٹی خیال نہیں کرتا۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی چٹی نہیں بلکہ خود انسانوں کے بھلے کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے جس طرح گورنمنٹیں اپنی رعایا کی بہتری کے لئے ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی زکوٰۃ مقرر فرمائی ہے اور اس کے بدلہ میں یہ عہد کیا ہے کہ تمہارے اموال میں برکت ہو گی اور وہ ہر ایک قسم کی ہلاکتوں سے محفوظ ہو جائیں گے جیسا کہ فرمایا۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۹ : ۱۰۳) ان لوگوں کے اموال میں سے صدقات کا مال لو اور اس ذریعہ سے ان کو ظاہری اور باطنی نقصوں سے پاک کر دو۔ اور ان کے لئے دُعائیں کرو کیونکہ تمہاری دُعائیں ان کے لئے آرام اور راحت کا موجب ہیں۔ غرضیکہ زکوٰۃ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا ٹیکس ہے جس کے بدلہ میں انسان پر رحمت اور اس کی ظاہری و باطنی پاکیزگی کا وعدہ ہے۔ جب سے مسلمانوں نے زکوٰۃ دینی چھوڑ دی ہے اس وقت سے ان کا مال کم ہی کم ہو رہا ہے۔ کہاں تو ایک وقت تھا کہ یہ دُنیا کے بادشاہ تھے لیکن آج ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ زکوٰۃ دینے والے کو اللہ تعالیٰ اسی طرح کامیابی اور پاکیزگی کا وعدہ دیتا ہے جس طرح گورنمنٹ ٹیکس لے کر حفاظت کا وعدہ کرتی ہے۔ لیکن افسوس کہ لوگ گورنمنٹ کے وعدہ کو تو سچا سمجھتے ہیں اور بڑی خوشی سے ٹیکس ادا کر دیتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کے وعدہ کو سچا نہیں سمجھتے اسی لئے زکوٰۃ نہیں دیتے۔ زکوٰۃ کے ذریعہ سے انسان بہت سے دکھوں اور تکلیفوں سے بچ جاتا ہے کیونکہ خدا کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔" (صفحہ ۹۱ تا صفحہ ۹۲)

تعلیمی ترقی کیلئے سکولوں کا قیام

"ایک اور امر جس کی طرف مَیں آج آپ لوگوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جماعت کی تعلیمی ترقی کے لئے مَیں نے تجویز کی ہے کہ ہر جگہ پرائمری سکول کھولے

جائیں۔ چنانچہ میں نے یہ کام شروع کروا دیا ہے اور اس وقت تک دس کے قریب سکول کھل چکے ہیں...... پس سکولوں کے کھلوانے کی کوشش کرو۔ اس کے لئے انجمن ترقی اسلام کے ماتحت میں نے ایک سب کمیٹی بنادی ہے جو سکولوں کے کھلوانے کا انتظام کرتی ہے۔" (صہ۹۴)

مذکورہ بالا مسائل پر اظہارِ خیال، تجاویز اور نصائح کرنے کے علاوہ آپ نے دیگر بہت سے مسائل پر بھی گفتگو فرمائی مثلاً سلسلہ کے لئے واعظین اور علماء کی ضرورت اور ان کے متعلق مناسب اقدامات۔ قرآن باترجمہ پڑھانے کی ضرورت اور اس کے مناسب انتظامات خط و کتابت کے ذریعہ دینی تعلیم کا انتظام۔ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی کتب اور ان کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور ان کے امتحانات۔ سلسلہ کے خصوصی عقائد کا انضباط اور ان پر رسالہ جات کی تدوین تاکہ جماعت میں بعد میں کسی قسم کا نظریاتی اختلاف یا غلط فہمی کا احتمال نہ رہے۔ منارۃ المسیح کی تعمیرِ نو سے متعلق تحریک۔ بذریعہ ٹریکٹ تبلیغ کرنے کی ضرورت اور قوم کو اس غرض کے لئے قربانیوں کی طرف بلانا وغیرہ وغیرہ۔

ان سب امور پر آپ نے سیر حاصل بحث فرمائی اور نہایت عمدہ اور ٹھوس پروگرام جماعت کے سامنے پیش کیا۔ ۲۸ر دسمبر کی دوسری تقریر خالصتہً دعوت الی اللہ پر مبنی تھی۔ یہ نہایت گہری علمی تقریر جس میں جگہ جگہ جماعت کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے خدائے واحد و یگانہ کی طرف دوڑے چلے آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ دراصل اوّل تا آخر قرآن کریم کی مشہور آیت، آیت الکرسی کی ایک نہایت دلکش تفسیر ہے جس میں خدا تعالیٰ کی مختلف صفات کا نہایت ہی دل آویز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس تقریر کا صرف ایک اقتباس نمونۃً پیش ہے تاکہ آپ کے طرزِ بیان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

"اب میں بتاتا ہوں کہ وہ کیا شے ہے جس کی طرف میں آپ لوگوں کو بلاتا ہوں اور وہ کونسا نکتہ ہے جس کی طرف آپ کو متوجہ کرتا ہوں سنو! وہ ایک لفظ ہے زیادہ نہیں صرف ایک ہی لفظ ہے اور وہ اللہ ہے اسی کی طرف میں تم سب کو بلاتا ہوں اور اپنے نفس کو بھی اسی کی طرف بلاتا ہوں اسی کے لئے میری پکار ہے۔ اور اسی کی طرف جانے کے لئے میں بگل بجاتا ہوں۔ پس جس کو خدا تعالیٰ

توفیق دے آئے اور جس کو خدا تعالےٰ ہدایت دے وہ اسے قبول کرے۔

سب سے زیادہ حَسِین

دُنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جو بڑی حَسِین اور بڑی خوبصُورت ہیں لیکن جو کوئی چیز بھی دنیا میں ممکن سے ممکن حَسِین ہوسکتی ہے۔ وہ خدا تعالےٰ ہی کی مخلوق ہے۔ خدا تعالےٰ نے ہی اس کو حُسن اور خوبی دی ہے اس کے حُسن کو کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی۔ مگر باوجود اس کے کہ اللہ تعالےٰ سب سے زیادہ حَسِین ہے۔ سب سے زیادہ پیارا ہے۔ سب سے زیادہ خیر و برکت رکھنے والا ہے۔ مگر دنیا اور نا اہل دنیا اس کو حقارت اور ناقدری کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ ربّ العالمین ہے اور اس کی عظمت اور دبدبہ کے سامنے سب چیزیں ہیچ ہیں مگر اس سے جو سلوک دُنیا کر رہی ہے وہ بہت نفرت اور حقارت کے قابل ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ اپنے ایک اُستاد کا ذکر سُنایا کرتے تھے کہ انہوں نے بھوپال میں خواب میں دیکھا کہ مَیں شہر سے باہر ایک پُل کے پاس کھڑا ہوں۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کوڑھی پڑا ہے جس کے تمام جسم میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں۔ اس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور سخت تکلیف کی حالت میں ہے۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا۔ مَیں اللہ میاں ہوں۔ تمہارا خدا ہوں۔ مَیں نے کہا ہم نے تو قرآن شریف میں اپنے خدا کی بڑی تعریفیں پڑھی ہیں کہ وہ ایسا خوبصُورت ہے کہ اَور کوئی اس کی مانند ہے ہی نہیں۔ یہ آپ کی کیا حالت ہے۔ اس نے آگے سے جواب دیا کہ تم یہ جو شکل میری دیکھ رہے ہو یہ میری اصل شکل نہیں ہے بلکہ بھوپال کے لوگوں کی نظروں میں میری یہ شکل ہے۔ پس تم لوگ بھی اپنے دلوں کو ٹٹولو۔ اپنے اعمال کو اپنی باتوں کو اپنے اقوال کو اپنی حرکات کو۔ اپنی سکنات کو دیکھو کہ دُنیا کی جو چیزیں تمہیں پیاری لگتی

ہیں ان کے مقابلہ میں تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی کیا شکل ہے۔ آیا بھوپال والا خدا تو نہیں ہے یا اس کے قریب قریب ہے مگر خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سب بدصورتیوں ساری بدیوں اور تمام بُرائیوں سے پاک اور منزّہ ہے۔" (صفحات ۱۰۸)

اسی سال آپ کے ہاتھ سے جماعت احمدیّہ کے لئے بہت سی اہم مہمّات سرہوئیں کیا بلحاظ فوری ضرورت کے اور کیا بلحاظ لمبی اور دُور رس منصوبہ بندی کے۔ آپ نے جماعت کے تمام اہم مسائل کی طرف نہایت ہی حکیمانہ توجّہ فرمائی اور غیر معمولی قوّت کے ساتھ جماعت کو خدمتِ دین کی راہ پر گامزن فرمادیا۔ آپ کی مجلس مشاورت کی تقریر جس کا پہلے ذکر گذر چکا ہے اور جلسہ سالانہ کی یہ تقاریر جن کا ابھی ذکر گذرا ہے جماعت کے ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں میں نہایت گہرے رنگ میں اثر انداز ہوئیں اور جماعت نے قرآن کریم میں بیان کردہ عروۃ الوثقیٰ کو نہایت مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ ان تقاریر کے اثر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جماعت کے وہ بزرگان جو اس زمانہ میں نوعمر تھے آج تک ان تقاریر کی انقلابی تاثیرات کو نہیں بھولے۔ چند ماہ قبل مکرم محترم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب ایم۔اے (کینٹب) (جو پاکستان کے علمی حلقوں میں ایک بہت معروف شخصیت ہیں) کی خدمت میں مَیں نے اپنے ایک نمائندہ کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے بارہ میں تاثرات قلمبند کروانے کے لئے بھجوایا تھا تو انہوں نے ازخود ہی ان دونوں مواقع پر کی جانے والی تقریروں کے اثر کا ذکر چھیڑ دیا اور فرمایا۔

"حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی ابتدائی تقاریر جو مجلس شوریٰ اور پہلے سال کے جلسہ سالانہ پر کی گئیں بڑی عظیم الشان اور انقلاب انگیز تھیں۔ میرے بھائی قاضی عبدالحمید صاحب ان دنوں نوجوان طالب علم تھے اور ہم سب میں آزاد خیال سمجھے جاتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی یہ تقریریں سُنیں تو اتنا گہرا اثر قبول کیا کہ گویا ان کے اندر ایک رُوحانی انقلاب پیدا ہوگیا اور وہ ہمیشہ ان کے اثر کا ذکر خود کیا کرتے تھے۔ یہ قاضی عبدالحمید صاحب وہی ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ

نے نیکی اور تقویٰ کو بعد ازاں اس قدر بڑھایا کہ بالآخر انہوں نے عملاً خدمتِ دین کے لئے اپنی زندگی کے بہترین سال وقف کر دیئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو ۱۹۳۰ئ میں "سن رائز" کے لئے ایک انگریزی دان ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ حضرت کی نظرِ انتخاب قاضی صاحب پر پڑی چنانچہ قاضی صاحب موصوف نے آپ کے ایک اشارہ پر وکالت کا کامیاب پیشہ چھوڑ کر بلا چون و چرا اس ذمہ واری کو اٹھا لیا اور بڑی عمدگی سے سالہا سال تک نباہا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی جو عزت اور احترام اُن کے دل میں قائم ہو چکا تھا یہ اسی کا اثر تھا کہ اپنی زندگی کے ہر اہم موڑ پر انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ ہی سے رہنمائی حاصل کی اور انہی کے مشورہ کو رہنما بنایا۔ یہانتک کہ شادی جیسا نجی معاملہ بھی حضور ہی کی مرضی اور اجازت سے طے کیا۔ تقسیمِ ملک کے بعد ذریعۂ معاش کے طور پر جب دوبارہ وکالت کو اختیار کرنے کا ارادہ ہوا تو اس میں بھی حضور ہی سے رہنمائی حاصل کی۔ یہ فیصلہ بھی کہ کہاں وکالت کی جائے آپ ہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ یہ ایک نمونہ اس اثر کا پیش ہے جو حضرت خلیفۃ المسیح کی تقاریر کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔

یہ مثال ایک نوجوان تک ہی محدود نہیں بلاشبہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے نوجوان ہیں جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے خطابات سے اس درجہ متأثر ہوتے تھے کہ اپنی زندگی کی باگ ڈور کامل اطاعت کے ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح کے ہاتھوں میں تھما دیتے تھے۔ ایسے بعض اور نوجوانوں کا ذکر مختلف جگہوں پر موقع و محل کے مطابق آتا رہے گا۔ جلسہ سالانہ کی تقاریر کا عمومی تأثر جو حاضرینِ جلسہ نے قبول کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے اخبار الفضل مورخہ ۳۱؍ دسمبر ۱۹۱۴ئ بعنوان "خلافت ثانیہ کا پہلا جلسہ سالانہ" رقمطراز ہے:۔

"نورالدین اعظم رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہمارا پہلا سالانہ جلسہ اپنے معمول کے مطابق ہوا۔ مگر خدا کے فرشتوں نے اس کو غیر معمولی

طور پر کامیاب بنایا۔ عدُو نے چاہا کہ قادیان کی رونق کو کم کرے اور خلافتِ محمُود کی عظمت کو نقصان پہنچائے۔ لیکن خدا نے چاہا کہ اس کے منصُوبوں کو پیوندِ خاک کرے اور خلیفہؑ اوّل رضی اللہ عنہ کے الفاظ "خلیفہ خدا بناتا ہے" اپنے جلال کے ساتھ پورے ہوں چنانچہ زمینی اسباب پر بھروسہ رکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ ان کی مخالفانہ کوششیں کچھ کام نہ آئیں اور باوجود ایامِ جلسہ کی زیادتی اور قادیان کے سفر کی صعوبت کے رُوئے احمد پہ قربان ہونے والے زائرین پروانہ وار دیارِ حبیب میں پہنچے ....

غرض خدا تعالےٰ نے اپنے ہاتھ سے سب کام کرکے دکھا دیا اور بتا دیا کہ خلیفہ ہم بنایا کرتے ہیں۔ اس سال کا جلسہ سالانہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے قابلِ مُبارک اور اپنی شان کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ رہا ہے........سب سے بڑی خصوصیّت اب کی مرتبہ یہ تھی کہ قادیان میں آنے والے وہ مخلصین تھے۔ جو دامنِ محمُود سے وابستہ ہو کر یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارا جلسہ محض میل ملاقات نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کے قرب کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور ہم قادیان میں ایک مُزکّی نفس کی پاک صحبت سے مستفیض ہونے اور اُس کی دُعاؤں سے حصّہ لینے کے لئے آتے ہیں۔

جلسہ پر آنے والے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُن لیا کہ انھوں نے جس ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے وہ ایک معمولی انسان کا ہاتھ نہیں بلکہ اُس اولوالعزم انسان کا ہاتھ ہے جو مسیح کے ہاتھوں میں پلا ہُوا اور نورالدّین کے ہاتھوں میں تربیت پایا ہُوا اور خود خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے کھڑا کیا ہُوا ہے۔ اور پھر انھوں نے یہ بھی ملاحظہ کر لیا کہ ان کا خلیفہ اگرچہ کسی قابلیّت اور کسی علم کا مدّعی نہیں تاہم خدا نے اُسے وہ کچھ سکھایا ہے جس کا علم فرشتوں کو بھی نہ تھا اور وہ طرزِ بیان وفہمِ قرآن بخشا ہے جو خاصانِ خدا کا

خاصّہ ہے۔

اس کے کلام میں اثر اس کی تقریر میں لذّت اس کے احکامات میں رعب ہے۔ اگر وہ فرماتا ہے بیٹھ جانا مناسب ہے تو جھٹ کھڑے ہوئے بیٹھ جاتے ہیں...... پھر اگر وہ فرماتا ہے کہ مسجدوں میں باجماعت نماز پڑھنے کی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بہت تاکید فرمائی ہے تو اس کے حکم کی تعمیل میں فوراً تینوں مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ اور مسجد مبارک میں تو یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ کیا چھت اور کیا فرش کیا بازار کیا دکانیں اور کیا قرب وجوار کے مکانات سب کے سب دُور دُور تک خدا کے مقرر کردہ امام وخلیفہ کے مقتدیوں سے بھر جاتے ہیں۔ کاش قادیان کے ساتھ محبت کرنے والے لوگ اس منظر کو دیکھتے اور صفائی قلب سے خدا تعالےٰ کے فعل اور اس کی پیدا کردہ کشش قلوب پر غور کرتے اور فضلِ عمر کے ساتھ آنے والے فضل سے حصّہ لیتے۔ مگر ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ "
(الفضل ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء صـ۲)

۱۹۱۵ء کا سال بھی ۱۹۱۴ء کی طرح ایک حد تک اندرونی فتنوں کے استیصال میں صرف ہوا۔ اس دَور کی تقاریر اور کتب کا موضوع زیادہ تر اختلافی مسائل تھے یا وہ ذاتی اعتراضات تھے جو غیر مبایعین کی طرف سے بڑی شدّت اور بے رحمی کے ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ پر کئے جاتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا رسالہ آپ نے ۱۲ر جنوری ۱۹۱۵ء کو تحریر فرمایا جو "القول الفصل" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ رسالہ جو اٹھتر (۷۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ نے ایک ہی دن میں لکھوا کر اور نظرِ ثانی کر کے طباعت کے لئے دے دیا۔ اس سے آپ کی بے پناہ قوّتِ تصنیف کا اندازہ ہو سکتا ہے اس رسالہ کی تصنیف کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ خواجہ کمال الدین صاحب جب ولایت سے واپس تشریف لائے تو اپنی قابلیّت اور فصاحت و بلاغت کے زعم میں ان کو یہ خیال گذرا کہ مرزا محمود احمد کی مخالفت میں ابھی کچھ کمی رہ گئی ہے اور جماعت کے سنجیدہ طبقہ کو معقولی دلائل کے ساتھ جو اپیل ہونی چاہیئے تھی اس میں کوتاہی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں اہلِ پیغام کی قیادت کے

بعض بنیادی فیصلوں سے بھی ان کو اختلاف تھا۔ مثلاً ان کا قادیان چھوڑ کر لاہور چلے آنا وغیرہ۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ایک بسیط اور بظاہر بہت مدلل لیکچر "اندرونی اختلافاتِ سلسلہ کے اسباب" کے موضوع پر دیا جسے بعد میں کتابی صورت میں شائع کرکے مبائعین میں بکثرت مفت تقسیم کیا گیا۔

جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تک اس کا ایک نسخہ پہنچا تو اس مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر اور اس خیال سے کہ اگر مؤثر رنگ میں اس کا فوری ردّ نہ کیا گیا تو احبابِ جماعت میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ نیز اس لئے بھی کہ اس مضمون میں متعدّد مرتبہ آپ کا نام لے کر مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس بات کا جواب مرزا محمود احمد صاحب خود دیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے خود ہی اس موضوع پر قلم اٹھانا مناسب سمجھا۔ اور بلا تاخیر ایک ہی دن میں اس کام کو مکمل کرکے جوابی مضمون شائع فرما دیا۔

اس رسالہ کی اشاعت پر آپ کے کردار کے دو پہلو نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ اوّل آپ کی بے پناہ تصنیفی صلاحیت۔ دوم۔ اہم کاموں کو غیر معمولی تیزی اور انہماک کے ساتھ سرانجام دینا۔ یہ دونوں پہلو آپ کی وفات تک اسی طرح قائم و دائم رہے اور عمر اور حوادثِ زمانہ ان پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ آپ کی تصنیفی صلاحیت کا دوسرا اظہار تین ہی ماہ کے بعد ایک اور کتاب "حقیقۃ النبوۃ" کی صورت میں ہوا۔ یہ کتاب مولانا محمد علی صاحب امیر جماعت اہلِ پیغام کے ایک رسالے کے جواب میں ہے جس کا نام "القول الفصل کی ایک غلط فہمی کا اظہار" ہے۔ یہ جواب تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۴ر فروری کو آپ نے اس ٹھوس علمی تصنیف کا آغاز فرمایا اور ۲۰ دن کے اندر اندر مارچ ۱۹۱۵ء میں طبع کروا کر شائع کر دی۔[1]

---

[1] یہاں حضرت مولنا غلام رسول صاحب راجیکی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ایک روایت درج کی جاتی ہے۔ جو اسی تصنیفِ منیف سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"۱۹۱۵ء میں خاکسار لاہور سے مرکزِ مقدس میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مَیں اپنے ساتھ مولوی محمد علی صاحب امیر غیر مبائعین کا ایک ٹریکٹ بھی لیتا آیا جو ان دنوں تازہ شائع ہوا تھا اور حضور ایدہ اللہ تعالےٰ کی خدمت میں پیش کر دیا حضور نے ارشاد فرمایا کہ اب اس ٹریکٹ کا جواب بھی طبع ہونے پر لے جائیں اور مولوی محمد علی صاحب کو پہنچا دیں۔" (حیاتِ قدسی حصّہ پنجم صفحہ ۴۵)

اس کتاب میں مسئلہ نبوّت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور شرح و بسط کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی نبوّت ایک ظلّی اور تابع نبوّت ہے اور کسی پہلو سے بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں کمی کرنے والی نہیں ہے بلکہ آپ کی شان کو دوبالا کرنے کا موجب ہے۔ آپ نے خاتم النبیّن کی نہایت عمدہ اور لطیف حقیقت بیان فرمائی اور فرمایا کہ آیت خاتم النبیّن کے وہ معانی جو غیر مبائعین کی جماعت کرتی ہے نہ صرف یہ کہ عقل اور محاورۂ عرب کے مطابق نہیں ہیں بلکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی کسرِ شان کا موجب بنتے ہیں۔ اس کے برعکس جماعت احمدیّہ قادیان کے پیش کردہ معانی سے حضور کی ارفع شان اور بے نظیر مراتب کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتاب جو ٹھوس عقلی اور نقلی دلائل پر مشتمل ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر آنے پر ایک نیا ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے اور آپ کی طرزِ نگارش عاشقانہ جذبات میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ کتاب میں ایسا ربط و ضبط اور تسلسل ہے کہ سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی اقتباس پیش کرنا مشکل ہے۔ یہ کتاب تمام تر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب کے فوائد اور اثرات کا ذکر کرتے ہوئے الفضل ۲۲ر فروری ۱۹۱۷ء رقمطراز ہے:۔

> "اس وقت تک غیر مبائعین کے ایک کثیر حصّہ کے سوا غیر احمدی لوگوں میں سے بہت سے اصحاب نے بھی اس سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ یعنی سلسلہ احمدیّہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس کی تازہ مثال اس خط سے مل سکتی ہے۔ جو چوہدری محمد رمضان صاحب مولوی فاضل پلیڈر نے تحریر فرمایا ہے۔ آپ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھتے ہیں کہ
>
> "خاکسار جناب حضرت مسیح موعود علیہ السّلام مرحوم و مغفور کی ہمیشہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵:۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی اس تصنیف میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"کل شام کو حِبّی فی اللہ مولوی غلام رسول صاحب ساکن راجیکی لاہور سے تشریف لائے اور ایک کاپی اس رسالہ کی اپنے ساتھ لیتے آئے جس سے مجھے اس کا علم ہوا۔ اور آج ۱۴ر فروری کو دوپہر کے وقت یہ رسالہ پڑھنے کے بعد نماز ظہر سے فارغ ہو کر اس کا جواب میں نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔" (حقیقۃ النبوۃ صفحہ ۹ طبع اوّل)

عزت کرتا رہا ہے اور یہ خداوند کریم کا فضل ہے کہ کبھی کوئی کلمہ آپ
کی ذات مبارک کی نسبت بے ادبی یا گستاخی کا سرزد نہیں ہوا۔ اور
نہ ہی کبھی کوئی بدخیال آپ کی نسبت میرے دل میں پیدا ہوا فَالْحَمْدُ
لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔ مگر خاکسار ابھی سلسلہ میں داخل نہیں ہوا تھا اس
کی وجہ صرف یہ تھی کہ نبوت کے مسئلہ کے متعلق مجھے تردد تھا۔ سو خداوند
کریم کا نہایت شکر ہے کہ آپ کی کتاب حقیقۃ النبوۃ کو میں نے غور
سے مطالعہ کیا ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے کیونکہ جس نبوت کے
حضرت مسیح موعود علیہ السلام مصداق ہیں وہ ہرگز خاتم النبیین کے
منافی نہیں ہے اور ایسی نبوت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان کو
زیادہ کرتی ہے نہ کہ کم۔ اور میں جناب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جناب
کی اس کتاب نے مجھے ہدایت کی ہے۔ خداوند کریم حضور کے درجات
بلند کرے اور اجرِ عظیم عطا فرمائے۔" (صہ)

اس دور کی ایک اہم تصنیف "سیرت حضرت مسیح موعود علیہ السلام" ہے جو سیرت پر سادہ اور سلیس اردو میں ایک نہایت دلکش مضمون ہے۔

۱۲ر جون ۱۹۱۷ء کو آپ نے "زندہ خدا کے زبردست نشان" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا جس میں انقلابِ روس کو صداقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے طور پر پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ کس طرح ۱۹۰۵ء میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے زارِ روس کی حالتِ زار کی خبر دی تھی کہ ؎ "زار بھی ہوگا تو ہوگا اُس گھڑی باحالِ زار" (دُرِّثمین)

جبکہ کوئی زارِ روس کی حالتِ زار کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن پیشگوئی کے پورے بارہ سال کے بعد بعینہٖ اسی طرح جس طرح بتایا گیا تھا۔ زار انتہائی ذلّت اور رسوائی کے ساتھ مارا گیا اور اس کی حالتِ زار حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت پر ایک عالمگیر شہرت رکھنے والا نشان بن گئی۔

اس دور کی بعض دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) چند غلط فہمیوں کا ازالہ (۲) ایک صاحب کے پانچ سوالوں کا جواب۔
(۳) ایک فرمانروائے ریاست کو تبلیغی خط۔ (۴) عظیم الشان بشارت (بزبان سندھی)

ایک نئے اخبار کا اجراء

اسی سال یعنی ۲ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے کہ حضورؓ کے ایماء پر محترم میر قاسم علی صاحب مرحوم نے ایک نیا اخبار "فاروق" جاری کیا (میر صاحب موصوف دہلی سے ہجرت کر کے مستقل طور پر قادیان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے) جس نے خلافتِ حقہ کی تائید اور اہلِ پیغام کی تردید میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔

انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ مدیر فاروق جناب میر قاسم علی صاحب مرحوم کو ایک دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے آپ کے گھر پر بے تکلّف ماحول میں ملاقات کا موقع ملا۔ یہ موقع اس لحاظ سے بیش قیمت تھا کہ مدیر موصوف کو حضرت صاحب کی خوابگاہ اور رہن سہن کے طریق کو قریب سے دیکھنے کا موقع میسّر آیا اور انہوں نے اپنے قلم سے اس کی سادہ مگر دلکش اور زندۂ جاوید تصویر فاروق کے اوراق میں ہمارے لئے محفوظ کر دی۔ آپ لکھتے ہیں:-

"مَیں نے دیکھا کہ کوئی تکلّف کا فرنیچر نہیں۔ معمولی فرشی دری بچھی ہوئی تھی اور ایک طرف حضور کے آرام فرمانے کی چارپائی ہے۔ البتہ سب سے بڑی آرائش جو حضور کو پسند ہے یہ تھی کہ دیواروں پر قطعات بلا چوکھٹے و آئینہ آویزاں تھے جن پر نہ کوئی گُل کاری یا بیل بُوٹے بنے ہوئے تھے نہ وہ سُنہری یا رُوپہلی روشنائی سے لکھے ہوئے تھے معمولی سیاہی سے نستعلیق حروف میں سفید کاغذوں پر قلمی لکھ کر لٹکا دیئے ہیں۔ ان کے مضمون کیا ہیں وہ اس مکان کے مکین کے اس تعلق کو زبانِ حال سے ظاہر کرنیوالے ہیں جو اس کو خدائے واحد و لاشریک سے ہے ..... مَیں ذیل میں ہر ایک قطعہ کا مضمون نقل کرتا ہوں:-

(۱) تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ - (الانفال آیت ۶۸)
(ترجمہ:- تم دنیوی اموال کے طالب قرار پاؤ گے حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آخرت کی نعمتیں چاہتا ہے)

(۲) بدیں دارِ فانی دلِ خود مبند   کہ دارد نہاں را حتش صد گزند
(ترجمہ۔ اس فانی گھر میں دل مت لگا کہ اسکی خوشیاں سینکڑوں تکلیفوں سے پُر ہیں۔

(۳) منہ دل در تنعمہائے دنیا گر خدا خواہی
کہ مے خواہد نگارِ من تہی دستانِ عشرت را

(ترجمہ - اگر خدا کو چاہتا ہے تو دنیوی نعمتوں پر فریفتہ نہ ہو میرا محبوب انہیں لوگوں کو پسند کرتا ہے جو عیش و عشرت ترک کر چکے ہیں۔

(۴) پئے دارِ عقبٰے کمر بستہ چست۔

(۵) دیدم از ہجرِ خلق جلوۂ یار۔

(۶) برو فکرِ انجام کن اے غوی۔

(۷) وہ جو معائنہ عذاب سے پہلے اپنا تارک الدنیا ہونا ثابت کر دیں گے۔

(۸) نادان کہتا ہے کہ ہم دُنیا کو چھوڑ دیں۔

واللہ میرا دل پھڑک اٹھا ان تحریروں کو پڑھ کر۔"

(فاروق قادیان - ۱۰ر فروری ۱۹۱۶ء)

احمدیہ ہوسٹل کا قیام

۱۹۱۵ء میں آپ نے لاہور میں احمدیہ ہوسٹل جاری فرمایا - آپ کا یہ اقدام احمدی نوجوانوں کے لئے دُور رس فوائد کا حامل ثابت ہُوا - احمدیہ ہوسٹل کے قیام کی بڑی غرض یہ تھی کہ احمدی نوجوانوں کو مغربی تعلیم کے بد اثرات سے محفوظ رکھا جائے اور ان کی ذہنی نشوونما ایک ایسے ماحول میں ہو جس پر احمدیت کا رنگ غالب ہو۔ یہ مقصد بفضلہٖ تعالےٰ اس ہوسٹل کے قیام سے بدرجہ اتم پُورا ہُوا اور جماعت احمدیہ کے نوجوانوں کو ایک ایسا پاکیزہ ماحول میسّر آ گیا جس میں رہ کر نئی تعلیم کے بد اثرات سے محفوظ رہتے ہوئے وہ مغربی علوم کو اسلام کی تائید میں پیش کرنے کے قابل ہو گئے۔ غرضیکہ جدید علوم کے وہ ہتھیار جو عیسائی دنیا کی طرف سے اسلام کے خلاف استعمال کئے جا رہے تھے احمدی نوجوانوں کے ہاتھوں میں نہایت مؤثر رنگ میں اسلام کی تائید میں استعمال ہونے لگے۔

اس دَور کے احمدی نوجوانوں کی اعلیٰ تربیت کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ امر ثابت ہُوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نوجوان طلباء سے براہِ راست تعلّق رکھتے - ان کی تربیت فرماتے - نئی تعلیم کی طرف سے پیدا ہونے والے اعتراضات کے تسلّی بخش جواب

ان کو سمجھاتے اور وہ طریق سکھاتے جس سے یہی اعتراضات بڑے مؤثر رنگ میں دشمنانِ اسلام کے خلاف استعمال کئے جاسکتے تھے۔ طلباء بے تکلّف حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نئے علوم اور فلسفوں سے پیدا ہونے والی الجھنوں کا ذکر کر کے رہنمائی کے طالب ہوتے۔

حضور جب لاہور تشریف لے جایا کرتے تو اکثر احمدیہ ہوسٹل میں قیام فرماتے۔ جہاں مغرب کی نماز کے بعد کمرۂ نماز ہی میں مجلس علم و عرفان قائم ہوتی۔ ان مجالس میں احمدی طلباء بسا اوقات اپنے غیر از جماعت دوستوں اور اساتذہ کو بھی لے کر آتے جن میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی فراست اور تبحرِ علمی کا پہلے سے ہی شہرہ تھا اور چاہتے تھے کہ کوئی ملاقات کا موقع میسّر آئے۔ ہر مذہب اور ہر مکتبِ فکر کے دانشور طلباء اور اساتذہ ایسے موقعوں پر بڑے دلچسپ سوال کرتے جن کے جوابات سائلین کے علاوہ احمدی نوجوانوں کے لئے علمی تربیت کا نہایت عمدہ ذریعہ ثابت ہوتے۔

اس ہوسٹل کے حسنِ تربیت سے ایسے ایسے سعید و رشید نوجوان تیار ہوئے جنہوں نے توفیقِ الٰہی عمر بھر سلسلہ حقّہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء۔ افسوس ہے کہ یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری نہ رہ سکا اور ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے احمدیہ ہوسٹل میں قیام ترک فرما دیا۔ اس واقعہ میں چونکہ ایک گہرا سبق ہے اس لئے اس کا بیان کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ ایک ایسے طالب علم کے والد نے جو احمدیہ ہوسٹل میں قیام پذیر تھا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھا کہ آپ جب لاہور آتے ہیں احمدیہ ہوسٹل میں قیام فرماتے ہیں اور بعض اوقات یہ قیام بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ احمدی طالب علموں کو آپ سے ایسی محبت ہے کہ وہ اس دوران پڑھائی کو یکسر بھلا کر اپنا سارا وقت آپ کے لئے وقف کر دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں اُن کی پڑھائی میں بہت حرج واقع ہو جاتا ہے۔ حضور کو اس خط سے بہت جذباتی تکلیف پہنچی۔ حضور جانتے تھے کہ لکھنے والے نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ درست نہیں اور احمدی نوجوانوں کی تعلیم پر حضور کے قیام سے کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ تاہم اس بناء پر کہ بہرحال والدین جو تعلیم کی غرض سے اپنے بچوں کو احمدیہ ہوسٹل میں بھجواتے ہیں ان کا حق ہے کہ ایسی وجوہات دُور کرنے کا مطالبہ کریں جن سے ان کی دانست میں بچوں کی پڑھائی میں حرج واقع ہوتا ہو آپ نے احمدیہ ہوسٹل میں قیام فرمانا ترک کر دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کا نتیجہ کسی پہلو

سے بھی اچھا نہ نکلا۔ اس واقعہ کے کئی سال کے بعد ایک خطبہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ خلیفۂ وقت کا احمدی طالب علموں کے پاس ٹھہرنا درحقیقت کسی پہلو سے بھی ان کے لئے نقصان کا موجب نہیں تھا بلکہ ہر پہلو سے برکت ہی کا موجب تھا۔ پس تم اس وقت سے پہلے اور بعد کے طلباء کے نتائج پر نظر ڈال کر دیکھ لو۔ جب تک میں احمدیہ ہوسٹل میں ٹھہرتا رہا۔ بظاہر طلباء کا وقت ضائع ہو جانے کے باوجود وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے طالب علم ثابت ہوئے اور ان کے تعلیمی نتائج نہایت شاندار تھے لیکن اس اعتراض کے بعد جب سے میں نے رہائش ترک کی ہے دینی لحاظ سے جو نقصان پہنچا وہ تو الگ ہے تعلیمی لحاظ سے بھی حالت پہلے سے بہت گر گئی ہے اور نتائج کا معیار قابلِ افسوس ہے۔ یہ واقعہ لکھنے سے مقصد یہ ہے کہ احمدی نوجوانوں کے دلوں میں خلیفۂ وقت کی حقیقی عظمت قائم ہو اور وہ جان لیں کہ خلافتِ احمدیہ اپنے ساتھ بعض ایسی برکات رکھتی ہے جن کو منطقی موشگافیوں کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا اور خلافت پر بعض اوقات ادنیٰ اعتراض بھی بہت سی دینی و دنیوی برکتوں اور سعادتوں سے محرومی کا باعث بن جاتا ہے۔

سفرِ لاہور

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے بعض سفروں کی مختصر روئداد پہلی جلد میں قارئین کی نظروں سے گذر چکی ہے۔ ان سفروں کی روئداد پڑھتے ہوئے انسان خصوصیّت سے یہ بات محسوس کرتا ہے کہ آپ کا کوئی سفر بھی تبلیغی مصروفیات اور دینی مشاغل کے بغیر نہیں تھا تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے کام ہمیشہ ساتھ ساتھ جاری رہتے۔

۱۹۱۵ء میں بھی آپ کو کئی سفر پیش آئے۔ جن میں سفرِ لاہور خاص اہمیّت رکھتا ہے اس سفر میں آپ نے لاہور پہنچتے ہی جماعت کو ایک سہ نکاتی پروگرام دیا جو حسب ذیل تھا۔

اوّل۔ تمام احمدی احباب جو وعظ و تبلیغ کا ملکہ رکھتے ہیں ایک ہی شام مقررہ اوقات میں لاہور کے محلّے محلّے میں دل نشین پیرایہ میں احمدیّت کا پیغام پہنچانا شروع کر دیں۔ اور یہ کام اس زور و شور اور رنگ کے ساتھ ہو کہ شہر لاہور اس کا نوٹس لئے بغیر نہ رہ سکے۔ گلی گلی کوچے کوچے میں احمدیّت کا ذکر چل پڑے اور دلوں میں احمدیّت کے لئے بکثرت جستجو پیدا ہو جائے۔

دوم۔ اہلِ پیغام کو ایک دفعہ پھر عمدہ پیرایہ میں اختلافات چھوڑ کر باہمی اتحاد کی دعوت دی جائے اس کے لئے تجویز ہوئی کہ اہلِ پیغام کی بڑی بڑی شخصیتوں مثلاً مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب اور شیخ رحمت اللہ صاحب وغیرہ کو خصوصی ایلچی بھیج کر بصد احترام و تاکید دعوت پر بُلایا جائے اور حضرت خلیفۃ المسیح ایک مرتبہ خود ان کے سامنے اختلافی مسائل پر گفتگو فرما کر اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کو واپس آنے کی ترغیب دیں۔

سوم۔ ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا جائے جس میں لاہور کے ہر طبقے ہر حلقے اور ہر مذہب وملّت کی نمائندگی ہو اور معززینِ شہر خاص طور پر مدعو ہوں۔ اور اس موقعہ پر حضرت خلیفۃ المسیح خود انہیں اپنی زبانِ مبارک سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پیغام پہنچائیں۔

ان تجاویز نے عملاً لاہور کی آبادی کے ہر طبقہ اور ہر حلقہ پر اثر ڈالا۔ اور جیسا کہ حضور کا ارشاد تھا تمام جماعت لاہور منظم طریق پر تبلیغ میں مصروف ہوگئی اور لاہور شہر میں مذہبی تبادلہ خیالات کی سینکڑوں دلچسپ مجالس قائم ہوئیں۔ دوسری طرف تجویز ۲ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مبارک منزل لاہور میں ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ اور اہلِ پیغام (غیر مبائعین) کے رہنماؤں کو فرداً فرداً دعوت دی گئی کہ وہ ۸ رجولائی بعد نماز مغرب اس دعوتِ طعام میں شریک ہو کر شکریہ کا موقع دیں۔ اس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق بے تکلفانہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ افسوس ہے کہ کسی بھی قابلِ ذکر غیر مبائع رہنما نے اس دعوت کو قبول نہ کیا۔ البتہ ڈاکٹر محمد حسین شاہ صاحب نے جواباً یہ پیشکش کی کہ صرف حضرت صاحب کی تقریر رکھنے کی بجائے دو تقریریں رکھی جائیں تو غور ہو سکتا ہے۔ ایک تقریر آپ کے امام کی ہو اور ایک جوابی تقریر ہمارے امیر مولوی محمد علی صاحب کی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تجویز کو رد کرنے کی بجائے اس کا فوری جواب دیا گیا۔ اور بعض شرائط کے ساتھ اس طریق کو قبول کر لیا گیا۔ نتیجۃً اس مسئلہ پر دو طرفہ خط و کتابت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اس تمام خط و کتابت کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ الفضل ۲۵ رجولائی ۱۹۱۵ء میں درج ہے رفتہ رفتہ تقریروں کی تجویز مناظرہ میں تبدیل ہوگئی اور مناظرہ کی شرائط بھی کم و بیش طے پاگئیں لیکن آخر پر اہلِ پیغام نے یہ عذر پیش کیا کہ جب تک ان کی مجلس عاملہ اس مسئلہ پر کوئی فیصلہ

نہیں کرتی کسی قطعی نتیجہ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے تجویز کی کہ خط وکتابت کی بجائے اس مرحلہ پر معمولی اختلافات گفت وشنید کے ذریعہ مٹانا زیادہ سہل طریق ہے اور کم سے کم وقت میں نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا آپ نے ایک وفد احمدیہ بلڈنگس لاہور اس غرض سے روانہ کیا کہ جلد از جلد سب امور طے کر کے مناظرہ کی تاریخ اور جگہ کا فیصلہ کیا جائے۔ یہ وفد اس روز احمدیہ بلڈنگس میں رات کے بارہ بجے تک مصروفِ گفتگو رہا اور جب تقریباً سب معاملہ طے ہو گیا تو دوسرے روز صبح ڈاکٹر محمد حسین صاحب کی طرف سے از سرِ نو تحریری خط وکتابت کی پیشکش موصول ہوئی۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر قادیان واپس تشریف لے جائیں اور ایک ایسے با اختیار وفد کو پیچھے چھوڑ جائیں جو اہلِ پیغام سے مناظرہ کا معاملہ طے کرلے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وفد کی تمام تر کوشش بالآخر ناکام ہوئی اور اہلِ پیغام نے کسی نہ کسی عذر کے تحت خود اپنی پیش کردہ تجویزِ مناظرہ سے بھی دامن چھڑا لیا۔

جہاں تک تیسری تجویز کا تعلق ہے یعنی جلسۂ عام کا اہتمام اور اس میں تمام اہلِ مذاہب کو شمولیت کی دعوت دینا یہ تجویز خدا کے فضل سے نہایت مؤثر بلکہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوئی۔ اس تقریر کا موضوع حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا پیغام تھا۔ اور تمام اہلِ مذاہب بیک وقت مخاطب تھے۔

آپ کے فنِ خطابت کا یہ کمال تھا کہ بیک وقت مختلف طبقات اور علم کے مختلف درجے رکھنے والے سامعین کو ایسے رنگ میں مخاطب فرماتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک بات کو خوب سمجھتا تھا خواہ وہ عارف ہو یا عامی حتّٰی کہ ایک اَن پڑھ کے لئے بھی آپ کی بات کا سمجھنا آسان ہوتا تھا۔ اور تقریر کے دَوران خواہ کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو ایک ناخواندہ آدمی بھی کبھی یہ محسوس نہ کرتا تھا کہ یہ اس کے فہم و ادراک سے بالا ہے بلکہ مسلسل ہمہ تن گوش رہتا۔ بایں ہمہ ایک عالم بھی ان سادہ اور آسان باتوں کو معمولی نہ جانتا بلکہ ہمیشہ یہ تأثر لے کر اُٹھتا تھا کہ وہ ایک ایسے سمندر میں غوطہ زن ہو کر آیا ہے جو علم و عرفان کے جواہر سے پُر ہے علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو احمدیت کی طرف بُلایا جاتا تھا اور تمام عرصہ ہر فرقے اور ہر مذہب کے پَیرو مسلسل تقریر کا اپنے ہی آپ کو مخاطب سمجھتے تھے اور کبھی یہ احساس پَیدا نہ ہوتا تھا کہ یہ باتیں دُوسروں کے لئے ہیں،

میرے لئے نہیں۔

حضور کی مذکورہ تقریر بھی اس فنِ خطابت کا ایک شاہکار تھی۔ جس طرح کثرت سے ہر طبقے اور ہر مکتبِ خیال کے لوگ اور مختلف مذاہب کے ماننے والے وہاں اکٹھے ہوئے اور جس طرح ہمہ تن گوش رہ کر اس تقریر کو سُنا۔ اخبار الفضل کا نمائندہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"حضور کے تقریر شروع فرمانے کے بعد چند منٹوں میں سامعین پر کچھ ایسا اثر ہؤا کہ ہر وہ شخص جو جلسہ گاہ میں موجود تھا مثل تصویر نقشِ حیرت نظر آتا تھا۔ حضور نے خدا تعالےٰ کے رب العالمین ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے تقریر شروع فرمائی پھر اسلام کے سچے اور اعلیٰ مذہب ہونے کے دلائل بیان فرمائے۔ بعدہٗ دنیا میں انبیاء کے آنے کی ضرورت کو واضح طور پر مختصر مگر نہایت مؤثر و دل نشین الفاظ میں بیان فرمایا۔ اس کے بعد انبیاء جو دنیا کی اصلاح کرتے ہیں اس کی تشریح فرمائی۔ اور حضرت مسیح موعود نبی اللہ کے ان کاموں کو سرانجام دینے کی طرف سامعین کو توجہ دلائی جو انبیاء دُنیا میں آکر کیا کرتے ہیں۔ بالآخر آپ نے حضرت مسیح موعود کے "پیغام صلح" کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔۔۔۔۔۔

تقریر کا مؤثر اور دلکش ہونا اور یہ امر کہ خدا تعالےٰ نے خود لوگوں کے دلوں میں شرکتِ جلسہ کی تحریک فرمائی تھی اس سے ظاہر ہے کہ باوجود اس کے کہ سخت گرمی کا موسم تھا۔ لوگ نہایت تنگی سے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھے ہوئے بلکہ بہت سے کھڑے تھے لیکن پھر بھی جب حضرت خلیفۃ المسیح نے دس بجکر دس منٹ پر اپنی تقریر کو ختم فرمایا اور کرسی پر رونق افروز ہو گئے تو کوئی شخص بھی نہ اپنی جگہ سے ہلا اور نہ کسی قسم کی آواز نکالی۔ تمام کی تمام جلسہ گاہ میں خاموشی اور سکوت کا عالم طاری تھا۔ جب کچھ دیر تک لوگ نہ اُٹھے تو حضرت خلیفۃ المسیح نے حکم فرمایا کہ اذان کہی جائے۔ اور اذان کہی گئی تو

لوگوں کو اختتامِ تقریر کا یقین ہؤا۔ اور وہ بصد حسرت وافسوس اُٹھ اُٹھ کر چلنے لگے ..... چونکہ ہر مذہب وملّت، ہر حیثیّت، ہر مذاق و خیالات کے لوگ موجود تھے اس لئے کچھ محلِ تعجّب نہ ہوتا اگر حاضرین میں سے کوئی شخص کسی بات پر اظہارِ ناپسندیدگی و بےلطفی کرتا۔ لیکن سامعین پر فرداً فرداً نظر کرنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب ہمہ تن گوشِ ہوش بنے ہوئے کامل توجّہ اور دلچسپی سے لیکچر سننے میں محو ہیں اور ختمِ تقریر کے بعد ابھی کچھ اور سُننے کے منتظر تھے۔"

(اخبار الفضل قادیان ۱۵ر جولائی ۱۹۱۵ء نمبر۱ جلد ۳ صفحہ ۳)

لیکن بُرا ہو حسد کا کہ اس تقریر کی کامیابی بعض معاندین کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ اور انہوں نے اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے غلط رپورٹنگ کرتے ہوئے معاندانہ حاشیہ آرائی کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ جماعت احمدیّہ کی طرف سے تو ان امور کا نوٹس نہیں لیا گیا۔ کیونکہ یہ حاسدانہ رویّہ خود تقریر کی عظمت اور کامیابی پر دال تھا۔ لیکن ایک سِکھ جریدہ لائل گزٹ نے اس نامناسب رویّہ کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ معاندانہ رنگ اختیار کرنے میں اہلِ پیغام کے علاوہ آریہ سماجی اخبارات پیش پیش تھے۔ سِکھ معاصر لائل گزٹ اپنی اشاعت ۸ر اگست میں آریہ سماجیوں کے اس غلط اور غیر منصفانہ رویّہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"مرزا بشیر الدّین محمُود احمد خلف الرشید مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے گزشتہ دنوں لاہور میں تشریف لا کر ایک دلچسپ اور مفید لیکچر دیا۔ لیکن سننے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ غریب احمدیوں کو منتظمانِ جلسہ نے فرش سے اُٹھا کر ایک ناہموار سی بے فرش جگہ پر جگہ کی قلّت کے سبب بیٹھنے کی تکلیف دی .... ہم نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ جب تک آریہ سماجی فرقہ موجود ہے یہ بیل منڈھے چڑھنے نہ پائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ اور مرزا صاحب کے اس لیکچر پر ایک آریہ اخبار نے بہت کچھ دروغ بیانی سے کام لے کر ان پر ایسے ناواجب حملے کئے ہیں کہ افسوس آتا ہے۔"

اس سفر کی ایک اَور اہمیّت یہ تھی کہ آپ نے عورتوں کی خصُوصی تربیت کی مہم کا آغاز فرمایا

اور پہلی مرتبہ لاہور میں مستورات کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مختلف اہم موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ مرد اور عورت کے حقوق بیان فرمائے۔ عورتوں کی اسلامی خدمات کا بڑے دل نشین الفاظ میں ذکر فرمایا تاکہ احمدی عورتوں میں جذبۂ خدمت بیدار ہو۔ احمدی عورتوں پر خوب واضح کیا کہ خدمتِ دین کے معاملہ میں وہ مَردوں سے کسی طرح پیچھے رہنے پر مجبور نہیں بلکہ مَردوں کے شانہ بشانہ خدمتِ دین کے ہر کام میں حصّہ لے سکتی ہیں۔ اور اُن کو لینا چاہیئے۔

احمدی مستورات پر اس پہلو سے اُن کی حیثیت اور اہمیت واضح فرمائی کہ لاہور جیسے عظیم ثقافتی اور علمی مرکز میں رہ کر اُن کی جماعتی ذمہ داریاں غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہیں۔ پھر اُن پر یہ بھی واضح فرمایا کہ دین کو مشکل نہیں سمجھنا چاہیئے اور اس خوف سے دینی علم سیکھنے سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ آپ نے آیۂ کریمہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ کی نہایت لطیف تفسیر کرتے ہوئے انہیں نہایت سادہ پَیرایہ میں اس کے مطالب سمجھائے۔ اور عورت کے مقام کی عظمت کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے دین کا علم اس کثرت سے لوگوں کو پہنچا کہ ساری اسلامی دُنیا اُن کی عزّت کرتی ہے اور رہتی دُنیا تک ان کا نام زندہ رہے گا۔ پھر اختلافی مسائل مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی وفات کے مسئلے اور حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی صداقت کے مسائل کو بھی نہایت آسان پَیرایہ میں سمجھا کر اس بات کا عملی ثبوت دیا کہ دین نہ تو تفقّہ کے اعتبار سے مشکل ہے اور نہ نظریات اور عقائد کے اعتبار سے۔ اور کسی بھی علمی معیار کا مرد ہو یا عورت، دونوں دینی مسائل کو آسانی سے ذہن نشین کر سکتے ہیں۔

غرضیکہ یہ اصلاحی تقریر عورتوں میں ایک نیا ولولہ اور شوق اور خدمتِ دین کا عزم پَیدا کرنے کا موجب بنی۔ اس تقریر کے موقع پر کچھ غیر احمدی خواتین بھی موجود تھیں۔ جنہوں نے اسی وقت آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس تقریر کے اثر پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

احمدی خواتین کی تربیت کے سلسلہ میں یہ تقریر محض ایک نقطۂ آغاز تھی۔ بعدازاں طویل عہدِ خلافت میں مستورات کی تربیت کی طرف آپ ہمیشہ خصوصی توجّہ دیتے رہے، اور احمدی خواتین کی دینی حالت سنوارنے کے لئے اور اسلام کی راہ میں ہر قسم کی قربانی پر اُن کو آمادہ کرنے کے لئے آپ ہمیشہ نئی تجاویز اور نئے لائحہ عمل اُن کے سامنے پیش کرتے رہے لیکن ان امور کا تذکرہ آئندہ صفحات میں اپنے وقت پر ہوتا رہے گا۔

سُورۂ قمر آیت ۱۸

اسی سال مستورات کی بہبود کے لئے دوسرا اہم اور مستقل نوعیّت کا اقدام آپ نے یہ کیا کہ جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ کے موقع پر احمدی خواتین کے لئے الگ نشست کا انتظام فرمایا[1]۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک باقاعدہ مستورات کے لئے الگ جلسہ گاہ تیار کی جاتی ہے اور یہ طریقِ کار احمدی مستورات کی تربیت کے لئے بہت ہی دُور رس نتائج پیدا کرنے والا ثابت ہُوا۔ رفتہ رفتہ یہ جلسہ گاہ ایک الگ جلسہ گاہ کی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ بعدازاں حضرت خلیفۃ المسیح اور بعض دوسرے بزرگان کی اہم تقاریر کے علاوہ جو مردانہ جلسہ گاہ کے ساتھ زنانہ جلسہ گاہ میں بھی سُنائی جاتی تھیں مستورات کو اپنا الگ پروگرام مُرتّب کرنے کا بھی موقع ملنے لگا۔ اور احمدی مستورات میں علمی تقاریر کرنے والی خواتین پیدا ہونے لگیں۔

سفرِ شملہ

ماہِ ستمبر ۱۹۱۷ء میں حضور نے بعض مصالح کے پیشِ نظر شملہ کا سفر اختیار فرمایا۔ اس سفر کا مقصد بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

> "پچھلے دنوں میں ترجمے کا کام کرتا رہا ہوں جس سے میرے دماغ پر اتنا بوجھ پڑا کہ ایسی حالت ہوگئی جو مَیں ایک سطر بھی لکھنے سے رہ گیا، اور بخار ہوگیا۔ اس لئے اب میرا ارادہ باہر جانے کا ہے۔ اصل منشاء تو یہی ہے کہ ذرا سا آرام ہو سکے۔ مگر پھر بھی مَیں اپنے فرائض سے اور اس کام سے جو خدا نے میرے سپرد کیا ہے غافل نہیں ہوں۔ بعض رؤیا مَیں نے دیکھی ہیں جن کی بناء پر مَیں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ اور مصالح بھی میرے سفر میں ہیں"
>
> (الفضل قادیان ۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۷ء صٹ)

حضرت صاحب نے یہ سفر اگرچہ خلافت کے ابتدائی ایام میں اختیار کیا مگر اس سفر کی رُوداد کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ آپ کے سفروں کا کم و بیش ایک ہی انداز رہا۔ آغازِ خلافت کے سفر ہوں یا آخری دَور کے سب میں تقریبًا بنیادی نقوش ایک سے نظر آتے ہیں۔ سفر پر

---

[1] الفضل ۲۸ دسمبر ۱۹۱۵ء۔

جانے سے پہلے حضرت رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی پیروی میں آپ ایک امیر مقرر فرمایا کرتے تھے اور ایک امام الصلوٰۃ - امیر کو مقامی امور میں اسی طرح واجب الاطاعت قرار دیتے تھے جس طرح خود آپ کی اطاعت مبائعین پر فرض تھی - بعض اوقات کبھی سفر سے پہلے خطبہ جمعہ میں یا کسی تقریب کے موقعہ پر وقتی تقاضوں کے مطابق نصائح فرمایا کرتے - لمبے سفروں سے پہلے عموماً حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے مزارِ مقدّس پر دُعا کے لئے جاتے - روانگی سے قبل اجتماعی دُعا ہوتی اور کچھ صدقہ بھی دیا جاتا - آئندہ کے سفروں کی روئداد بیان کرتے وقت ہمیں یہ باتیں دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ ہر سفر میں آپ کا یہی معمول رہا -

سفر کے ساتھیوں کا انتخاب بھی دلچسپ مطالعہ کا مواد پیش کرتا ہے - اہلِ خانہ کے علاوہ آپ بسا اوقات بھائیوں، بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں وغیرہ میں سے بعض کو ساتھ لے جاتے تھے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شفقت کا دائرہ محض آپ کے اہل و عیال تک محدُود نہ تھا بلکہ دیگر اقرباء کو بھی آپ اکثر اپنی محبت و شفقت سے نوازتے رہتے تھے - علاوہ ازیں غالباً ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سفر کے موقع پر چونکہ بے تکلّفی کے ماحول میں باہم ملنے کے مواقع زیادہ میسّر آتے ہیں اس لئے دیگر اہلِ خاندان کو بھی آپ کی صحبت اور تربیت کا موقع میسّر آتا رہے - اہلِ قافلہ کے انتخاب کے وقت آپ سلسلہ کے بعض نئے اور پُرانے خدام اور بزرگان کی اولاد کو بھی پیشِ نظر رکھ لیا کرتے تھے اور کبھی اپنے ازواج کے رشتے داروں کو بھی شامل کر لیا کرتے تھے اسی طرح کبھی ایسے بزرگانِ سلسلہ کو بھی ساتھ لے جاتے - جن میں خود سفر کی استطاعت نہ ہوتی لیکن ان کی صحت متقاضی ہوتی کہ انہیں کچھ آرام میسّر آئے اور تبدیلیٔ آب و ہوا ہو جائے -

مندرجہ بالا طریقِ انتخاب بھی ہمیشہ آخر عمر تک تبدیل ہوئے بغیر قائم رہا - زیرِ نظر سفر میں آپ نے اہلِ خانہ کے علاوہ حسب ذیل ساتھیوں کا انتخاب فرمایا -

(۱) حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب (برادرِ خورد)

(۲) صاحبزادہ میاں عبدالسّلام صاحب عمر (برادر نسبتی و خلف الرشید حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ)

(۳) حضرت مولوی عبدالرحیم صاحب نیّر

(۴) حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی (نومسلم)

(۵) مولوی عطا محمد صاحب۔
(۶) نیک محمد خانصاحب غزنوی (مہاجر افغانستان)
بعد میں حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کو بھی شملہ بلوا لیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ساتھ جماعت کو جو محبت اور پیار کا تعلق تھا اس کا کسی حد تک اندازہ اس سفر کی روئداد پڑھنے سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ کے سفروں کے بارہ میں لکھنے والے خاص محبت کے جذبات میں ڈوب کر قلم اُٹھاتے تھے۔ سفر کا پہلا اعلان اس شعر سے کیا گیا ؎

شاد باش اے کوہِ شملہ شاد زی
"فضل" سویت میہماں آید ہمے

اس کے بعد قادیان سے روانگی کے وقت آپ کی الوداعی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے مکرم قاضی اکمل صاحبؓ نائب مدیر الفضل نے جس انداز میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ جماعت کا آپ سے تعلق صرف انتظامی رنگ میں مطاع اور مطیع کا نہ تھا بلکہ عاشق اور محبوب کا تعلق تھا۔ مکرم قاضی صاحب کا یہ مختصر نوٹ من و عن پیش ہے:۔

"وہ رات جس کی صبح، احبابِ شملہ مجھے معاف فرمائیں گے ہمارے لئے شامِ فراق لانے والی تھی حضور کی ایک تقریرِ دلپذیر کی وجہ سے جو بعد از نماز مغرب فرمائی دارالامان میں رہنے والے احباب کو بالخصوص یاد رہے گی۔ سامانِ کتابت پاس نہیں تھا۔ عزیز عطا کی عطا اور کچھ اپنے جیب و داماں کے پُرزے کام آئے۔ گیارھویں کا چاند ہلکے ابر کی نقاب ڈالے عالمِ بالا کے جھروکے سے زمینِ قدس کے بدر و نجوم ایک ہی بُرج میں بہم دیکھ رہا تھا۔ اس کی چاندنی میں صرف پنسل کی حرکت صفحہ قرطاس پر نظر آسکتی تھی۔ گلچینِ بہار کو دامانِ تنگ کا گلہ ہونے کے علاوہ یہ مشکلات تھیں۔ مگر پھر بھی وہ ایک دستنبو تیار کرسکا جو پیشکشِ محفلِ مودت منزل احباب ذومی الالباب ہے۔" (اکمل)

جس تقریر کا قاضی صاحب نے ذکر فرمایا ہے یہ اہلِ قادیان کے لئے خصوصاً اور جماعت احمدیہ کے لئے عموماً نہایت قیمتی نصائح پر مشتمل تھی اور حضرت صاحب کے کردار

خیالات اور رجحانات کا مطالعہ کرنے میں آج بھی ہماری ممد ہے۔ نظر نہایت باریک اور حکیمانہ تھی۔ اندازِ گفتگو سادہ اور دلنشین۔ نصیحت نہایت دلربا انداز رکھتی تھی۔ ایسی جو دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ دورانِ گفتگو بعض ضمنی اعتراضات کا بھی نہایت عمدہ پیرایہ میں جواب دیتے چلے جاتے تھے۔ یہی انداز آخر تک قائم رہا۔ جماعت کو اس اہم نقطہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہ خدا کا کوئی حکم بھی چھوٹا نہیں ہوتا آپ نے فرمایا:۔

"یہ خوب یاد رکھو کہ اللہ کا کوئی حکم نہ تو بوجھل ہے نہ چھوٹا۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ۔ ذکر کے معنے عمل کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ہم نے قرآن کو عمل کے لئے آسان کر دیا ہے۔ پیارے کی ہر چیز پیاری ہوتی ہے اور بڑے کی ہر چیز بڑی۔

پس خدا کے کسی حکم کو چھوٹا نہ سمجھو البتہ چھوٹا یوں ہو سکتا ہے کہ اس کی سزا کم رکھی ہے۔ ورنہ یوں تو خدا کی ہر ایک نافرمانی بڑی بات ہے۔

مَیں تو کفر کا مسئلہ بھی اسی طرح حل کیا کرتا ہوں کہ نبی کا انکار بذاتہٖ کفر نہیں۔ وہ تو ہمارے جیسا ہی ایک انسان ہوتا ہے۔ بلکہ اس وحی کا انکار کفر ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔"

اطاعتِ امیر

جماعت قادیان کو دوسری جماعتوں کے لئے نمونہ بننے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مَیں یہاں کے لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ خلافت اور امارت میں فرق ہے۔ خلیفہ کے ساتھ مذہبی تعلقات (بیعت) بھی ہوتے ہیں اس لئے خلفاء کی تو مان لیتے ہیں اور اپنے امیروں کی نہیں مانتے یا اس کے لئے شرح صدر نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں تاکید کرتا ہوں اور رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں کہتا ہوں جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔"

آپس کی محبّت

"دُوسرے مَیں یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ آپس میں محبّت بڑھاؤ اور اپنے کو دوسروں کے لئے نمونہ بناؤ جیسے تمہارے درجے بڑے ہیں، ویسے ہی تمہاری ذمہ داریاں بھی بڑی ہیں۔ تمہاری معمولی سی لغزش بھی خطرناک ہے۔ ایک بدشکل کریہہ المنظر کے چہرے پر مکھیاں بیٹھی ہوں تو چنداں بُری معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن ایک حسین کے مُنہ پر ایک بھی مکھی ہو تو بُری معلوم ہوتی ہے۔ پس تمہاری پوزیشن اَور ہے اور باہر والوں کی اَور۔ یہ نہ کہو کہ جھگڑے تو باہر بھی ہوتے ہیں اگرچہ مجھے جھگڑے کہیں بھی پسند نہیں۔ پھر بھی قادیان میں تو اس کے متعلق بڑی احتیاط چاہیئے۔"

حضرت مسیح موعُود علیہ السّلام کا اندازِ تربیت

"حضرت صاحب کی اصلاح کا انداز بڑا لطیف اور عجیب تھا۔ ایک شخص آیا اُس نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی بیان کر دیا کہ ریلوے ٹکٹ میں مَیں اس رعایت کے ساتھ آیا ہوں۔ آپ نے ایک روپیہ اس کی طرف پھینک کر مُسکراتے ہوئے کہا کہ اُمید ہے جاتے ہوئے ایسا کرنے کی آپ کو ضرورت نہ رہے گی۔"

خلیفۂ وقت پر کئے جانے والے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے کہ حضرت عمرؓ تو راتوں کو پھر پھر کر خبر گیری کیا کرتے تھے جماعت کو زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کی طرف توجّہ دلائی اور فرمایا:۔

خلیفۂ وقت پر اعتراض

"حضرت عمرؓ کتابیں نہیں لکھا کرتے تھے اور نہ ان کے نام باہر سے اتنے لمبے سو سوا سو خطوط روزانہ آیا کرتے تھے جن کے جواب بھی اُن

کو لکھنے یا لکھانے پڑتے ہوں۔"
پھر فی زمانہ خلیفۂ وقت کے مشاغل پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

خلیفۂ وقت کے مشاغل

"اس کے علاوہ میرے ذہن میں جماعت کی ترقی کی سکیمیں ہیں۔ از انجملہ ایک یہ کہ وہ کیا تدابیر ہیں جن پر چلنے سے جماعت میں آئندہ خلافت کے متعلق کوئی فتنہ نہ ہو۔ (ب) عورتوں کی تعلیم کے متعلق نصاب (ج) سیاسی امور سے ہمارے تعلقات کس طرح ہوں۔ ان سب پر کچھ لکھنے والا ہوں اور یہ سب کام میرے ہی ذمہ ہیں جو ئیں کروں گا اور کر رہا ہوں۔ اگر مقامی احباب کی خبر گیری اور شہر میں پھر پھر کر ان کے گھروں میں جا جا کر فرداً فرداً حال پوچھنا مجھی پر ڈالتے ہو اور آپ لوگ خود یہ نہیں کریں گے کہ اپنے اپنے محلہ کی بیواؤں، یتیموں، بیکسوں، ضرورت مندوں کی خبر رکھو تو یہ کام میں بڑی خوشی سے بآسانی کر سکتا ہوں۔ مگر پھر جماعت کی بیرونی ترقی کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ ئیں بتا چکا ہوں کہ اب زمانہ اور طرز پر آگیا ہے۔ اب خلیفہ کے لئے صرف سلسلہ کے مرکز کا مقام ہی نہیں بلکہ باہر کی تمام جماعتوں کی باگ بھی براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھنی پڑتی ہے اور مخالفین سے بھی زیادہ تر خود ہی نپٹنا پڑتا ہے اور یہ کام ہے بھی سارا دماغ کے متعلق۔ ئیں جب باہر نہیں آتا یا کوچہ بکوچہ پھر کر خبر گیری نہیں کرتا تو کئی لوگ سمجھتے ہوں گے کہ مزے سے اندر بیٹھا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ئیں تو سارا دن ترجمہ وغیرہ لکھنے یا جماعت کی ترقی کی تجاویز سوچنے، ڈاک کا جواب دینے دلانے میں خرچ کر کے ان گرمی کے دنوں میں بھی رات کے ایک بجے تک اس کام کے لئے جاگتا رہا ہوں۔

پھر تمہارے لئے دُعائیں کرنا بھی میرا فرض ہے کبھی کبھی مجھے خیال

آیا کرتا ہے کہ مَیں ہفتہ بھر کسی کو اپنے ساتھ رکھوں تا معلوم ہو کہ مَیں فارغ نہیں بیٹھا اور نہ آرام طلب ہوں۔ غرض اب خلیفہ کے کام کی نوعیت بدل گئی ہے اور ان حالات کی موجودگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقلید مجھ پر ضروری نہیں۔"

حقیقتِ حال سے بے خبر اعتراض کرتے ہیں

زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ایک بار پھر ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"پھر کاموں کی نوعیت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جنگ کا تعلق اس زمانہ میں جسمانی حالت سے تھا۔ اس لئے اس کے واسطے جفاکشی محنت اور خشن پوشی کی ضرورت تھی اور چاہیئے تھا کہ غذا بھی سادہ ہو بلکہ اکثر بھوکے رہنے کی عادت ہو۔ مگر تصنیف کا تعلق دماغ سے ہے اس کے لئے نرم لباس۔ نرم غذا چاہیئے اور اپنے آپ کو حتی الوسع تنہائی میں رکھنا۔ کیونکہ تصنیف کا اثر اعصاب پر پڑتا ہے۔ اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے حضرت عیسٰیؑ پر اعتراض کیا کہ وہ روزے کم رکھتا ہے اور "کھاؤ پیو" ہے۔ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ حضرت موسٰیؑ کا زمانہ نہ تھا۔ وہ تو ایک علمی زمانہ تھا۔ ان کو مخالفین کے مقابل پر تقریریں کرنی پڑتی تھیں اور یہود کی کتابوں کا مطالعہ۔ موقع موقع کی بات ہوتی ہے۔"

چونکہ آپ کو اس بات کی سخت فکر دامنگیر رہتی تھی کہ آپس کے جھگڑوں کی بناء پر احباب جماعت کی مثالی محبت میں رخنہ نہ پڑ جائے۔ اس لئے آخر پر مکرر جماعت کو باہم محبت اور پیار سے رہنے کی نصیحت حسب ذیل پُر اثر الفاظ میں فرمائی :۔

"دیکھو ایک وقت حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ میں جھگڑا ہو گیا۔ بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ باتیں کرتے کرتے ہاتھ کو بھی حرکت دے لیتے ہیں اس طرح نادانستہ طور پر حضرت ابوبکرؓ کا تہبند پھٹ گیا بایں ہمہ حضرت ابوبکرؓ نے باوجود بزرگ ہونے کے حضرت عمرؓ سے معافی

چاہی وہ اس وقت جوش میں تھے۔ لہذا ابوبکرؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوئے اور آکر یہ شکایت نہیں کی کہ عمرؓ نے مجھ سے لڑائی کی یا مجھے دُکھ دیا۔ بلکہ یہ کہ عمر مجھے معاف نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ بھی آگئے اور معذرت کی۔ دیکھو یہ تھے خیرالقرون کے مسلمان۔ تمھیں بھی ایسا ہی بننا چاہیئے کہ اگر کبھی تبقاضائے بشریت جھگڑا ہو جائے تو فورًا صلح کرلو اور دل میں کینہ نہ بٹھا چھوڑو۔"
(الفضل ۸ستمبر ۱۹۱۷ء صفحہ ۵ تا ۸)

بیماری کے باوجود اس سفر کے دوران آپ کو اہم جماعتی امور کی طرف توجہ دینے کا وقت بھی میسّر آتا رہا۔ جماعت کے کاموں کی جو لگن آپ کے دل میں تھی۔ وہ دست با کار اور دل با یار کا منظر پیش کرتی ہے۔ صحت کی بحالی کے لئے تشریف لے جاتے ہیں لیکن جماعتی غم اور فکر مسلسل جان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے شملہ سے احبابِ جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے بذریعہ اشتہار ایک اہم پیغام دیا جس کا مندرجہ ذیل اقتباس میرے مافی الضمیر کو مزید واضح کرنے میں ممد ثابت ہوگا۔

"میں نے احباب سے جلسہ سالانہ کے موقع پر کہا تھا کہ ان انجمنوں کی مالی حالت کی کمزوری میری صحت اور میرے کام پر بد اثر ڈالتی ہے کیونکہ جس شخص کے کانوں میں ہر وقت یہ آواز آوے کہ اس سلسلہ کے کاموں کے چلانے کے لئے جس کا امر خدا تعالےٰ نے اس کے سپرد کیا ہے روپیہ کی سخت تنگی ہے اور ہر ایک کام سخت خطرہ کی حالت میں ہے وہ کب تندرست رہ سکتا ہے اور کب وہ ان زیادہ ضروری کاموں کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے جو جماعت کی حقیقی ترقی سے متعلق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلفاء پر صرف مالی انتظام کا ہی بوجھ نہیں۔ اور امور بھی ان کی طبیعت پر بوجھ ڈالنے کا باعث ہوتے ہیں مگر اس وقت جبکہ روپیہ پر بہت سے کاموں کا دارومدار ہے جماعت کی رُوحانی ترقی کے خیال کے بعد یہ بوجھ بھی ایک بہت بڑا بوجھ ہے۔ پس مَیں اس اشتہار کے

ذریعہ سے اپنی جماعت کے احباب کو پھر اس طرف متوجّہ کرتا ہوں
کہ وہ انجمن ترقیٔ اسلام کی مالی حالت کی درستی کی بھی فکر کریں۔
مَیں ان دنوں بیمار ہوں اور مجھے فکر ہے کہ مَیں اپنی زندگی میں جماعت
کی ہر قسم کی حالت کو درست دیکھ لوں۔شملہ آنے سے میری صحت میں
ترقی معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی طبیعت ابھی بہت کمزور ہے۔
چنانچہ تین چار دن سے پھر تپ کا دَورہ ہے اور اس وقت بھی کہ
مَیں یہ مضمون لکھ رہا ہوں مَیں تپ محسُوس کرتا ہوں۔پس مجھے جلدی
ہے کہ کسی طرح احمدی جماعت کے تمام کام میری زندگی میں تکمیل
کے درجہ پر پہنچ جائیں اور اس کی طرف مَیں آپ لوگوں کو خاص
طور پر متوجّہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے کہ اُس نے مجھے
ایک ایسی جماعت کا انتظام سپُرد کیا ہے جس کی نسبت اگر مَیں یہ
کہوں کہ وہ میری آواز پر کان نہیں رکھتی تو یہ ایک سخت ناشکری
ہوگی۔میری بات کی طرف توجّہ کرنا تو ایک چھوٹی سی بات ہے
مَیں دیکھتا ہوں کہ بہت ہیں جو میرے اشارے پر اپنی جان اور
اپنا مال اور اپنی ہر عزیز چیز کو قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔اور اس اخلاص بھری جماعت کو
مخاطب کرتے وقت میرا دل اس یقین سے پُر ہے کہ وہ فوراً اس
نقص کو رفع کرنے کی کوشش کرے گی۔جس کی طرف مَیں نے ان
کو متوجّہ کیا ہے۔" (اخبار الفضل وضمیمہ) ۲۲ر ستمبر ۱۹۱۷ء صہ ۱۶)

شملہ کے قیام کے دَوران حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے خطباتِ جمعہ
اور عید کے علاوہ تین اہم لیکچر دیئے اور متعدّد غیر از جماعت دوستوں اور احبابِ جماعت
سے ملاقاتیں کیں۔حضور کے شملہ پہنچنے کے بعد اَور بھی بہت سے احمدی خاندان وہاں پہنچ
گئے اور شملہ میں خوب رونق ہوگئی۔حضرت صاحب کا پہلا خطاب جماعت احمدیّہ شملہ
کے ایڈریس کے جواب میں تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی طبیعت بہت ناساز تھی۔
لیکن جماعت کی دل شکنی کے احتمال سے آپ نے یہ دعوت قبول فرمالی۔اس موقع پر آپ نے

حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا ایک واقعہ بیان فرمایا جسے من وعن اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ احبابِ جماعت کو اندازہ ہو سکے کہ اللہ تعالےٰ کے برگزیدہ بندے کس طرح اپنے اُوپر غیر معمولی مشقّت عاید کرکے بھی دوستوں کی دلداری کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی تن آسان معترضین کی زبانیں ہیں کہ طعن و تشنیع سے باز نہیں آتیں اور راحت کا سامان کرنے والوں کے لئے دکھ کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

"مَیں اگرچہ بیمار ہوں اور گلے میں درد ہے۔ اور میرا ارادہ آج تقریر کرنے کا نہ تھا لیکن بعض وقت انسان کو اپنے ارادے کے خلاف مجبُوراً کرنا ہی پڑتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ایک موقع پر جلسہ کے دنوں میں بوجہ بیماری باہر تشریف نہ لا سکے لوگ حضرت صاحب کو دیکھنے اور آپ کا کلام سُننے کے بہت خواہشمند تھے۔ کچھ لوگوں نے مجھے کہا کہ میاں صاحب جا کر ابّا سے کہو کہ حضور باہر تشریف لاویں۔ مَیں اس وقت چھوٹا تھا۔ مَیں نے جا کر حضرت صاحب سے اسی طرح کہہ دیا۔ اس پر حضرت صاحب خفا ہوئے اور فرمایا کہ میاں کیا تم نہیں جانتے کہ مَیں بیمار ہوں۔ تم نے کیوں خود ہی ان لوگوں کو جواب نہ دے دیا۔ میرے پاس کیوں آئے۔ مَیں واپس آگیا اور آکر ابھی لوگوں سے یہ واقعہ بیان ہی کر رہا تھا کہ کسی نے کہا کہ حضرت صاحب بڑی مسجد کو تشریف لے جا رہے ہیں۔ اور آپ کی وہاں تقریر ہوگی۔ اب مَیں دل میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا کیونکہ مجھے خیال آیا کہ مَیں تو ابھی آپ سے پُوچھ کر آیا تھا اور حضرت صاحب کے کہنے کے مطابق ہی ان لوگوں کو بتا رہا تھا کہ حضرت صاحب بیمار ہیں وہ نہیں آسکتے۔ اب یہ لوگ کہیں گے کہ شاید مَیں نے یہ بات یونہی آکر کہہ دی تھی۔ سو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ باوجود بیماری کے اور باوجود ارادہ نہ ہونے کے بھی انسان کو بولنا ہی پڑتا ہے۔"

(الفضل ۲؍اکتوبر ۱۹۱۷ء صفحہ ۹)

دُوسرا لیکچر اس پبلک جلسہ میں ہُوا جو جماعت احمدیہ شملہ نے اس مبارک موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے منعقد کیا تھا اس جلسہ میں حضرت میر قاسم علی صاحب، حضرت میر محمد اسحٰق صاحب اور حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب کی دلچسپ اور مؤثر تقاریر کے بعد آخری روز ۳۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے "زندہ مذہب" کے عنوان سے ایک نہایت مؤثر اور مفید لیکچر دیا۔ اس لیکچر کے آخر پر آپ نے دُنیا کے تمام مذاہب کے پیرؤوں کو مخاطب کرتے ہُوئے یہ چیلنج دیا کہ مبادا تم لوگ یہ خیال کرو کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تو دُنیا سے گزر گئے۔ اب اسلام کی سچائی کا زندہ ثبوت کہاں سے حاصل کیا جائے۔ مَیں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خود اپنے آپ کو زندہ ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہوں اور یہ چیلنج دیتا ہوں کہ آج بھی اگر کسی مذہب کے پیرو آزمائش کرنا چاہیں تو کچھ مریضوں کا انتخاب کر کے انہیں قرعہ اندازی کے ذریعہ بانٹ لیا جائے۔ مَیں اپنے حصّہ کے مریضوں کے لئے دُعا کروں گا وہ اپنے حصّے کے مریضوں کے لئے دُعا کریں پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کس کے ساتھ ہے۔ اور کس کی دُعا قبول کو نمایاں اور امتیازی شان کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

تیسرا لیکچر ۲ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو مستورات میں ہُوا۔ یہ ایک انتہائی دل نشین اور دلگداز لیکچر ہے۔ اور اس لائق ہے کہ اسے ہر زمانہ میں احمدی مستورات کے سامنے پیش کیا جاتا رہے۔

ان تینوں تقاریر کے مطالعہ سے بشدّت یہ احساس پَیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسے قاری کو جس نے حضور کے آخری زمانہ کی تقاریر سُنی ہوں یہ معلوم نہ ہو کہ مذکورہ بالا تقاریر کس دَور میں کی گئی تھیں تو وہ نفسِ مضمون اندازِ بیان اور کلام کی پختگی کے اعتبار سے ہرگز یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ خلافت کے ابتدائی اَیّام کی تقاریر ہیں جبکہ حضور کی عمر صرف ۲۵-۲۶ برس کی تھی۔ کچھ عرصہ ہُوا ایک دوست نے مجھ سے بعینہٖ اسی تأثر کا اظہار کرتے ہوئے تعجب ظاہر کیا اور ساتھ یہ سوال بھی کیا کہ اگر نوعمری میں بھی آپ کا ذہن اتنا پختہ ہو چکا تھا اور طرزِ کلام ایسی مؤثر ہو گئی تھی تو پھر کیا آپ نے خلافت کے بقیہ پچاس سالوں میں کوئی ترقی نہیں کی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ علمی ترقی اور چیز ہے اور پختگیٔ فکر اَور چیز۔ اگرچہ کم عمری ہی میں آپ کو بالغ نظری میسّر تھی مگر وسعتِ نظر کوئی ایسی جامد حقیقت نہیں کہ کسی ایک

مقام پر جا کر ٹھہر جائے بلکہ ہر بالغ نظر کے فکری آفاق ہمیشہ پھیلتے اور وسیع تر ہوتے رہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالٰے نے خلافت کی ذمہ داری عطا کرنے کے ساتھ ہی آپ کے تمام ذہنی اور قلبی قوٰی کو ایسی پختگی عطا کی جو احمدیت کے امام کے شایانِ شان تھی اور اس زمانہ کے معمّر بزرگ اور بڑے بڑے علماء بھی اس خاص موہبتِ الٰہی کے نتیجہ میں آپ کے علم وفضل کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے لیکن علم وفضل میں ترقی کا سلسلہ اس مقام پر رُک نہیں گیا بلکہ بعد ازاں بھی علم وفضل میں آپ کی ترقی دو طرح سے جاری رہی۔ اوّل تو اس کی وسعتیں بڑھتی چلی گئیں اور روز بروز نئے علوم پر آپ کو دسترس حاصل ہوتی گئی۔ دوسرے نئے نئے قرآنی معارف پر آپ اطلاع پاتے رہے اور قرآنی علوم پر آپ کی فکر ونظر اور گہری ہوتی چلی گئی۔ آپ کے علم وفضل کی مثال گویا ایسے شفاف اور سیراب کرنے والے دریا کی طرح تھی جو اپنے منبع سے دُور ہوتے ہوئے وسعت پذیر ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک بحرِ ذخّار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

۸ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو جب آپ شملہ سے واپس تشریف لائے تو راستے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر دعا کرنے کی خاطر راجپورہ اسٹیشن پر اُتر گئے۔ پھر یہاں سے واپسی پر ستّور اور پٹیالہ کی پُرانی مخلص جماعتوں کی پُر زور خواہش کے پیشِ نظر کچھ عرصہ وہاں رُکے اور صداقتِ اسلام کے موضوع پر ایک مؤثر اور مُدلّل تقریر فرمائی۔ جس کا سامعین خصوصًا غیر مسلموں پر گہرا اثر پڑا۔

بعض غیر مسلم زائرین سے انفرادی مُلاقاتیں

قادیان ہمیشہ مرجع خاص وعام رہا ہے جہاں ہر مذہب وملّت اور ہر مکتبِ خیال کے لوگ کبھی تو تلاشِ حق میں اور کبھی اپنے مذہب اور نظریے کی برتری ثابت کرنے کے شوق میں چلے آتے۔ کبھی احمدیت کے متعلق انوکھی باتیں سُن کر اپنے تجسّس کی پیاس بجھانے کے لئے۔ بسا اوقات ایسے زائرین کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ عام علماء سے نہیں بلکہ خود حضرت خلیفۃ المسیح سے تبادلہ خیالات کریں۔ اگرچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ انتہائی مصروف زندگی گزارتے تھے۔ لیکن سوائے اس کے کہ کوئی شدید مجبوری مانع ہو ایسے زائرین کو کچھ نہ کچھ وقت ضرور دیا کرتے۔

زیرِ نظر دَور میں سے ہم ایسی ہی چند ملاقاتوں کی تفصیل پیش کرتے ہیں جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی طرزِ استدلال، تبحرِ علمی۔ حلم، حوصلہ اور گہری فراست پر روشنی ڈالتی ہیں۔

تین یورپین عیسائی عُلماء کی قادیان میں آمد

اور

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے دلچسپ تبادلہ خیالات

اوائل ۱۹۱۶ء میں لاہور کے تین یورپین عیسائی علماء تحقیق اور احمدیّت کے مطالعہ کی غرض سے قادیان تشریف لائے ان میں ایک مسٹر والٹر ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن لاہور کے سیکرٹری تھے۔ دوسرے مسٹر ہیوم اسی ایسوسی ایشن کے ایجوکیشن سیکرٹری اور تیسرے مسٹر لیوکس ایف سی کالج لاہور کے وائس پرنسپل تھے۔ مسٹر والٹر کا ارادہ قادیان اور تحریکِ احمدیّت پر ایک کتاب لکھنے کا تھا۔ چنانچہ وہ مختلف مقامات کی زیارت کے علاوہ مختلف پُرانے اور نئے احمدیوں سے گفت وشنید اور تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح سے مذہبی امور پر آپ کی ایک طویل گفتگو ہوئی جو الفضل ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء

میں شائع ہوئی اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مدِمقابل ایک عیسائی مستشرق ہے، جسے بائیبل پر بھی گہرا عبور ہے اور اسلامیات پر بھی وہ نظر رکھتا ہے۔ گہری تنقیدی نظر سے وہ تحریکِ احمدیّت کا مطالعہ کر رہا ہے اور ایسے پیچیدہ اور گہرے سوالات کرتا ہے کہ جن کے جوابات دیتے وقت مدِمقابل اُلجھن میں پڑ جائے۔ اور بعض ایسے سوالات کرتا ہے جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ ان کے جوابات دیگر فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں کے سامنے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی پوزیشن کو مشکل میں ڈال دیں گے۔ یہ ایسا سنجیدہ اور اعلیٰ پایہ کا علمی مکالمہ و مخاطبہ ہے کہ اس کا خلاصہ پیش کرنا ہمارے لئے مشکل ہے اور طوالت کے خوف سے مِن وعَن پیش کرنا بھی محال ہے۔ صرف ایک سوال اور اس کا جواب پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے:۔

"مسٹر والٹر:۔ کیا سوائے احمدیوں کے سب لوگ دوزخ میں جائیں گے۔
احمدی تو بہت تھوڑے ہیں"

"حضرت خلیفۃ المسیح:۔ آپ کے نزدیک حضرت مسیح جب آئے تھے تو اس وقت
صرف تیرہ ۱۳ آدمی نجات یافتہ نکلے تھے۔ اگر ان کے وقت سوائے
تیرہ کے اَور کوئی نجات نہیں پا سکتا تو اس وقت کئی لاکھ کے سوا
اگر اَور نجات نہیں پائیں گے تو کیا حرج ہے"

تاریخ احمدیّت میں مسٹر والٹر اور ان کے ساتھیوں کے تأثرات کا دلچسپ ذکر ملتا ہے قادیان میں آمد۔ حضرت خلیفۃ المسیح اور صحابہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام سے ملاقات کا ایسا گہرا اثر ان زائرین کے دل پر پڑا کہ مسٹر والٹر نے بعد میں اپنی ایک کتاب (AHADIYYIA MOVEMENT) میں[1] اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے گہرے تأثرات کا اظہار کیا جو احباب قادیان سے مل کر ان کے دل پر پڑے۔ پھر مدّتوں بعد ایک موقعہ پر سیلون میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر لیوکس نے سامعین کے سامنے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اظہارِ خیال کیا

---

[1] بحوالہ تاریخ احمدیت جلد پنجم صد ۲۰۹

کہ عیسائیت اور اسلام کی جنگ کا فیصلہ دنیا کے کسی بڑے شہر میں نہیں ہوگا۔ نہ لنڈن میں نہ نیویارک میں نہ ہی واشنگٹن میں بلکہ دنیا کی ایک نامعلوم چھوٹی سی بستی میں اسلام اور عیسائیت کی آخری جنگ لڑی جائے گی اور اس بستی کا نام قادیان ہے [۱]

اسی دور میں ایک اور عیسائی محقق کی قادیان میں آمد کا تفصیلی ذکر الفضل ۷، ۲۱ مئی ۱۹۱۶ء میں ملتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے عیسائیت کے بارہ میں نہایت گہرے مطالعہ اور لدنی علم کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان صاحب نے جو نجات دہندہ کی تلاش میں گھومتے ہوئے قادیان پہنچے اور ایسے وقت میں حضرت صاحب سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے کہ حضور ڈاک دیکھنے کے لئے باہر تشریف لائے تھے۔ آتے ہی بڑے دُکھ سے اس امر کا اظہار کیا کہ مَیں نے نجات دہندہ کی تلاش میں دنیا کی خاک چھان ماری ہے مگر ابھی تک سوائے یسوع مسیح کے کوئی نجات دہندہ میرے معیار پر پورا اترتا نظر نہیں آتا۔ اگر آپ اس بارہ میں میری رہنمائی فرماسکیں تو میری خوش بختی ہوگی۔ حضرت صاحب نے اس موضوع پر جو فی البدیہ تقریر فرمائی وہ آج بھی احمدی مبلغین کے لئے اور عیسائیت میں دلچسپی رکھنے والے محققین کے لئے ایک روشنی کا مینار ہے۔ یہ فی البدیہ تقریر جس کو ایک زود نویس نے جو غالباً ڈاک کے نوٹس لینے کے لئے حاضر تھا اسی وقت کم و بیش انہی الفاظ میں نوٹ کر لیا اور جلد ہی اسے الفضل میں شائع کروا دیا۔ الفضل کے تقریباً سات صفحات پر مشتمل ہے اور پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ مقرر نے بہت گہری تحقیق اور غور کے بعد باقاعدہ نوٹس تیار کر کے اور انہیں عمدہ ترتیب دینے کے بعد یہ تقریر فرمائی ہے۔ مربوط جامع و مانع دلائل اور حکمت و فلسفہ سے پُر یہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے [۲]

اس تقریر کا نتیجہ بھی بہت جلد ایک شیریں ثمر کی صورت میں ظاہر ہُوا اور سوال کرنے والا متلاشیٔ حق جو خدا جانے کب سے تلاشِ حق میں سرگرداں تھا۔ اس تقریر کے اثر سے مسلمان ہوگیا اور اسے بالآخر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اکمل وجود میں وہ آخری نجات دہندہ مل گیا جس کی اُسے ایک مدت سے تلاش تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تقریر کا جو گہرا اور دیرپا اثر اس کے دل پر پڑا اس کا اس امر سے بھی اندازہ ہوتا

---

[۱] تفسیر کبیر (سورۃ الفیل) صفحہ ۱۹۲۔ [۲] الفضل ۷، ۲۱ مئی ۱۹۱۶ء۔

ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد اس نے قادیان ہی میں ٹھہر کر اسلامی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور قادیان کے دینی مدرسہ میں داخل ہو کر ایک لمبے عرصہ تک تعلیم پاتا رہا۔

قادیان میں پروفیسر مارگولیتھ کی آمد
اور
حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے دلچسپ گفتگو

مسٹر والٹر اور مسٹر لیوکس کی قادیان میں آمد کا ذکر گزر چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قادیان روز بروز ایک عالمی دلچسپی کا مرکز بنتا چلا جا رہا تھا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس کلام کی صداقت ہر آنے والے سال میں پہلے سے بڑھ کر ظاہر ہوتی جا رہی تھی کہ

میں تھا غریب و بیکس و گمنام و بے ہنر — کوئی نہ جانتا تھا کہ ہے قادیاں کدھر
لوگوں کی اس طرف کو ذرا بھی نظر نہ تھی — میرے وجود کی بھی کسی کو خبر نہ تھی
اب دیکھتے ہو کیسا رجوعِ جہاں ہوا — اک مرجعِ خواص یہی قادیاں ہوا

پس قادیان مرجعِ عوام بھی ہوا اور مرجعِ خواص بھی بنا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک دوسری پیشگوئی کے پورا ہونے کے بھی آثار ظاہر ہونے لگے کہ آپ کا موعود بیٹا "زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا"۔ گو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ ہی سے قادیان کی حیثیت اس لحاظ سے تو خوب متعارف ہو چکی تھی کہ یہ دورِ حاضر کی ایک مذہبی تحریک کا مرکز ہے جو اسلام کے احیائے نو کی دعویدار ہے۔ لیکن جہاں تک حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا تعلق تھا ابھی آپ نے عالمی شہرت نہ پائی تھی۔ ایک نوعمر رہنما جو نہ بڑے مذہبی مدارس کا سند یافتہ ہو نہ دنیوی تعلیم کے زیور سے آراستہ ایسے نوجوان رہنما سے ملاقات کا امکان یقیناً دلوں کو بڑا حوصلہ بخشتا ہوگا اور بعض جوشیلے ملاقاتیوں کے دل میں تو یقیناً یہ امید چٹکیاں لیتی ہوگی کہ کس کس طرح اس "ناتجربہ کار" اور "کم علم" "بچے" کو نیچا دکھائیں گے۔ مگر واقعۃً ایسی ملاقاتوں کا جو نتیجہ نکلتا وہ اس کے برعکس ہوتا جس کا کچھ حال پہلے بیان ہو چکا ہے اور کچھ اب بیان کیا جاتا ہے۔

پروفیسر مارگولیتھ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ وہ شہرۂ آفاق مستشرق

مورخ ہیں۔ جن کے علم کا سکہ ان کے عہدِ زندگی میں ہی سب دنیا کے علمی حلقوں پر بیٹھ چکا تھا اور آج تو وہ تاریخ اسلام پر ایک وقیع سند کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس زمانہ میں قادیان کی شہرت کی پہلی کرنیں یورپ کے علمی حلقوں تک ابھی پہنچنا ہی شروع ہوئی تھیں چنانچہ پروفیسر مارگولیتھ نے جو آکسفورڈ میں تاریخ اسلام کے پروفیسر تھے اور لاہور ایک لیکچر کے سلسلہ میں تشریف لائے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود قادیان جاکر تحریکِ احمدیت کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ شدید مصروفیات اور وقت کی کمی کے باوجود تقریبًا نصف دن قادیان میں گزار کر تاریخی اہمیت کے مقامات کا معائنہ کیا اور مختلف احمدی دوستوں سے تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے آپ کی ملاقات اور گفتگو الفضل نے ہمارے لئے مِن وعَن محفوظ کر دی ہے جس کے مطالعہ سے حضرت خلیفۃ المسیح کی شخصیت کے بعض پہلو نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

اوّل یہ کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا عالم آپ کو قطعًا مرعوب نہ کر سکتا تھا اور آپ کسی ادنیٰ سی نفسیاتی اُلجھن کا شکار بھی نہیں ہوتے تھے جس طرح کامل خود اعتمادی کے ساتھ آپ پروفیسر صاحب موصوف سے مخاطب ہوتے ہیں آپ کی معمولی دنیوی تعلیمی سطح اور پروفیسر صاحب موصوف کی عالمی علمی شُہرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ امر حیران کن ہے۔ اس خود اعتمادی میں خودستائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ نہ ہی یہ کسی کھوکھلی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسی خود اعتمادی ہے جو ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے اور وجہ جواز اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ چنانچہ اس تبادلہ خیالات کو پڑھتے ہوئے قاری جب آگے بڑھتا ہے تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پروفیسر مارگولیتھ صاحب ہر قدم پر رائے بدلنے پر مجبُور ہو رہے ہیں اور اس نوجوان کے متعلق تیزی کے ساتھ اپنے تأثرات میں تبدیلی پیدا کر رہے ہیں اور آپ کی بات کو پہلے سے بڑھ کر وزن دینے کے علاوہ اپنے جوابات اور سوالات میں پہلے سے کہیں زیادہ محتاط ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ابتداء میں آپ نے بظاہر خالصتہً تاریخی دلچسپی کے سوال کچھ اس رنگ میں کئے کہ پروفیسر صاحب موصوف آپ کے سوالات کو ایک عام ناواقف طالب علم کے سوالات پر محمول کرتے ہوں گے۔ چنانچہ ابتداء میں پروفیسر صاحب موصوف کے جواب میں ایسی شفقت کا عنصر دکھائی دیتا ہے جو ایک قابل اور با اخلاق استاد اپنے شاگردوں سے

گفتگو کرتے ہوئے دکھایا کرتا ہے لیکن معًا اس گفتگو کا رُخ بدلتا ہے اور حضرت صاحب اچانک یہ نیا نکتہ گفتگو میں پیش فرماتے ہیں کہ جب تاریخ فی ذاتہٖ کامل طور پر قابلِ اعتماد نہیں اور اس کے چہرے پر جگہ جگہ اشتباہ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں اور بعض حالات کی راہ میں تو جھوٹ کی تاریکیاں بھی حائل ہیں۔ تو کیا کسی تاریخ کی صداقت پرکھنے کا بہترین طریق یہ نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں بھی اس کی صداقت کا کوئی شاہد ملے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس کے جواب میں پُرزور تائید فرمائی کہ ہاں اس سے بہتر ذریعہ کسی تاریخ کی صداقت کا اَور نہیں ہو سکتا۔ تب آپ نے مضمون کو خالصتاً مذہبی رنگ دیتے ہوئے اچانک بحث کا نقشہ بدل دیا اور پروفیسر صاحب کو ایک ایسی گفتگو پر مجبور کر دیا جس کا ابتداء میں وہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر پروفیسر صاحب نہ صرف اَور زیادہ محتاط نظر آتے ہیں بلکہ نہایت فراست اور ذہانت کے ساتھ بظاہر بڑے کاری ہتھیاروں کے ساتھ اس نوجوان پر جوابی حملہ کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں اور غالبًا یہی حضرت صاحب کا منشاء تھا۔ کہ کسی طرح کھُل کر بے تکلفی کے ساتھ وہ اسلام اور احمدیت پر اپنے اعتراضات ظاہر کریں ورنہ مغربی تہذیب کے پابند ان پروفیسر صاحب کے چند رسمی با اخلاق کلمات سے تو کچھ حاصل نہ ہوتا۔

آپ نے فرمایا کیوں نہ تمام مذاہب کو اس کسوٹی پر پرکھا جائے کہ جو جو معجزات اور نشانات اُن کی قدیم تاریخ ہمیں باور کرنے پر مجبور کرتی ہے ان کے متعلق اس زمانہ میں شاہد طلب کئے جاویں یعنی اگر حضرت کرشن سچّے تھے تو اس زمانہ میں بھی اُن کے ماننے والے ویسے ہی معجزات پیش کرکے اپنی تاریخ کو سچّا کرکے دکھائیں۔ اگر مسیحیّت کی تاریخ سچی ہے تو حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کردہ معجزات کا اس زمانہ میں بھی کچھ مشاہدہ کروا دیا جائے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

جب کسی مذہب کی تاریخ پر زمانۂ حال کے شاہد گواہی دینے کو اُٹھ کھڑے ہوں گے تو جس طرح ایک تاریخی شہر کے کھنڈرات کو دیکھ کر کسی کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر سچّے مذہب کی تاریخ کی صداقت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو جائے گی۔ آپ نے انہیں بتایا کہ احمدیّت اس کسوٹی پر اسلام کی نمائندگی کرنے کے لئے تیار ہے اور اسلامی تاریخ کو سچّا ثابت کر دکھانے کے لئے ہر چیلنج کو قبول کرتی ہے

پروفیسر صاحب کے لئے گفتگو کا یہ نیا موڑ بہت اچنبھے کا موجب بنا لیکن وہ دانشور جو اسلامی تاریخ اور اسلامی لٹریچر پر گہری نظر رکھتا تھا اس آسانی سے مات کھانے کے لئے تیار نہ تھا چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا معصومانہ سوال ایسا کیا جو حضرت صاحب کو بہت اُلجھن میں ڈال سکتا تھا۔ آپ نے مہذبانہ رنگ میں استفسار کیا۔

"کیا کتاب دلائل النبوت میں جو معجزے درج ہیں اُن کو آپ مانتے ہیں؟"

کتاب دلائل النبوت ایک ایسی کتاب ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے واجب التسلیم معجزات کے ساتھ ایسے بہت سے قصے بھی درج کر دیئے گئے ہیں جو افسانوی رنگ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اگر اثبات میں سر ہلاتے تو ایسے خیالی معجزوں کے ثبوت پیش کرنے کے بھی وہ پابند ہو جاتے جن کی قرآن و سنّت تصدیق نہیں کرتے۔ اگر انکار فرماتے تو گویا دوسرے لفظوں میں معجزات کے وجود ہی کا سرے سے انکار ہو جاتا۔ چنانچہ آپ نے اس شرط کے ساتھ مذکورہ کتاب کے معجزات کو تسلیم کرنے کا دعویٰ کیا کہ قرآن اور سُنّت ان کی تائید کرتے ہوں۔

ہم پروفیسر صاحب کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ فضول کج بحثیوں میں پڑنے کی بجائے انہوں نے فی الفور اس کسوٹی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے ترکش سے وہ سب سے کاری تیر نکالا۔ جو مستشرق اسلام کے خلاف استعمال کیا کرتے ہیں یعنی معجزہ شق القمر جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے کو پیش کر کے یہ توقع ظاہر کی کہ آج بھی ایسا ہی معجزہ رُونما ہو تو ہم تسلیم کر لیں گے کہ واقعی زمانۂ حال نے زمانۂ ماضی پر شہادت دے دی۔ اس کا جواب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے اپنے الفاظ میں من وعن پیش کیا جاتا ہے:۔

"جس رنگ میں قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے اسی طرح ہو سکتا ہے قرآن کریم نے جو کچھ اس کے متعلق بتایا ہے وہ اس سے بالکل الگ ہے جو عام طور پر مشہور ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ شق القمر ساعت کی علامت ہے۔ اب اس کے وہی معنے کئے جائیں گے جن کے رُو سے ساعت کی علامت ٹھہرے۔ اور وہ یہ ہیں کہ قمر عرب کی مملکت کا نشان تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کشفی رنگ میں دکھایا گیا کہ قمر دو ٹکڑے ہو گیا ہے اور یہ کشف دُوسروں کو بھی

دکھایا گیا۔ اس قسم کا کشف جو دوسروں کو بھی دکھائی دے۔ اس زمانہ میں بھی ہؤا اور ہو سکتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کشف میں دکھایا گیا ہے کہ چاند پھٹ گیا ہے جس سے یہ مراد تھی کہ عرب کی حکومت تباہ ہو جائے گی۔ اس قسم کے کشف کا دروازہ بند نہیں ہؤا اب بھی کھُلا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ قمر سے مراد عرب کی حکومت تھی اس مشہور واقعہ سے ملتا ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر حملہ کیا تو وہاں کے سردار کی لڑکی صفیہ نے رؤیا دیکھا کہ چاند میری گود میں آگیا ہے۔ اس نے جب یہ رؤیا اپنے باپ کو سُنائی تو اس نے اسے تھپڑ مارا کہ کیا تُو عرب کے بادشاہ سے شادی کرنا چاہتی ہے یہ خواب اس کی اس رنگ میں پوری ہوئی کہ جب خیبر فتح ہؤا تو حضرت صفیہ کا نکاح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ہؤا۔ غرض چاند اہلِ عرب کی حکومت کا نشان تھا اور اس کے پھٹنے میں اس وقت کے انتظامِ حکومت کی تباہی کی پیشگوئی تھی۔"

یہ جواب سُنکر پروفیسر صاحب نے اس میں کسی اعتراض کی گنجائش نہ پائی۔ البتہ ایک اور سخت تر حملہ اس سوال کی صورت میں کیا۔ کہ قرآن کے بے مثل ہونے کا جو معجزہ ہے کیا وہ دوبارہ دکھایا جا سکتا ہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ اگر مرزا صاحب کہیں کہ دکھایا جا سکتا ہے۔ تو قرآن کا بے مثل ہونا بظاہر مشکوک ہو جائے گا۔ اور اگر کہیں نہیں دکھایا جا سکتا تو یہ دعویٰ کہ اس زمانہ میں شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں غلط ثابت ہو گا لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا پورا جواب جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان دونوں خطرات سے بچکر حقیقت کو اس رنگ میں واضح کر گیا۔ کہ پروفیسر صاحب موصوف کے لئے مزید جرح کی گنجائش نہ رہی اور اس چیلنج کو جو احمدیت نے پیش کیا تھا قبول کرنے کے امکانات کا جائزہ لینے لگے حضرت صاحب نے فرمایا۔

"اس زمانہ میں کم از کم بیس دفعہ تو دکھایا جا چکا ہے۔ ہمارے امام حضرت مرزا صاحب نے کئی ایک کتابیں عربی زبان میں لکھیں تین

ہزار روپیہ تک انعام رکھا اور تمام دنیا کے لوگوں کو چیلنج دیا کہ اُن کے مقابلہ پر لکھیں لیکن کوئی مقابلہ نہ کرسکا۔ آپ نے نہ کسی عربی مدرسہ میں پڑھا نہ آپ کبھی عرب میں گئے۔ نہ آپ نے کسی مشہور معروف استاد سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن باوجود اس کے آپ نے تمام دنیا کے عربی دانوں کو چیلنج دیا لیکن کسی نے قبول نہ کیا۔ یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر جو یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ آپ جب پڑھے ہوئے نہیں تھے تو پھر قرآن کس طرح بنالیا۔ قرآن کریم کسی انجمن نے مل کر بنایا ہے وہ اعتراض غلط تھا۔ اب بھی ایک شخص نے جو ایک لحاظ سے ناخواندہ تھا۔ اللہ تعالٰے کی خاص نصرت کے ساتھ بے مثل کتاب لکھکر ثابت کردیا کہ جب خدا تعالیٰ رہنما اور استاد ہو تو ایک اُمّی کی زبان پر بے مثل کلام کا جاری ہونا ہرگز ناقابلِ قبول امر نہیں۔

حضرت مرزا صاحب پر کفر کے فتوے دینے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ آپ نے کسی عربی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی۔ آپ کبھی عرب ممالک میں نہیں گئے آپ کی مادری زبان عربی نہ تھی مگر باوجود اس کے آپ نے عربوں اور تمام دنیا کے عربی دانوں کو چیلنج دیا۔ جسے قبول کرنے کی جُرأت کسی کو نہ ہوئی۔ المنار کا ایڈیٹر مقابلہ پر تو کچھ نہ لکھ سکا۔ ہاں یہ لکھ دیا کہ آپ کی کتب میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جب اُسے جواب دیا گیا اور چیلنج کیا گیا تو پھر ایسا نادم اور شرمندہ ہوا کہ کچھ بول نہ سکا اور مقابلہ سے دل چُرا گیا۔"

پروفیسر صاحب نے یہ سُنکر غالبًا یہ سوچتے ہوئے کہ کیوں نہ اس چیلنج کو قبول کرلیا جائے یہ بڑا معقول سوال کیا۔

"اگر کوئی اس چیلنج کو قبول کرے تو فیصلہ کون کرے گا۔"

حضرت صاحب نے جوابًا فرمایا۔

"حضرت مرزا صاحب نے اس کا بھی فیصلہ کر دیا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جو چیلنج منظور کرے وہی جج بھی منفرد کرے بشرطیکہ وہ جج اس کے مریدین وغیرہ میں سے نہ ہوں، البتہ وہ جج فیصلہ کرتے وقت یہ قسم کھائیں کہ اگر ہم جھوٹا فیصلہ کریں تو ایک سال کے اندر اندر ہم پر خدا کا عذاب نازل ہو۔ پھر اگر ایک سال تک ان پر کوئی ایسا عذاب نازل نہ ہو جو خاص شان اور ہیبت رکھتا ہو تو انعام سپرد کر دیا جائے گا۔"

پروفیسر صاحب:- یہ تو بہت وسیع حوصلہ دکھایا گیا ہے۔ آپ سے گفتگو کر کے مجھے بہت فائدہ حاصل ہوا ہے۔ اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

(الفضل ۱۹/۲۲ دسمبر ۱۹۱۶ء)

ایک تیسرا پہلو اسلام کے سپہ سالار کی حیثیت سے آپ کے کردار کی عظمت کا اس گفتگو کے دوران یہ ظاہر ہوا کہ ان مستشرقین کو جو اسلام کو غیر اخلاقی جارحیت اور ضد اور تعصب کے طعنے دیا کرتے تھے خود انہی کے ہتھیاروں سے مجروح کرتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی کہ اسلام سے مقابلہ کرتے وقت جاہلانہ سختی اور درشتی سے کام نہ چلے گا۔ اپنے اندر کچھ حوصلہ پیدا کریں اور اخلاق کی حدود میں رہتے ہوئے حقیقت کی چار دیواری میں محدود ہو کر محققانہ رنگ میں اہلِ اسلام سے گفتگو کریں۔ اس میں دونوں فریق کا فائدہ ہے۔ پروفیسر مارگولیتھ نے آپ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ آپ کا یہ پیغام یورپ کے علمی حلقوں تک پہنچا دینگے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی چند عربی کتب لے کر جو تحفۃً پیش کی گئی تھیں قادیان سے رخصت ہوئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہر پہلو سے ہمہ گیر تھی اور ہر دائرہ فکر و عمل حیرت انگیز وسعت اور لچک رکھتا تھا۔ بعض بڑے بڑے عالم فاضل زائرین سے آپ کی گفتگو کے مناظر گزر چکے ہیں۔ اب ایک ایسے زائر سے تبادلہ خیالات کا منظر بھی پیش کیا جاتا ہے جو علمی لحاظ سے محض واجبی حیثیت رکھتا تھا اور ذہانت کا معیار بھی کوئی خاص بلند نہ تھا۔

ایک صاحبِ علم و فضل انسان کا ایسے شخص سے مباحثہ کرنا جو کم علم ہونے کے علاوہ

کج بحثی کی طرف بھی مائل ہو بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے۔ بڑے با اخلاق علماء کے منہ سے بھی ایسے موقع پر کوئی سخت کلمہ منہ سے نکل ہی جاتا ہے لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حلم اور حوصلہ عطا فرمایا تھا اور کسی متلاشیٔ حق سے گفتگو کے وقت آپ ضبط و تحمل کی باگیں بڑی مضبوطی سے تھامے رہتے خواہ مدِ مقابل کی کج بحثی کیسی ہی بارِ خاطر کیوں نہ ہو۔

یہ صاحب جن کے ساتھ بحث کا ایک منظر الفضل سے اخذ کر کے من و عن پیش کیا جا رہا ہے، ایک دہریہ سکھ تھے جو خدا کی ہستی کا ثبوت ڈھونڈنے نکلے تھے۔

سکھ صاحب نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ "ہم کسی کی عبادت کیوں کریں؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟"

حضرت خلیفۃ المسیح:۔ پیشتر اس کے کہ میں آپ کے سوال کا جواب دوں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آیا کوئی ایسی ہستی ہے بھی جس کی عبادت کی جائے یا نہیں۔ اگر وہ ہستی ثابت ہو گئی تو عبادت کرنے کا سوال خود بخود حل ہو جائے گا........ میں چونکہ مسلمان ہوں، اس لئے میں اسلام کے بیان کردہ دلائل دوں گا اور قرآن شریف سے دوں گا۔ اس کے بعد یہ سوال حل ہو جائے گا کہ عبادت کیوں کی جائے اور اس کی کیا ضرورت ہے؟

سکھ:۔ آپ قرآن شریف سے جو دلائل دیں گے وہ میرے لئے کس طرح قابلِ سند ہو سکتے ہیں جبکہ میں قرآن کو مانتا ہی نہیں۔

حضرت:۔ ہر ایک مدعی اپنے دعویٰ کے متعلق کچھ ایسے دلائل رکھتا ہے جو اس کے نزدیک درست ہوتے ہیں،...... میں نے جو قرآن شریف کو دلائل کے لئے پیش کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مذہب کوئی دعویٰ کرتا ہے اور دلائل نہیں دیتا اور دلائل کے لئے انسانوں کا محتاج ہے وہ سچا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے میری یہ بھی غرض ہے کہ آپ کو قرآن شریف کے دلائل سے خدا تعالیٰ کا ثبوت دیکر جہاں اس کی ہستی بتاؤں وہاں ساتھ ہی یہ بھی ثابت کر دوں، کہ

اسلام سچا مذہب ہے اور اپنی سچائی کے خود دلائل رکھتا ہے نہ کہ اَور وں کا محتاج ہے اس کے لئے سب سے بہتر طریق یہی ہے کہ مَیں آپ کو ان کے ماننے کے لئے اس طرح مجبور نہیں کروں گا کہ چونکہ قرآن شریف کہتا ہے اس لئے ضرور مان ہی لو۔ بلکہ میں ایسی دلیل دوں گا جو آپ کو ماننی پڑے گی اور آپ کا دلی اطمینان کرتا جاؤں گا.......

ہم قرآن شریف کو لیتے اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کی کوئی دلیل دیتا ہے یا نہیں۔ دیکھئے مَیں آپ کے سامنے ایک آدمی بیٹھا ہوں۔ آپ کو کس طرح معلوم ہؤا کہ مَیں آدمی ہوں۔ اسی طرح کہ مَیں آدمیوں کی طرح بولتا دیکھتا ہوں اور وہی صفات مجھ میں پائی جاتی ہیں جو آدمیوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ایک آدمی پردے کے پیچھے بیٹھا ہؤا باتیں کر رہا ہو تو آپ کس طرح اسے پہچانیں گے کہ آدمی ہے ؟ اس کی باتوں کے اثر سے کیونکہ وہ خود تو نظر نہیں آتا تو ایک چیز کے معلوم کرنے کے لئے کئی ایک طریق ہوتے ہیں.....

ایک پھول ہو مَیں کہوں اس میں بڑی اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہے تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ مجھے خوشبو دکھا دو بلکہ یہی کہو گے کہ سُنگھا دو۔ اسی طرح عمدہ آواز ہے۔ اس کی نسبت آپ یہ نہ کہیں گے کہ سُنگھا دو بلکہ یہی کہیں گے کہ سُنا دو۔ اسی طرح ایک چیز کڑوی یا میٹھی ہے، تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ سُنا دو بلکہ یہی کہیں گے کہ چکھا دو۔

پس اس سے معلوم ہؤا کہ مختلف چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے مختلف طریق ہوتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں خدا کو آنکھوں سے دکھا دو تو ہم مانیں گے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جن کو ان حواسِ ظاہری سے معلوم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اَور طرح بھی ماننا پڑتا ہے۔ مثلاً لنڈن ایک شہر ہے جسے آپ نے نہ دیکھا نہ سونگھا نہ چُھؤا اور نہ چکھا بلکہ لوگوں سے سُنکر مانا ہے۔

سِکھ زائر:۔ مَیں نہیں مانتا کہ لنڈن کچھ ہے۔

ہر چند کہ سردار صاحب کا یہ مختصر جواب کج بحثی کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے اور اس جواب کے بعد گفتگو جاری رکھنے کا سوال ہی باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ لیکن حضرت صاحب کے دل میں بنی نوع انسان کی جو بے پناہ ہمدردی تھی اس کا تقاضا تھا کہ سائل کی ضد کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے حق کی روشنی دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ چنانچہ آپ نے بڑے تحمّل سے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

آپ یُوں انکار کر دیں تو اور بات ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا انکار ہو سکے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ لنڈن کا جو طول و عرض یا مکانات کی وضع قطع وغیرہ بتائی جاتی ہے ممکن ہے ایسی نہ ہو لیکن لنڈن کے وجود سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ اس طرح ثابت ہو چکا ہے کہ اس کے متعلق کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا اگر آپ نہیں مانتے تو نہ مانیئے۔ قرآن شریف کی دلیل سُن لیجئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ[1] خدا کوئی ایسی ہستی نہیں جو ان آنکھوں سے نظر آ سکے بلکہ وہ خود انسانوں تک پہنچتا ہے۔ یعنی آثار اور شواہد سے نظر آتا ہے کیونکہ وہ لطیف اور خبیر ہے یہ اس لئے بتایا کہ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمیں خدا دکھاؤ قرآن شریف کہتا ہے کہ جب خدا کی ایسی صفات ہیں تو چاہیئے کہ اس کا ثبوت بھی ان سے ہی ملے نہ کہ کسی مجسم چیز کی طرح لوگوں کے سامنے آجائے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ[2]۔ کوئی انسان زمین و آسمان کی باتوں کے متعلق غیب کا علم نہیں رکھتا۔ مگر اللہ ہی رکھتا ہے۔ انسان کو تو اپنی حالت کا بھی پتہ نہیں ہوتا چہ جائیکہ غیب کے متعلق خبر رکھ سکے۔

سِکھ:۔ چونکہ انسانی طاقت کی اس طرح حد بندی نہیں کی جا سکتی کہ اب اس سے بالاتر نہیں جا سکتی اور محدود ہو گئی ہے۔ اس لئے کوئی بات

[1] سورۃ انعام۔ آیت ۱۰۴۔ [2] سورۃ نمل آیت ۶۶

انسانی طاقت سے باہر بھی نہیں کہہ سکتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے زمانہ میں ہوائیں اُڑنا۔ بیجان چیزوں سے آواز کا نکلنا غیر ممکن تھا۔ لیکن اب ہوائی جہازوں اور فونوگرافوں نے یہ ممکن کر دیا ہے۔

حضرت۔ ہم مانتے ہیں کہ بعض وہ باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوگئیں اور ہو رہی ہیں لیکن اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ جس قدر انسانی کام ہو رہے ہیں وہ اسباب کے ذریعہ ہو رہے ہیں۔ اور کوئی ایسا کام نہیں جو ان کے بغیر انجام پا رہا ہو اس سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ دنیا پر واقع ہونے والی باتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو انسانی طاقت اور قدرت میں ہیں اور دوسری وہ جو اس سے بالاتر ہیں۔ اس لئے ہم بعض باتوں کی نسبت تو کہہ سکتے ہیں کہ انسانی طاقت سے بالاتر نہیں اور ممکن ہے کہ ان میں کوئی اور بات نکل آئے لیکن بعض ایسی ہیں جن کی نسبت یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب ان میں تغیّر نہیں ہو سکتا اور ناممکن ہے کہ ان باتوں میں کچھ کمی ہو سکے۔ مثلاً ثابت ہو گیا ہے کہ پانی مفرد نہیں بلکہ مرکّب ہے۔ اب یہ تو ممکن ہے کہ وہ اجزاء جن سے پانی مرکّب ہے اور اجزاء میں منقسم ثابت ہو جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ پانی مفرد ثابت ہو سکے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ دنیا کی تمام اشیاء ایسی نہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ ممکن ہے ان میں تغیّر ہو جائے۔ پس اگر ایسی باتوں میں جن کے متعلق فتویٰ مل چکا ہو کہ تغیّر نہیں ہو سکتا۔ انسانی طاقتوں سے بالاتر قدرت نمائی کا جلوہ نظر آئے تو مان لینا چاہیئے کہ یہ خدا ہی کا کلام ہے۔

خدا تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ جو لوگ میرے احکام پر چلیں گے مَیں ان میں اپنی قدرت کی جلوہ نمائی کروں گا۔ اُن کو آئندہ کے لئے اخبار دُوں گا۔ ان کی خبریں نجومیوں کی سی نہ ہوں گی بلکہ اپنے اندر ایک شوکت و جلال رکھنے والی ہوں گی میرے ان فرمانبردار

بندوں کے جو مخالف ہوں گے ان کو تباہ و برباد کروں گا اور انہیں کامیاب کروں گا۔ پس اگر کسی انسان کے متعلق یہ باتیں سچی ثابت ہو جائیں تو خدا تعالےٰ کی ہستی کی یہ ایک دلیل سمجھنی چاہیئے۔

سِکھ۔ ایسی باتیں بائی چانس (اتفاقاً) ہو جاتی ہیں۔

سردار صاحب کا یہ جواب سُن کر اگرچہ بے اختیار سر تھام لینے کو جی چاہتا ہے لیکن حضرت صاحب اس جواب کو سُنکر مایوس نہیں ہوئے اور پہلے مضمون کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہوئے ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جن امور کو آپ پیش کریں گے، اُن پر "بائی چانس" کا فتویٰ صادر نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا:۔

جو بات تواتر سے ثابت ہو اسے "بائی چانس" نہیں کہا جا سکتا مثلاً آگ جلاتی ہے اس لئے جہاں بھی اور جب بھی اس میں کوئی ہاتھ ڈالے گا جلائے گی۔ اگر کسی کا ہاتھ جل جائے تو یہ نہیں کہا جائیگا کہ آگ نے بائی چانس جلا دیا ہے۔ اسی طرح خدا تعالےٰ قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان فرماتا ہے۔ کہ مجھ سے تعلق رکھنے والے ہمیشہ ایسے ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے جن پر مَیں اپنی قدرت نمائی کرتا ہوں اس لئے اُسے بائی چانس نہیں کہا جا سکتا۔ . . . . . .

اگر اسلام ایسے انسان پیدا کر دے کہ اُن کا خدا سے تعلق پیدا ہو اور وہ لوگوں کو ایسی باتیں بتائیں جن میں خدائی قدرت اور جبروت پائی جائے تو ماننا پڑے گا کہ کوئی ایسی زبردست ہستی ہے جو علیم ہے کلیم ہے قادر و مقتدر اور متصرف بالارادہ سمیع و بصیر ہے اور جس کا پتہ اسلام کے ذریعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اس زمانہ میں ایک شخص پیدا کیا ہے اُس نے آکر کہا کہ جس طرح قرآن شریف کہتا ہے اسی طرح کا مَیں نے اُسے پایا ہے کوئی کہے یہ انسان یونہی کہتا ہے ثبوت کیا تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے دعویٰ کیا کہ خدا نے مجھے کہا ہے کہ جو تیرا مقابلہ کرے گا وہ ذلیل اور

خوار کیا جائے گا۔ خواہ کوئی کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو پھر قبل از وقت ایسی اخبار اسے دی گئیں جو غیب کی ہیں اور ایسی ہیں جن میں اقتداری شوکت پائی جاتی ہے اور جن کے دیکھنے والے اس وقت ہر مذہب کے لوگ موجود ہیں۔ خواہ وہ ان کی کچھ ہی تاویل کریں۔ لیکن پورا ہونے سے انکار نہیں کر سکتے اور بعض خبریں اب بھی پوری ہو رہی ہیں۔

آپ وہ انسان تو سمجھ گئے ہوں گے جس کے متعلق مَیں نے یہ باتیں بیان کی ہیں وہ حضرت مرزا **غلام احمدؑ** صاحب ہیں۔ اب مَیں ایک واقعہ کو مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں جس میں آپ کی قبولیتِ دعا کا ثبوت ملتا ہے۔

یہاں ایک لڑکا عبد الکریم پڑھا کرتا تھا اس کو ایک ہلکا کتّا کاٹ گیا اسے علاج کے لئے کسولی بھیجا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد اسے ہلکا ہو ہی گیا۔ کسولی سے بذریعہ تار پوچھا گیا تو جواب آیا کہ اب اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ چنانچہ اب تک ایسے مریض کا کوئی علاج نہیں تجویز ہوا لیکن اس کے متعلق حضرت مرزا صاحب نے دُعا کی اور فرمایا کہ میرا دل نہیں چاہتا کہ یہ لڑکا جو اتنی دُور سے علم حاصل کرنے کے لئے آیا ہے اس طرح مرے۔ مَیں اس کی صحت کے لئے دُعا کرتا ہوں آپ کی دُعا قبول ہو گئی اور وہ لڑکا اس وقت تک زندہ ہے۔ اس واقعہ کو اپنی آنکھوں دیکھنے والے اس مجلس میں بیٹھے ہیں۔

سِکھ:۔ یہ تو ایک کہانی ہے دیگر مذاہب والے بھی اپنے بزرگوں کی اس سے بڑھ چڑھ کر کرامات سُنا سکتے ہیں اور مَیں بھی بہت سی اسی طرح کی باتیں بتا سکتا ہوں۔ غالبؔ نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا کہ ؎

"تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟"

لیکن حضرت صاحب کا حوصلہ اس سے وسیع تر تھا۔ آپ نے سردار صاحب پر کہانی اور حقیقت کا فرق ظاہر کرتے ہوئے فرمایا۔

حضرت:۔ یہ کہانی نہیں بلکہ واقعہ ہے جس کے دیکھنے والے یہاں آپ کے سامنے

موجود ہیں اُن سے آپ پوچھ سکتے ہیں۔ پھر کسولی موجود ہے وہاں سے پتہ لگ سکتا ہے پھر وہ لڑکا موجود ہے۔ اس سے دریافت ہو سکتا ہے۔ اچھا آپ بہت سی باتوں کو چھوڑ کر کوئی ایک ہی اس قِسم کی مثال بتائیے جس میں اس طرح کے واقعات پائے جاتے ہوں۔

سِکھ۔ مَیں اس وقت نہیں بتا سکتا۔ آپ تو ان باتوں کو اکثر پیش کرتے رہتے ہیں اس لئے آپ کو یاد ہیں لیکن مجھے چونکہ ان کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے یاد نہیں۔ دریافت کرکے بتاؤنگا۔

حضرت۔ اچھا جب آپ بتائیں گے اُس وقت دیکھا جائے گا لیکن خوب یاد رکھیئے۔ کہیں سے آپ اس کی مثال نہ لا سکیں گے۔ یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔ کہ ہر زمانہ میں ایسے انسان پَیدا کرتا رہتا ہے جن کی دُعائیں حیرت انگیز طور پر پوری ہوتی ہیں۔ اب بھی ہم یہ ثبوت دینے کے لئے تیار ہیں کہ خدا تعالےٰ ایسے رنگ میں ہماری تائید کرتا ہے جو اور کسی مذہب والے کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کا ثبوت ہم اسی طریق سے دے سکتے ہیں جو حضرت مرزا صاحب نے قرار دیا ہے۔ مثلاً کچھ مریض ہوں۔ ان میں سے قرعہ اندازی کے ذریعہ نصف ہم لے لیں اور نصف دہریہ لوگ لیں۔ ہم اپنے حصّے کے مریضوں کا دعا اور دوا سے علاج کریں اور وہ اپنے مریضوں کا ڈاکٹروں سے کرائیں پھر معلوم ہوجائیگا کہ کون سے بیمار زیادہ اچھے ہوتے ہیں آیا وہ جو ہمارے حصّہ میں آئے یا وہ جو اُن کے حصّہ میں آئے یا اسی طرح کا کوئی اَور طریق اختیار کیا جا سکتا ہے یعنی ایک محدود وقت تک ایک معاملہ کے متعلق دُعا کریں اور دہریئے اسباب و تدابیر سے کام لیں اور فیصلہ نتائج پر کیا جائے۔ مثلاً بارش ہے

اس کے لئے چند علاقے یا دیہات اس طرح مقرر کرلئے جائیں کہ ایک ہمارے حصّہ میں آئے۔ تو اس سے اگلا اُن کے حصّہ میں پھر اگلا ہمارے حصّہ میں۔ پھر ایک طرف ہم دعا سے کام لیں اور دوسری طرف وہ مادی اسباب سے کوشش کریں پھر دیکھیں کون سے دیہات میں نمایاں فرق ظاہر ہوتا ہے۔

یہاں آکر سکھ صاحب (بالآخر! .....) دھیمے پڑ گئے۔ (واہ رے زورِ صداقت خوب دکھلایا اثر!) اور کہنے لگے، کہ مجھے کوئی ایسا طریق بتایا جائے کہ جس سے خدا کا یقین ہوجائے۔ اس کے متعلق حضور نے فرمایا۔ علیحدگی میں دُعائیں کرو اور کہو اے خدا مَیں تو تجھے نہیں مانتا کیونکہ مجھے تیرا یقین حاصل نہیں ہے لیکن اور لوگ کہتے ہیں کہ تُو ہے پس اگر تُو ہے تو میری تسلّی کردے اور مجھے اپنی نسبت یقین کرا دے۔

سکھ۔ ایسے فیصلے کے لئے کوئی میعاد مقرر ہونی چاہیئے۔ اچھا اس طرح ہو کہ مَیں کسی سخت سے سخت گستاخی کا جو خدا کے متعلق ہوسکتی ہے مرتکب ہوتا ہوں خدا اس پر مجھے سزا دے کر اپنی ہستی کا ثبوت دے۔

سردار صاحب کے اس سوال کا جو جواب حضرت صاحب نے دیا وہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی حیثیت ایک مناظر کی نہیں بلکہ ایک بہی خواہ اور مصلح کی تھی اور بنی نوع انسان کی سچی ہمدردی آپ کے دل میں تھی۔ آپ نے فرمایا

حضرت۔ جو خدا سخت سے سخت سزا دے سکتا ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعام بھی کرسکتا ہے آپ کیوں اپنے لئے فضل نہیں مانگتے۔ انسان کی دانائی یہی ہے کہ اپنے لئے ہلاکت نہ طلب کرے کیونکہ اگر وہ ہلاک ہوگیا تو پھر مانے گا کون؟ اور اُسے

فائدہ کیا ہُوا۔ پس آپ اپنے لئے فضل ہی مانگیں۔
سِکھ۔ بہر حال جلدی کچھ ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے آپ کچھ دن مقرر کردیں ورنہ مَیں کس طرح سمجھ سکوں گا کہ یہ دُعا کا نتیجہ ہے ممکن ہے کہ کوئی اَور ایسے اسباب پَیدا ہوجائیں یا مَیں کسی وجہ سے بیمار ہی ہوجاؤں۔ تو یہ میرے لئے خدا کی ہستی کا کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔
حضرت۔ آپ کا یہ اعتراض اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے جج بنائیں اور مَیں اس بات کا فیصلہ دُوں۔ چونکہ آپ کے متعلق فلاں واقعہ ظہور پذیر ہوچکا ہے اس لئے آپ خدا تعالےٰ کی ہستی کو ضرور ہی مان لیں۔ لیکن مَیں تو یہ کہہ رہا ہوں آپ یہ دعا کریں کہ اے خدا اگر تُو ہے تو مجھ پر اپنی ہستی کا کوئی ثبوت نازل کر جس سے مجھے یقین ہوجائے کہ فی الواقعہ تُو ہے۔ پس جب آپ کی تسلّی ہوجائے گی خواہ کسی طرح ہو تو یہ سوال خود بخود حل ہوجائے گا۔ مَیں اس کے متعلق کوئی میعاد نہیں مقرر کرسکتا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کسی کا محکوم نہیں بلکہ احکم الحاکمین ہے۔۔۔۔۔۔۔ آپ ایک گھر کے دروازہ پر جاکر آواز دیں کہ مجھے دو منٹ میں آگ دو۔ اور گھر والے دوؔ منٹ میں تو نہیں بلکہ دو گھنٹہ کے بعد آپ کو آگ بھیج دیں۔ تو آپ کو اس آگ کے وجود میں تو شک نہیں ہوسکتا کہ چونکہ اتنی دیر کے بعد ملی ہے اس لئے آگ ہی نہیں ہے اسی طرح جب آپ کی مضطربانہ پکار کے جواب میں خدا نے اپنی ہستی کو آپ پر ظاہر کردیا۔ تو بہر حال آپ کو اسے ماننا پڑے گا۔ اس پر سِکھ صاحب نے دُعا کرنا منظور کیا اور اُن کی درخواست کے مطابق سُورۃ فاتحہ کا ترجمہ ان کو لکھ کر دینے کا حضرت خلیفۃ المسیح نے ارشاد فرمایا اور مجلس برخاست ہوئی۔" (الفضل ۲۴ راگست ۱۹۱۵ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے کردار کے متعلق پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ اس میں غالب عنصر جوشِ تبلیغ تھا جس طرح انگریزی کا محاورہ ہے۔ ALL ROADS LEAD TO ROME کہ سب سڑکیں روم ہی کی طرف جاتی ہیں آپ کے ذہن کی ہر روِش کا بھی آخری رُخ اشاعتِ اسلام ہی کی جانب تھا۔ فکر و نظر کو اُبھارنے کا محرّکِ اوّل خواہ کوئی بھی ہو فکر و نظر کی آخری منزل دینِ اسلام کے عالمگیر غلبہ کا موضوع ہی ہوتا۔ ہر موقع اور ہر تغیّر آپ کی توجہ نئی تبلیغی تجاویز کی طرف مبذول کرا دیتا تھا یہاں تک کہ بیماری میں بھی نئے تبلیغی منصوبے ترتیب و تشکیل پاتے تھے۔

ایک مرتبہ اوائل ۱۹۱۶ء میں آپ کی ران پر ایک تکلیف دِہ پھوڑا نکلا۔ جس کا آپریشن کروانا پڑا۔ چنانچہ اس بیماری میں زیادہ تر آپ کی فکر و نظر کا مرکز نئے تبلیغی منصوبے بننے رہے ان میں سے ایک یہ تجویز تھی کہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی شہر میں ایک ایسا تبلیغی جلسہ کیا جائے جس میں اُردو کے علاوہ عربی اور انگریزی زبان میں بھی تقاریر ہوں۔ آپ کو اس جلسہ کا خیال یُوں پیدا ہؤا کہ اہلِ دہلی خصوصاً دہلی کے مسلمان علماء جماعت احمدیہ کے متعلق یہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے کہ جماعت احمدیہ علومِ عربیہ سے ناواقف ہے اور اُردو زبان پر بھی عبُور نہیں رکھتی پھر یہ دُنیا کے سامنے کیا اسلام پیش کرے گی چنانچہ بیماری کے ایام میں مختلف تجاویز سوچتے ہوئے آپ کو خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب ہمارے پاس ان تینوں زبانوں میں چوٹی کے علماء موجود ہیں تو کیوں نہ اہلِ دہلی پر یہ حقیقت منکشف کر دی جائے کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے فاضل علماء اپنے علم و فضل کے ساتھ بڑے بڑے مدعیانِ علم و فضل کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بیماری کے ایام میں ہی اس تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہوئے دہلی میں ایک نئی طرز کے جلسہ کا اہتمام کیا گیا جو حسب ذیل امتیازی خصوصیات رکھتا تھا:۔

اوّل:۔ مختلف اہم اختلافی مسائل پر عربی، انگریزی اور اُردو میں متعدد تقاریر رکھی گئی تھیں (مسلسل چار روز تک سلسلہ تقاریر جاری رہا)

دوم ۔ تمام اہلِ دہلی خصوصًا علماء کو صلائے عام تھی کہ اس جلسہ میں نہ صرف شرکت فرمائیں بلکہ دل کھول کر جو جی میں آئے سوال کریں ۔ نہایت عمدہ انتظام کے ساتھ گھر گھر اس دعوت کو پہنچانے کا اہتمام کیا گیا تھا ۔

سوم ۔ سوالات کی عام اجازت تو تھی مگر صرف ایک شرط کے ساتھ کہ تقریر جس زبان میں ہو معترض اعتراض بھی اسی زبان میں کرے اور مقرر بھی اسی زبان میں جواب دے ۔

مقررین میں حضرت میر محمد اسحٰق صاحب رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خانصاحب بھی شامل تھے جنہوں نے انگریزی زبان میں خطاب فرمایا ۔ اس نئی طرز کے جلسے نے دہلی کے علمی حلقوں میں ہی نہیں عوام الناس میں بھی ایک کھلبلی مچادی ۔ لیکن افسوس کہ علماء نے اس قدر شور مچایا اور لوگوں کو اس جلسہ سے باز رکھنے کی ایسی نامسعود کوشش کی کہ دہلی کا ایک بڑا طبقہ اس کی برکات سے محروم رہ گیا ۔ تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا یہ مقصد پورا ہو گیا کہ ایک مرتبہ دہلی شہر کو ہلا دیا جائے اور گھر گھر احمدیّت کے چرچے ہونے لگیں ۔

اس شرط نے کہ معترض اسی زبان میں اعتراض کرے جس میں تقریر کی گئی ہو بڑے پُر لطف مناظر پیدا کئے ۔ بڑے بڑے جُبّہ پوش علماء کو جو اعتراضات کی جھولیاں بھر بھر کر لائے ہوئے تھے عربی تقاریر کے بعد نام لے لے کر اُبھارا گیا کہ اس نہایت عمدہ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اہلِ قادیان پر اپنی علمی برتری ثابت فرمائیں ، اور لمبی تقریر نہیں ۔ زبانِ عربی میں صرف چند جملوں ہی کا کوئی اعتراض پیش کردیں مگر افسوس کہ وہ جن کی زبانیں اُردو کے وقت بند نہ ہوتی تھیں عربی اور انگریزی کے وقت کسی طرح کھلنے میں نہ آتی تھیں چنانچہ اس جلسہ کا اہلِ دہلی پر یہ اثر ہوا ، کہ مخالفت کے باوجود جماعت احمدیہ کے علم کی گہری دھاک دلوں پر بیٹھ گئی اور صاحب فراست ذہین اور فہیم خلیفہ کے فکر و تدبر نے جماعت احمدیہ کی برتری اور سربلندی کے نئے سامان پیدا کر دیئے ۔

اس جلسہ میں خود حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ایک مضمون بعنوان " اسلام اور دیگر مذاہب " کا انگریزی میں ترجمہ بھی پڑھ کر سُنایا گیا جس کا سامعین پر گہرا اثر

ہؤا۔ اس مضمون کی تیاری کا واقعہ بھی دلچسپی کا حامل ہے۔ دراصل یہ مضمون انگریزی زبان میں لکھا جانا تھا اور مکرم مولوی محمد دین صاحب بی۔اے ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول (حال صدر۔ صدر انجمن احمدیہ پاکستان۔ ربوہ) کے سپرد تھا۔ مگر مولوی صاحب موصوف اپنی شدید مصروفیات کے باعث اس طرف کما حقہٗ توجہ نہ فرما سکے۔ چنانچہ ادھر ۳ر مارچ کو جلسہ شروع ہونا تھا اُدھر ۲ر مارچ کی صبح کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس مضمون کی تیاری کا خود ہی بیڑا اٹھایا۔ وقت چونکہ تھوڑا تھا۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی کیا جانا تھا۔ اکثر مقررین دہلی جا چکے تھے یا جا رہے تھے اس لئے اس کی تصنیف اس عجیب رنگ میں ہوئی کہ ۲ر مارچ کو ظہر کی نماز تک آپ نے ایک حصّہ لکھ کر امیر قافلہ حضرت مولوی محمد دین صاحب کے سپرد کیا تاکہ دہلی جاتے ہوئے راستہ ہی میں انگریزی ترجمہ مکمل کر لیں۔ پھر رات کے ۲ بجے پیچھے پیچھے منشی فخرالدین صاحب کے ہاتھ دوسرا حصّہ بھجوایا۔ دوسرے روز جمعہ کا دن تھا چنانچہ جمعہ کی نماز سے فارغ ہوتے ہی تیسرا حصّہ شیخ عبدالخالق صاحب ماہرِ عیسائیت کے سپرد کیا جو اسی وقت دہلی کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود ابھی کچھ حصّہ مضمون کا باقی تھا۔ چنانچہ دو گھنٹے کے اندر کچھ اور حصّۂ مضمون لکھ کر شیخ عبدالخالق صاحب کے پیچھے پیچھے ایک سائیکل سوار کو دَوڑایا کہ بٹالہ پہنچ کر گاڑی روانہ ہونے سے قبل بقیہ مضمون شیخ صاحب کے سپرد کر دے لطف کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ کی یہ کڑی بھی آخری نہ تھی۔ چنانچہ دن کا بقیہ حصّہ بھی مضمون نویسی ہی میں صرف ہؤا یہاں تک کہ رات بھیگ گئی لیکن آپ نہ تھکے نہ ماندہ ہوئے اور رات کے تین بجے آخری حصّۂ مضمون شیخ عبدالرحمٰن صاحب قادیانی کے سپرد کیا گیا کہ وہ لے کر جلد از جلد دہلی پہنچیں۔[1]

مندرجہ بالا واقعہ سے آپ کی خداداد اور حیرت انگیز قوّتِ تصنیف اور علوِ ہمّت ظاہر و باہر ہے۔

جماعت احمدیہ کے باہمی معاملات میں قانونِ شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا مطالبہ

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو جماعت احمدیہ میں قانونِ شریعت

[1] الفضل مارچ ۱۹۱۶ء

رائج کرنے کی جو لگن تھی انہی ایّام میں اس کے اظہار کا ایک موقع اس طرح پیش آیا کہ حکومت کی طرف سے مسلمانوں سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ اپنے مقدماتِ وراثت کا فیصلہ رواج کے مطابق چاہتے ہیں یا شریعت کے مطابق۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی تاکیدی ہدایت پر جماعتوں نے حکومت کو میموریل بھیجے کہ ہمارے فیصلے قومی رواج کے مطابق نہیں بلکہ شریعتِ اسلامیہ کے مطابق کئے جائیں۔ البتہ جو مسائل اسلامی فرقوں میں متنازعہ فیہ ہوں، اُن میں احمدی علماء کی رائے معتبر مانی جائے۔

ایک نئے تبلیغی مشن کا قیام

اسی سال آپ کو ماریشس کا نیا مشن قائم کرنے کی توفیق ملی جس کے پہلے مبلّغ حضرت صوفی غلام محمد صاحب بی۔اے مقرر ہوئے جو پہلے مدراس سے ہوتے ہوئے کولمبو پہنچے اور وہاں تین ماہ تک فرائضِ تبلیغ ادا کرنے کے بعد ۱۵ر جون ۱۹۱۵ء کو ماریشس چلے گئے جہاں آپ ایک لمبے عرصہ تک اشاعتِ دین کا کام سرانجام دیتے رہے۔

آپ نے ۱۲ر مارچ ۱۹۱۶ء کو نصائح مبلّغین کے عنوان کے تحت مبلّغینِ سلسلہ کو بیش قیمت نصائح فرمائیں جو گہری حکمت سے پُر ہیں اور آج بھی احمدی مبلّغین کے لئے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ تقریر جو الفضل ۲۹ر اگست ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چند اہم اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

تبلیغ میں تزکیۂ نفس سے غافل نہ ہو

سب سے پہلے مبلّغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ تزکیہ نفس کرے۔ صحابہؓ کی نسبت تاریخوں میں آتا ہے جنگِ یرموک میں دس لاکھ عیسائیوں کے مقابل میں ساٹھ ہزار صحابہؓ تھے۔ قیصر کا داماد اس فوج کا کمانڈر تھا۔ اس نے جاسوس کو بھیجا کہ مسلمانوں کا جا کر حال دریافت کرے۔ جاسوس نے آکر بیان کیا۔ مسلمانوں پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔ ہمارے سپاہی لڑ کر آتے ہیں، اور

کمریں کھول کر ایسے سوتے ہیں کہ انہیں پھر ہوش بھی نہیں رہتی۔ لیکن مسلمان باوجود دن کو لڑنے کے رات کو گھنٹوں کھڑے رہ رہ کر دعائیں مانگتے ہیں، خدا کے حضور گرتے ہیں۔ یہ وہ بات تھی جس سے صحابہؓ نے دین کو قائم کیا باوجود اپنے تھکے ماندے ہونے کے بھی اپنے نفس کا خیال نہیں رکھا . . . .
تبلیغ بہت عمدہ کام ہے۔ مگر تبلیغ کرنے میں بھی انسان کے دل پر زنگ لگتا ہے۔ کبھی اگر تقریر اچھی ہوگئی اپنے مقابل کے مباحث کو ساکت کرادیا تو دل میں غرور آگیا اور کبھی اگر تقریر اچھی نہ ہوئی۔ لوگوں کو پسند نہ آئی تو مایوسی ہوگئی اور کبھی یہ ایک دلیل دیتا ہے۔ دل ملامت کرتا ہے کہ تو دھوکہ دے رہا ہے۔ اس قسم کی کئی باتیں ہیں جو دل پر زنگ لاتی ہیں۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب کسی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے تو آپؐ استغفار پڑھ لیا کرتے تھے حالانکہ آپؐ اعلیٰ درجے کے انسان تھے اور آپؐ کی مجلس میں بھی نیک ذکر ہوتا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ آپؐ ہمارے لئے ایک نمونہ تھے۔ یہ ہمیں سکھایا جاتا تھا کہ ہم ایسا کیا کریں۔ کہ جب کسی مجلس میں بیٹھیں تو استغفار کرتے رہیں اس لئے کہ کسی قِسم کا ہمارے دل پر زنگ نہ بیٹھے۔ اس لئے ذکرِ الٰہی پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ نماز وقت پر ادا کرنی چاہیئے ہاں اگر کوئی ایسا ہی خاص موقع آجائے تو اگر نماز جمع کرنی پڑے تو کرے۔ لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت میں لوگ جھٹ نماز جمع کر لیتے ہیں۔ یہ مرض نماز جمع کرنے کی بہت پھیلی ہے۔ ایسا نہیں چاہیئے . . . . .

روزہ

روزہ بھی بڑی اچھی چیز ہے اور زنگ کے صیقل کرنے کے لئے بہت عمدہ آلہ ہے۔ صحابہؓ بڑی کثرت سے روزہ رکھتے تھے . . . . . بعض ایسے موقعے تلاش کرے جن میں کِسی سے کلام نہ کرے۔ خاموش ہو کر بیٹھے خواہ یہ وقت پندرہ بیس منٹ ہی ہو۔ بہت وقت نہ سہی مگر کچھ وقت

ضرور ہونا چاہیئے تاکہ خاموشی میں ذکر کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تبلیغ کے کام میں مطالعہ بہت وسیع چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ رہے ۔ حضرت صاحب کی کتابیں اور پھر دوسرے آدمیوں کی کتابیں ۔ اتنی اتنی دفعہ پڑھو کہ فوراً حوالہ ذہن میں آجائے ۔

کتابیں اپنی خریدو!

ایک مرض مولویوں میں ہے ۔ یاد رکھو مولوی کبھی کتاب نہیں خریدتے ۔ اس کو لغو یا اسراف سمجھتے ہیں ۔ شاذ و نادر زیادہ سے زیادہ مشکوٰۃ رکھ لی اور ایک کافیہ رکھ لیا ۔ لیکن انسان کے لئے جہاں وہ اَور بہت سے چندے دیتا ہے ، کتاب خریدنا نفس کے لئے چندہ ہے ۔ کچھ نہ کچھ ضرور کتاب کے لئے بھی نکالنا چاہیئے ۔ خواہ سال میں آٹھ آنے کی ہی کتاب خریدی جائے ۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ لاکھوں کی ہی کتابیں خریدی جائیں ۔ بلکہ جس قدر خرید کرسکو ، خریدو ۔ یہ اس لئے کہ خریدنے والا پھر اس کتاب کا آزادی سے مطالعہ کرسکے گا اور اس طرح اس کے علم میں اضافہ ہوگا فراست بڑھے گی ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سوال و خوشامد کی عادت نہ ڈالو

پھر نفس کے لئے لجاجت ، خوشامد ، سوال کی عادت نہیں ہونی چاہیئے ۔ یہ بھی علماء میں بڑا بھاری نقص ہے کہ وعظ کیا اور بعد میں کچھ مانگ لیا ۔ اور اگر کوئی ایسا گرا ہؤا نہ ہؤا تو اس نے دوسرے پیرایہ میں اپنی ضرورت جتا دی ۔ مثلاً ہمارا کنبہ زیادہ ہے ، گزارہ نہیں ہوتا ۔ یا کسی دوسرے الفاظ میں لوگوں کو سُنا دیا کہ کچھ روپے کی یا کوٹ وغیرہ کی ضرورت ہے ۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے ۔ اللہ تعالیٰ پر توکل چاہیئے ۔ اسی سے مانگنا چاہیئے ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کو الہام ہؤا تھا کہ تیرے پاس ایسا مال لایا جائیگا کہ مال لانے والوں کو الہام ہوگا کہ مسیح موعود کے پاس لے کر جاؤ ۔ پھر وہ

مال آتا تھا کوئی کہتا تھا کہ حضور مجھے فلاں بزرگ نے آکر خواب میں کہا اور کوئی کہتا تھا حضور مجھے الہام ہوا۔

اللہ پر توکّل کرو وہ خود تمہارا کفیل ہو گا

میرا اپنا تجربہ ہے کہ جب ضرورت ہوتی ہے تو خدا تعالےٰ کہیں نہ کہیں سے بھیج دیتا ہے۔ خدا تعالےٰ خود لوگوں کے دلوں میں تحریک کرتا ہے جو دوسروں کا محتاج ہو پھر اس کے لئے ایسا نہیں ہوتا۔ ہاں اللہ تعالےٰ پر کوئی بھروسہ کرے تو پھر اللہ تعالےٰ اُس کے لئے سامان پیدا کرتا ہے۔ حضرت مولوی صاحب سُنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ مجھے کچھ ضرورت پیش آئی میں نے نماز میں دُعا مانگی۔ مصلےٰ اُٹھانے پہ ایک پونڈ پڑا تھا۔ میں نے اسے لے کر اپنی ضرورت پر خرچ کیا ...... تم کبھی دوسرے پر بھروسہ نہ رکھو۔ سوال ایک زبان سے ہوتا ہے اور ایک نظر سے۔ تم نظر سے بھی کبھی سوال نہ کرو۔ پس جب تم ایسا کرو گے تو پھر خدا تعالےٰ خود سامان کرے گا۔ اس صورت میں جب کوئی تمھیں کچھ دے گا بھی تو دینے والا پھر تم پر احسان نہیں سمجھے گا۔ بلکہ تمہارا احسان اپنے اُوپر سمجھے گا۔

لوگوں سے تعلقات

مبلّغ کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر خادمانہ حیثیّت رکھے۔ لوگوں نے یہ نکتہ نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ بعض نے سمجھا کہ نوکر چاکروں کی طرح کام کرے۔ یہ مراد نہیں۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے مُلّانے پیدا ہوئے جن کے کام مُردے نہلاتا ہُوا کرتا ہے۔ کوئی بیمار ہو جائے تو کہتے ہیں بلاؤ میاں جی کو وہ آکر اس کی خدمت کریں۔ کھیتی کاٹنی ہو تو چلو میاں جی گویا میاں جی سے ...... وہ نائی دھوبی جس طرح ہوتے ہیں اس طرح کام لیتے ہیں۔ دوسری صورت پھر پیروں والی ہے۔ پیر صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں کسی کی مجال نہیں کہ پیر صاحب کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے۔ حافظ

صاحب سُناتے تھے اُن کے والد بھی بڑے پیر تھے۔ لوگ ہمیں آکر سجدے کیا کرتے تھے .... دونوں کا نتیجہ خطرناک نکلا۔ یہ بڑی نازک راہ ہے مبلّغ خادم ہو اور ایسا خادم ہو کہ لوگوں کے دل میں اس کا رُعب ہو۔ خدمت کرنے کے لئے اپنی مرضی سے جائے ....

اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو اس کی تشفی دینے والا ہمارا مبلّغ ہو۔ کوئی بیوہ ہو تو حسب ہدایاتِ شریعتِ اسلامیہ اس کا حال پوچھنے والا، اس کا سودا وغیرہ لانے والا اور اس کے دیگر کاروبار میں اس کی مدد کرنے والا ہمارا مبلّغ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن کے دلوں میں دو چیزیں پیدا ہوں گی۔ ادب ہوگا اور محبّت ہوگی۔ توکّل کا نتیجہ ادب ہوگا اور خدمت کا نتیجہ محبّت ہوگی۔ مبلّغ کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف اگر ان میں دنائت نہ ہو تو دوسری طرف تکبّر بھی نہ ہو۔ لوگ نوکر اس کو سمجھیں گے ...... جو اُن سے سوال کرتا ہو۔ جو سوال ہی نہیں کرتا اس کو وہ نوکر کیونکر سمجھیں گے ...... تو یہ دو رنگ ہونے چاہئیں کہ اگر سب سے بڑا خادم ہو تو ہمارا مبلّغ ہو۔ اور اگر لوگوں کے دلوں میں کسی کا ادب ہو تو وہ ہمارے مبلّغ کا ہو۔ اس کے لئے وہ اپنے مال قربان کرنے کے لئے تیار ہوں، اس کے لئے جان دینے کے لئے تیار ہوں۔

دُعائیں کرتے رہو

پھر مبلّغ کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ دُعائیں کرتا رہے کہ الٰہی مَیں ان لوگوں کو ناراستی کی طرف نہ لے جاؤں۔ جب سے خلافت قائم ہوئی ہے مَیں یہی دعا مانگتا ہوں ...... دیکھو مولوی گرے۔ مسلمان بھی گر گئے یہ دو باتیں ہر وقت مدِنظر رہنی چاہئیں۔ اوّل کوئی ایسی بات نہ کرے، جس پر پہلے سوچا اور غور نہ کیا ہو۔ دوم دُعا کرتا رہے کہ الٰہی مَیں جو کہوں وہ ہدایت پر پہنچانے والا ہو۔ اگر غلط ہو تو الٰہی ان کو اس پر نہ چلا اور اگر یہ درست ہے تو الٰہی توفیق دے کہ یہ لوگ اس راہ پر چلیں۔

جو بدی کسی قوم میں ہو اس کی تردید میں جرأت سے لیکچر دو۔

اپنے عمل دیکھتا رہے کبھی سستی نہ کرے۔ لوگوں کو اُن کی غلطی سے روکے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے قول کے نیچے آئے۔ لَوْ لَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ؕ[۱]
کیوں انہوں نے نہ روکا . . . . غریبوں پر اگر وہ ظلم کرتے ہیں۔ شریفوں کا ادب نہیں کرتے۔ چوری کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ ان پر لیکچر دو . .

کبھی کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہ ہو۔ مَیں اپنا طریق بتاتا ہوں مَیں نے کبھی کسی کی مرض کے متعلق بیان کرنا ہو تو مَیں دو تین مہینے کا عرصہ درمیان میں ڈال لیتا ہوں تاکہ وہ بات لوگوں کے دلوں سے بھول جائے تو اتنا عرصہ کر دینا چاہیئے۔ اگر موقع ملے تو اس شخص کو جس میں یہ مرض ہے علیحدہ تخلیہ میں نرم الفاظ کے ساتھ سمجھاؤ ایسے الفاظ میں کہ وہ چڑ نہ جائے۔ ہمدردی کے رنگ میں وعظ کرو۔ ایک طرف اتنی ہمدردی دکھاؤ کہ غریبوں کے خدمتگار تم ہی معلوم ہو۔ دُوسری طرف اتنا بڑا بنو کہ تمھیں دُنیا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دو فریق بننے نہ دو۔ دو شخصوں کے جھگڑے کے متعلق کسی خاص کے ساتھ تمہاری طرفداری نہ ہو۔ کوئی مرض پاؤ تو اس کی دوا فوراً دو۔ کسی موقع پر چشم پوشی کر کے مرض کو بڑھنے نہ دو۔ ہاں اگر اصلاح چشم پوشی ہی میں ہو تو کچھ حرج نہیں۔

لوگوں کو جو تبلیغ کرو اس میں ایک جوش ہونا چاہیئے۔ جب تک تبلیغ میں ایک جوش نہ ہو وہ کام ہی نہیں کر سکتا . . . . . (۲) ٹھٹھے باز نہیں ہونا چاہیئے۔ لوگوں کے دلوں سے ادب اور رُعب جاتا رہتا ہے۔ ہاں مذاق نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی کر لیا کرتے تھے اس میں حرج نہیں۔ احتیاط ہونی چاہیئے سنجیدہ معلوم ہو۔ (۳) اور ہمدردی ہونی چاہیئے۔ نرم الفاظ ہوں سنجیدگی سے ہوں۔ سمجھنے والا سمجھے میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ تمہاری ہمدردی وسیع ہونی چاہیئے۔ احمدیوں سے بھی ہو غیر احمدیوں سے بھی ہو

---

[۱] سُورۃ مائدہ آیت ۶۴

...... آج تک ہمارے مبلّغوں کا زور غیر احمدیوں پر ہی رہا ہے۔ کثرت سے ہندو آباد ہیں۔ ان میں بھی تبلیغ ہونی چاہیئے۔ بہت سی سعید رُوحیں ان میں بھی ہوتی ہیں۔ تمہاری ہمدردی ان کے ساتھ بھی ایسی ہی ہونی چاہیئے......
حضرت معین الدین چشتی کوئی اتنے بڑے عالم نہ تھے بلکہ انہوں نے اپنے اعمال کے ساتھ دعاؤں کے ساتھ ہندوؤں کو مسلمان بنایا....... مبلّغ کا فرض ہے کہ ایسا طریق اختیار نہ کرے کہ کوئی قوم اُسے اپنا دشمن سمجھے......
تبلیغ میں یہ یاد رکھو کہ کبھی کسی شخص کے اقوال سے گھبراؤ نہیں اور نہ قول پر دارومدار رکھو۔ دلیل اور قول میں فرق ہے۔ دلیل پر زور دینا چاہیئے لوگ دلیل کو نہیں سمجھتے۔ مسلمان آریوں سے بات کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں قرآن میں یوں آیا ہے۔ آریوں کے لئے قرآن حجّت نہیں۔ تم رویہ دلیل کو پیش کرنے کا اختیار کرو تا جماعت احمدیّہ میں یہ رنگ آجائے.......

جب بحث کرو تو مدِّمقابل کی بات کو سمجھو کہ وہ کیا کہتا ہے۔ مثلاً تناسخ کی بات شروع ہوتی ہو تو فوراً تناسخ کے ردّ میں دلائل دینے نہ شروع کرو کیونکہ اللہ تعالےٰ کی ذات سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے مسئلے میں بھی اختلاف آرہا ہے۔ اب اگر تم اس کے برخلاف دلیلیں دینے لگ پڑو اور آخر میں وہ کہہ دے کہ آپ تو میری بات سمجھے ہی نہیں تو تقریر بے فائدہ جائے گی... بغیر خیالات معلوم کئے بات نہ کرو۔ تناسخ کے متعلق بات کرو تو پوچھو، کہ تمہارا تناسخ سے کیا مطلب ہے۔ اس کی ضرورت کیا پیش آئی۔ غرض ایسے سوالات کرکے پہلے اس کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو اور پھر بات کرو.....

تھوڑے وقت میں بہت کام کرنا سیکھو۔ تھوڑے وقت میں بہت کام کرنا ایسا گُر ہے کہ انسان اس کے ذریعے سے بڑے بڑے عہدے حاصل کرتا ہے..... اسی کا نام لیاقت ہے۔ دوسرا طریق دوسروں سے کام لینے کا ہے بڑے بڑے عہدیدار خود تھوڑا کام کرتے ہیں۔ دوسروں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن وہ تو خوب تنخواہیں پاتے ہیں۔ لیکن ایک محنتی مزدور آٹھ آنے ہی کماتا ہے۔ یہ لیاقت کام کرنے کی لیاقت سے بھی بڑی ہے۔ پس جتنی لیاقت کام

کروانے کی ہوگی اتنا ہی بڑا عمدہ ہوگا۔ . . . . . ایسے رنگ میں کام کرو، کہ لوگوں کے اندر ایک روح پھونک دو۔ کبھی مت سمجھو کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مانتے نہیں۔ عرب کی زمین کیسے شریروں کی تھی پھر کیسے شریفوں کی بن گئی۔ یہ بات غلط ہے کہ وہ مانتے نہیں تم ایک دفعہ سُناؤ دو دفعہ سُناؤ آخر مانیں گے یہ اس شخص کی اپنی کمزوری ہوتی ہے جو کہتا ہے مانتے نہیں۔

اپنے کام کی پڑتال کرتے رہو

ہمیشہ اپنے کام کی پڑتال کرو۔ کیا کامیابی ہوئی۔ تمہارے پاس ایک رجسٹر ہونا چاہیئے اس میں لکھا ہؤا ہو کہ فلاں جگہ گئے وعظ فلاں مضمون پر کیا۔ اس اس طبقے کے لوگ شامل ہوئے۔ فلاں فلاں وجوہات پر مخالفت کی گئی۔ فلاں فلاں بات لوگوں نے پسند کی۔ یہ رجسٹر آئندہ تمہارے علم کو وسیع کرنے والا ہوگا۔ تم سوچو گے۔ کیوں مخالفت ہوئی۔ اہم مسائل کا تمھیں پتہ لگ جائے گا۔ اُن پر آئندہ غور کرتے رہو گے اگر تم وہاں سے بدل جاؤ گے تو پھر تمہارے بعد آنے والے کے کام آئے گا۔ . . . . کبھی اپنی جگہ نہیں چھوڑنی چاہیئے۔ یہ خیال کرکے کہ اگر یہ یوں نہیں مانتا تو اس طرح مان لیگا اس میں وہ تو نہ ہارا۔ تم ہار گئے . . . . ایسی محبّت احمدی لوگوں سے ہونی چاہیئے کہ رشتہ داری کی محبّت سے بھی بڑھ جائے۔ حق کی تائید ہونی چاہیئے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر احمدی کے مقابل میں رشتہ دار آگیا ہے تو اپنے رشتہ دار کی طرفداری اختیار کر لی جائے . . . .

اس بات کو پیدا کرو کہ ہر ایک آدمی مبلّغ ہے۔ صحابہؓ سب مبلّغ تھے۔ اگر ہر ایک آدمی مبلّغ ہوگا تب اس کام میں کچھ آسانی پیدا ہوگی اس لئے ہر ایک احمدی میں تبلیغ کا جوش پیدا کرو۔ . . . .

پھر مالی امداد کا احساس پیدا کرو۔ . . . . . . یہ احساس پیدا ہونا چاہیئے کہ ضروریات کو کم کرکے بھی دین کی راہ میں روپیہ خرچ کیا جائے۔ . . . . . جماعت کی یہ حالت ہے کہ اخبار میں چندے کے متعلق نکلے تو کان ہی نہیں

دھرتے ہاں علیحدہ خط کی انتظار میں رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کا لڑکا گم ہوا ہو اور اخبار میں نکل جائے تو جس کے ہاں ہوتا ہے وہ اُسے وہیں روک لیتا ہے خط کا انتظار نہیں کرتا۔ ان کے دلوں میں ایسا جوش پیدا کرو۔ کہ جونہی یہ دین کیلئے آواز سُنیں فوراً دوڑ پڑیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب کوئی اعتراض پیش آوے پہلے خود اس کے حل کرنے کی کوشش کرو فوراً قادیان لکھ کر نہ بھیج دو۔ خود سوچنے سے اس کا جواب مل جائے گا اور بیسیوں مسائل پر غور ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قادیان آنے کی تاکید کرتے رہو

لوگوں کو قادیان بار بار آنے کے لئے اور تعلق پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہو جب تک کسی شاخ کا جڑ سے تعلق ہوتا ہے وہ ہری رہتی ہے لیکن شاخ کا جڑ سے تعلق ٹوٹ جانا اس کے سُوکھ جانے کا باعث ہوتا ہے۔ موجودہ فتنے میں نوّے فیصدی ایسے لوگ ہیں جو اسی وجہ سے کہ اُن کا تعلق قادیان سے نہ تھا فتنے میں پڑے۔ بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ قادیان میں کچھ کام نہیں رہا۔ روپیہ جاتا ہے اور وہ لوگ بانٹ کر کھا لیتے ہیں اس لئے لوگوں کو قادیان سے تعلق رکھنے کے لئے کوشش کرتے رہو۔" (الفضل قادیان مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۱۶ء)

جلسہ سالانہ ۱۹۱۵ء

جلسہ سالانہ ۱۹۱۵ء منعقدہ ۲۶-۲۷-۲۸ دسمبر جماعت احمدیہ کے لئے بہت خوشیوں کے سامان لایا۔ اس سے پہلے کبھی اس کثرت سے احبابِ جماعت اور دیگر زائرین جلسہ پر تشریف نہ لائے تھے۔ اُس زمانہ کے لحاظ سے یہ کہنا جائز ہوگا کہ ایک ہجومِ خلائق تھا جو قادیان کی طرف کھنچا چلا آیا۔ ایک اور نمایاں پہلو اس جلسہ کا یہ تھا کہ بڑی کثرت کے ساتھ لوگ سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئے اور جماعت کے ازدیادِ ایمان کا موجب بنے۔ نہ صرف یہ کامیابی فی ذاتہٖ خوشی کی بات تھی بلکہ ہر پہلو سے منکرینِ خلافت

پر جماعت احمدیہ مبائعین کی ایک روشن اور نمایاں فتح تھی۔

قومی رہنماؤں پر فتح و نصرت کے اثرات ان کے کردار کے مطالعہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ آیئے دیکھیں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ پر اس کا کیا اثر پڑا۔ عموماً ایسے موقع پر فتح مند رہنما فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہیں۔ تعلّی کے کلمات مُنہ سے نکالتے اور خود اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں یا پھر اپنی قوم کی بڑائی اور عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ لیکن آپ کا ردِ عمل اس سے بالکل مختلف تھا۔ نہ تو آپ فخر و مباہات کی طرف مائل ہوئے نہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے گُن گائے بلکہ کامل عجز کے ساتھ اپنے خدا کے حضور اسی کی حمد کے گیت گاتے ہوئے جھک گئے اور ہر کامیابی کو اللہ تعالیٰ ہی کے فضل اور نصرت کا نتیجہ قرار دیا۔

بعض اوقات فتوحات انسان میں غفلت اور سُستی پیدا کرنے کا موجب بھی بن جاتی ہیں۔ لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا کردار اس پہلو سے بھی امتیازی شان کا حامل تھا زندگی بھر کسی کامیابی نے آپ کی قوتِ عمل کو کمزور نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ اس کا برعکس نتیجہ پیدا کرتی رہی۔ ہر کامیابی آپ کو پہلے سے زیادہ تیز رو بنا جاتی۔ اور ہر فتح کے موقعہ پر آپ کی تیز نظر اُن خطرات کو بھانپ لیتی جو عموماً فتوحات کے عقب میں قوموں کے کردار پر شب خون مارنے کے لئے گھات لگائے رہتے ہیں۔ پس اس موقع پر بھی جہاں ایک طرف اللہ تعالےٰ کے احسانات پر آپ کا دل حمد سے بھر گیا وہاں آپ کا ذہن ان خطرات کی طرف بھی منتقل ہو گیا جو کامیابی کی ہر منزل کے بعد جماعت کو پیش آ سکتے تھے۔ زیرِ نظر جلسہ سالانہ کے موقع پر آپ کی چوتھی تقریر اسی مضمون سے تعلق رکھتی ہے۔ اس تقریر میں آپ نے جماعت کو متنبہ کیا کہ کس طرح عظیم فتوحات اور فوج در فوج جماعت مؤمنین میں غیروں کی شمولیت اپنے عقب میں بعض خطرات بھی لے کر آتی ہے۔ مُربیان کی کمی اور ناقابلِ تربیت لوگوں کی کثرت۔ نئے نئے خیالات اور جاہلانہ روایات کی اکاس بیل امامِ وقت سے براہِ راست تربیت پانے والے معلّمین کا کم ہو جانا وغیرہ ایسے امور ہیں جن کے متعلق فکر کرنا لازمی ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جماعت فوری طور پر کثرت سے مربیان اور معلّمین پیدا کرنے کی طرف متوجّہ ہو۔

اس کے بعد آپ نے سورۂ نصر کی نہایت لطیف تفسیر فرمائی اور تاریخ اسلام کا حوالہ دیتے ہوئے ان خطرات کی نشاندہی فرمائی جن کا سورۂ نصر میں ذکر ہے۔ آپ نے ان مشکلات کا نہایت دردناک پیرایہ میں ذکر فرمایا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو درپیش تھیں اور اُن فتنوں کا تفصیلی ذکر کیا جو ہر طرف سے اسلام کے خلاف سر اُٹھا رہے تھے۔ اور بڑے گہرے عالمانہ تفحص کے ساتھ ان موجبات اور محرکات کا تجزیہ فرمایا جو ان فتنوں کے پس پردہ کارفرما تھے۔ پھر جماعت کو نہایت دردانگیز طریق پر بار بار توجہ دلائی کہ اپنی فتح کے گھمنڈ میں مستقبل کے خطرات سے غافل نہ ہوجانا۔ کل اس سے بڑی فتوحات تمھارے لئے مقدر ہیں بلکہ ہر آنیوالا دن پہلے سے بڑھ کر فتح و ظفر کی خوشخبریاں لے کر آئے گا۔ یہ خدا کے وعدے ہیں جو ضرور پورے ہوکر رہیں گے اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں۔ ہاں مجھے فکر ہے تو اس بات کی کہ ان فتوحات کے بعد بڑے بڑے مہیب فتنے بھی سر اُٹھائیں گے۔ ایسے ہولناک فتنے بھی رونما ہوسکتے ہیں۔ جو اس فتنے سے بہت زیادہ پُرخطر اور مہیب ہوں گے۔ جس میں سے تم ابھی فتح مند اور کامران ہوکر نکلے ہو۔ آج اس وقت کی فکر کرو اور کل پیش آنے والے خطرات کے دفاع کا انتظام کرو۔ ورنہ وہ فتنے تمھیں غفلت کی حالت میں آپکڑیں گے۔ آپ نے خلافتِ ثالثہ راشدہ کی مثالیں دے کر بڑی تفصیل سے ان چور دروازوں کی نشاندہی فرمائی جن سے فتنے رفتہ رفتہ مؤمنین کی جماعت میں در آتے ہیں۔ اُن بظاہر دلکش نعروں کا ذکر کیا جنھیں بلند کرکے خدا کا نام نہیں بلکہ شیطان کا نام بلند کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ان اعتراضات کا ذکر کیا جو عموماً خلفائے وقت کے خلاف اُٹھائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ ایک ایک سنگِ راہ۔ ایک ایک کھائی ایک ایک گڑھے اور ایک ایک پُرخطر گھاٹی کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ تمام مناظر سننے والوں کی آنکھوں کے سامنے رُونما ہوگئے۔ ان فتنوں سے بچنے کے طریق بھی بیان کئے اور سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ کثرت کے ساتھ مرکزِ سلسلہ میں آتے رہو تاکہ جس طرح ایک قصاب ایک چھری کو دوسری کُند چھری کے ساتھ رگڑ کر تیز کرتا رہتا ہے تمھارے دلوں کے زنگ بھی ایک دوسرے سے مل کر اور تبادلۂ خیالات کرکے چھٹتے رہیں اور تم ان صالحین کی صحبت سے فائدہ اُٹھا سکو جو محض للہ مرکزِ احمدیت

میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔

دُنیا میں کم ہی کسی آنکھ نے فتح و ظفر کا جشن منانے والی کوئی ایسی تقریب دیکھی ہو گی۔ کچھ ابتدائے اسلام کے دردناک حالات کا اثر کچھ بیان کرنے والے کے دل کا سوز اور لحن کا گداز ہزارہا کے مجمع پر ایک ایسا وجد اور رقت کا عالم طاری تھا کہ ہمارے قلم میں اس کے بیان کی طاقت نہیں۔ موقع کے شاہد بیان کرتے ہیں، اور الفضل کا رپورٹر رقمطراز ہے کہ ہزاروں کا مجمع بلک بلک کر رو رہا تھا اور فرشِ زمین کی یہ گریہ وزاری عرشِ بریں کے کنگرے ہلا رہی تھی۔ یہ تقریر جو بعد میں انوارِ خلافت کے نام سے چھپ چکی ہے اس لائق ہے کہ نسلاً بعد نسلٍ اس کی اشاعت ہوتی رہے اور ہر آنے والی نوجوان نسل اس کے مضمون سے باخبر ہو کر آنے والے فتنوں سے متنبّہ رہے اور اُن سے مقابلہ کرنے کی اہل ثابت ہو۔

آپ کی جلسہ کی دوسری تقاریر میں سے پہلی ایک طویل گہری علمی تقریر تھی، جس میں جماعت احمدیہ کے امتیازی نظریات اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کے بارہ میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خاص طور پر اسمہٗ احمدؐ کی پیشگوئی کے تمام پہلو بڑی عمدگی کے ساتھ زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ ۲۷ر دسمبر کی درمیانی تقریر کا ایک حصّہ پہلے مضمون کا تتمہ تھا۔ اور دوسرے حصّے میں متفرق امور مثلاً تحصیلِ علم اور عورتوں کو علمِ دین سکھانا وغیرہ پر گفتگو فرمائی گئی تھی۔ اس جلسہ پر خلافت کے دوسرے سال کا افتتاح ہوا۔ اور احباب جماعت نئے ولولے اور نئی اُمنگوں، نئے ارادوں اور دینِ محمّد کو پہلے سے بڑھ کر سیکھنے کا عزم لے کر گھروں کو لوٹے۔

اس جلسہ کی ایک امتیازی شان یہ بھی تھی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے پہلی مرتبہ جماعت احمدیہ کو یہ عظیم خوشخبری سُنائی کہ اللہ تعالےٰ کے فضل اور توفیق سے جماعت احمدیہ کو قرآن کریم کے پہلے پارہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ شائع کرنے کا موقع ملا ہے۔ احباب جماعت کو اس بات کا بہت رنج تھا کہ مولوی محمد علی صاحب ایم اے سلسلہ کے خرچ پر تفسیرِ قرآن انگریزی کا جو کام کر رہے تھے اُسے وہ اپنی ذاتی ملکیّت سمجھ کر لاہور لے گئے اور جماعت احمدیہ اپنے ایک جائز حق سے محروم ہو گئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا یہ کارنامہ قابلِ تحسین ہے کہ آپ نے ایک قلیل

عرصہ یعنی دو سال کے اندر جماعت کے اس زخم پر سکینت بخش مرہم رکھا اور یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اس وقت قرآنِ کریم کے پہلے پارے کے انگریزی ترجمے کی جلد میرے ہاتھ میں ہے نہایت ہی دل نشین انداز میں جماعت کو تسلّی دی کہ جسے تم نقصان سمجھتے ہو اُسی میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے بھلائی مضمر ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں اُس ترجمہ کی نسبت ایک بہتر ترجمہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور آئندہ بھی توفیق عطا فرماتا رہے گا۔

اس ترجمہ کی خصوصیات یہ تھیں کہ اس سے پہلے کبھی کوئی انگریزی ترجمہ عربی متن کے ساتھ نہیں چھپا تھا۔ مزید خوبی اس میں یہ پیدا کر دی گئی کہ عربی متن کے تلفظ اور لہجہ کو رومن الفاظ میں بھی ظاہر کیا گیا۔ تاکہ یورپین قومیں جو عربی رسم الخط سے ناواقف ہیں قرآن کریم کا اصل متن بھی پڑھ سکیں۔ ترجمہ بہترین بامحاورہ زبان میں ہونے کے باوجود کہیں بھی متن کے اصل منشاء سے ہٹنے نہیں پایا اور جہاں ضرورت پیش آئی تفسیری نوٹ بھی دے دیئے گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب محبت کرنے والے اور محبوب لوگ دیر کے بعد ملتے ہیں تو ان کو تحفہ دیا جاتا ہے۔ مَیں جماعت کو اس جلسہ پر یہ تحفہ پیش کرتا ہوں جس سے زیادہ بیش قیمت اور کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

یہ ترجمہ حضور کی مسلسل نگرانی اور ہر قدم پر آپ کی رہنمائی کا مرہونِ منّت ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تمام تر حضور ہی کے تفسیری نوٹوں سے تیار کیا گیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فاضل مترجمین نے آپ کے منشاء اور ہدایت کے مطابق بڑی خوبی سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور بہت ہی توجہ اور دن رات کی محنت اور لگن اور خلوص کے ساتھ اس فریضہ کو سرانجام دیا۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ

دُنیا کے مختلف علمی حلقوں نے اس ترجمہ کو بڑے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اخبار ایمپائر کلکتہ۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے علاوہ لنڈن کے ایک جریدہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔[۱] لیکن ان سب سے بڑھ کر "مُسلم ورلڈ" کا ریویو قابلِ ذکر ہے جو قاہرہ سے چھپنے والا ایک مؤقر عیسائی ماہنامہ تھا۔ اس کے ذہین اور عالم مدیر نے خاص تنقیدی نظر سے اس ترجمہ کا مطالعہ کر کے

---

[۱] ریویو آف ریلیجنز اُردو جنوری ۱۹۱۷ء صفحہ ۳۲۔

س پر تبصرہ لکھا۔ اگرچہ عیسائی نقطۂ نظر سے بعض جگہ اعتراضات بھی کئے لیکن بالعموم اس کی خوبیوں کو بہت سراہا اور تسلیم کیا کہ اسلام میں یہ ایک بالکل نئی پیش کش ہے جو معقولیات کے قریب تر ہے۔ اور گہری ٹھوس علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس ترجمہ کے مطالعہ نے جماعتِ احمدیہ کا جو گہرا اثر تبصرہ نگار مسٹر آر۔ ایف میکنیل کے دل پر چھوڑا اس کا کچھ اظہار اس تبصرہ کے حسب ذیل آخری چند فقرات سے ہو سکتا ہے:۔

> "بہر حال خواہ کچھ بھی ہو ہمارے سامنے اسلام کی ایک ایسی جماعت ہے جو کار کن اور ترقی کرنے والی ہے اور ان تمام اشکال سے پاک ہے جن کے خلاف عام طور پر مسیحی دلائل کا رُخ ہوتا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ نیا فرقہ ترقی کریگا یا نہ۔ لیکن اس جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ یقیناً ہمیں اس آخری اور اہم امر پر فیصلہ کا اندازہ کرنے میں مدد دے گا۔ جس پر اسلام اور مسیحیت کے درمیان بازی لگ رہی ہے۔"[1]

---

[1] ریویو آف ریلیجنز اردو اگست ۱۹۱۶ء صفحہ ۳۰۵

اسلوبِ بیان میں تبدیلی

حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کا یہ دَور جس پر اب ہم نظر ڈالیں گے نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کی قائدانہ اور مصلحانہ صلاحیتیں اس دَور میں پورے عروج پر جلوہ افروز نظر آتی ہیں۔ عظیم الشان اور دُور رس منصوبے تیار ہو رہے ہیں۔ اور جماعت کو اُن پر باحسن طریق عمل پیرا ہونے کا ڈھنگ سکھایا جا رہا ہے۔ پس مناسب ہوگا کہ ابواب کو سال بسال منقسم کرنے کی بجائے اہم کاموں اور منصوبوں کے اعتبار سے ابواب قائم کرکے ان پر یکجائی نظر ڈالی جائے۔ بایں ہمہ بعض کام اتنے وسیع ہیں اور اتنے طویل زمانہ کو محیط ہیں کہ شاید انہیں مزید ابواب میں بھی منقسم کرنا پڑے۔

بہرحال اس نئے طریقِ کار پر عمل کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے جماعت احمدیہ کے اس عظیم الشان نظام کا ذکر کرتے ہیں جو آپ کی قیادت میں مختلف مراحل سے گزرتا ہوُا قائم و رائج ہوُا۔ یہ نظام انہی خطوط پر آج بھی جاری ہے۔ ہاں وقتاً فوقتاً اس میں نئی ارتقائی شاخیں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

نظامِ جماعت احمدیّہ کی تشکیل و ترویج

بحیثیتِ امام جماعت احمدیّہ، ابتدائے خلافت ہی سے آپ کی توجہ جماعتی نظام کو اس طرح مستحکم کرنے کی طرف لگی ہوئی تھی کہ خلافتِ راشدہ اسلامیہ کو جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر دوبارہ اسی قسم کے خطرات خلافتِ احمدیّہ کو درپیش ہوں تو جماعت اُن کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ علاوہ ازیں قوموں کی ترقی اور تنزّل کے اسباب پر نظر کرتے ہوئے آپ ایسے تمام ذرائع اختیار کرنا چاہتے تھے جو اِلّا ماشاء اللہ جماعت کے لئے رخنوں سے پاک اور ہمیشہ قائم رہنے والی سچی اور فعّال زندگی کے ضامن ہو سکیں۔ اس پہلو سے آپ کی زندگی کا مطالعہ دلچسپی کا گہرا مواد اپنے اندر رکھتا ہے۔ نظامِ جماعت کی تشکیل کے سلسلہ میں آپ نے جو جو ذرائع اختیار فرمائے اور جو جو تدابیر سوچیں وہ ایک ایسے شخص سے ہی ممکن تھیں جو مورّخ بھی ہو اور مفکّر بھی۔ صاحبِ علم بھی ہو اور صاحبِ عمل بھی۔ فطرتِ انسانی سے بھی آشنا ہو اور مختلف انسانی طبقات کے مزاج پر بھی گہری نظر رکھتا ہو اور ان سب کے علاوہ ایک صاحبِ تجربہ روحانی وجود ہو۔ یہ تمام کمالات آپ کی ذات میں جمع تھے اور اُن کے امتزاج نے اس نظام کو جنم دیا جو آج نظامِ جماعت احمدیّہ کی شکل میں نہایت مستحکم صورت میں دُنیا کے سامنے ایک مثالی نظام کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

وہ قدرتِ ثانیہ جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کو بشارت دی گئی تھی کہ آپ کے جانے کے بعد آئے گی وہ نظامِ خلافتِ احمدیّہ کی صورت میں حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے وصال کے بعد ظاہر ہوئی اور یہی خلافتِ احمدیّہ ہے جو نظامِ جماعت احمدیّہ کا مرکزی نقطہ ہے جو ایک دل کی طرح جماعت احمدیّہ کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ خلیفۃ المسیح، حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی طرح ہی جماعت احمدیّہ کے مطاع اور رُوحانی پیشوا ہیں۔ ایک پہلو سے جماعت احمدیّہ میں خلیفۃ المسیح کو وہی حیثیّت حاصل ہے جو انسانی جسم میں دل کو ہوتی ہے۔ اور ایک دوسرے پہلو سے اس کی مثال دماغ کی سی ہے۔ باقی تمام نظامِ سلسلہ انہی دو

مرکزی قوتوں سے متحرک رہتا اور اپنی طبعی تشکیل کے مقاصد سرانجام دیتا ہے اور انہی کی رہنمائی میں مختلف رُوحانی اغراض کے حصُول کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اسی رہنما اصول کی روشنی میں تمام نظامِ جماعت کی تشکیل کی اور یہ سلسلہ ہمیشہ آپ کی رہنمائی میں ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ آپ کا طریق یہ تھا کہ جب بھی ذہن میں کوئی انتظامی تدبیر آتی تو اس کے تماثل پر نظر دَوڑاتے اور دنیا میں رائج ایسے نظاموں کا بھی مطالعہ فرماتے جو کسی نہ کسی پہلو سے آپ کی زیرِنظر تجویز پر روشنی ڈال سکتے ہوں۔ اس سلسلہ میں مکرم ومحترم ڈاکٹر حشمت اللہ خاں صاحب رضی اللہ عنہ کی ایک دلچسپ روایت پیش ہے جو آپ نے راقم الحروف کے سامنے متعدد بار بیان کی۔ مکرم ڈاکٹر صاحب کو ایک لمبا عرصہ حضور کے ذاتی معالج کی حیثیت سے حضور کے قریب رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ فرماتے تھے:۔

> "ایک مرتبہ حضور نے مجھے یاد فرمایا اور بتایا کہ آپ نظامِ جماعت میں اصلاحی تبدیلیاں کرنے پر غور فرما رہے ہیں لہٰذا چاہتے ہیں کہ انسانی جسم کے نظام کا مطالعہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو ایک کامل نظام کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے بہت سی مفید رہنمائی حاصل ہوسکے گی چنانچہ آپ نے ANATOMY اور PHYSIOLOGY وغیرہ کی مختلف کتب حاصل کرکے ان کا مطالعہ فرمایا اور بہت سے مفید نتائج اخذ کئے۔ غالبًا اسی تحقیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے ایک مرتبہ فرمایا۔" اللہ تعالیٰ نے نظامِ جسم میں ہنگامی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے بکثرت متبادل راستے تجویز کر رکھے ہیں مثلاً اگر ایک شریان بند ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری شریان نیا راستہ مہیا کر دیتی ہے۔ لہٰذا انسان کو کسی نظام کی تشکیل کے وقت اس رہنما اصُول کو مدِنظر رکھنا چاہیئے۔"

اسی طرح آپ کی تقاریر میں بکثرت ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ

آپ نے نظامِ سلسلہ کی تشکیل کے وقت نہ صرف تاریخِ عالم کا گہرا مطالعہ فرمایا بلکہ دنیا میں رائج الوقت سیاسی نظاموں (POLITICAL SYSTEMS) پر بھی نظر ڈالی لیکن اہم جماعتی امور میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ محض علمی تحقیق پر انحصار نہ فرماتے بلکہ سنّتِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ آخری فیصلہ سے پہلے صائب الرائے احبابِ جماعت سے مشورہ حاصل کیا کرتے۔ اس کے بعد دعاؤں اور استخاروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کرتے اور جس امر پہ اللہ تعالیٰ آپ کو شرح صدر عطا فرما دیتا اسے اختیار کر لیتے۔

صدر انجمن احمدیہ

جماعت احمدیہ کا مرکزی انتظامی ادارہ جو صدر انجمن احمدیہ کے نام سے موسوم ہے، ابتداء میں اس کی یہ صورت نہ تھی بلکہ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس نے رفتہ رفتہ موجودہ شکل اختیار کی۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السّلام نے الہامِ الٰہی کی روشنی میں جس انجمن کی تشکیل فرمائی تھی اس کا نام حضور علیہ السّلام نے

"مجلس کارپردازانِ مصالح قبرستان"

رکھا تھا جس کا اصل کام نظامِ وصیّت کو رائج کرنا تھا۔ اس انجمن کی تشکیل نے رفتہ رفتہ بعض اور تجاویز کو جنم دیا۔ چنانچہ خواجہ کمال الدین صاحب کو خیال آیا کہ کیوں نہ حضرتِ مسیح موعود علیہ السّلام کو یہ مشورہ دیا جائے کہ جماعت کے تمام اموال کو اس انجمن کی نگرانی میں دے دیا جائے جس کی صورت یہ ہو کہ ایک نئی انجمن بنام "صدر انجمن احمدیہ" قائم کی جائے جو دُنیا کے تمام احمدیوں پر مشتمل ہو یعنی بحیثیت احمدی ہر شخص اس کا رُکن متصوّر ہو۔ اس انجمن کی ایک مرکزی انتظامیہ قائم کی جائے جس کا نام مجلس معتمدین صدر انجمن احمدیہ رکھا جائے اور یہ انجمن امامِ وقت حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی رہنمائی نگرانی اور کامل اطاعت میں سلسلہ کے مختلف مالی اور تنظیمی امور چلانے کی ذمہ دار ہو۔ چنانچہ جب یہ تجویز حضرت اقدس کے سامنے پیش ہوئی تو مختلف احباب کے مشورہ کے

بعد بالآخر حضور علیہ السلام نے اس تجویز کو اس شکل میں منظور فرمالیا کہ اس مجلس کے جملہ ممبران خود حضور علیہ السلام نے نامزد فرمائے اور اس مجلس کا صدر بھی خود حضور نے مقرر فرمایا جو حضرت مولانا حکیم نورالدین رضی اللہ عنہ تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ان کی رائے چالیس آدمیوں کی رائے کے برابر شمار ہوگی۔[1] جب یہ عرض کیا گیا کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ صدر مجلس کو ویٹو کا حق ہوگا تو حضور علیہ السّلام نے فرمایا کہ آپ کا بھی یہی منشاء تھا۔ بہرحال اس مجلس کے قیام کے وقت جو سب سے اہم اور مرکزی قاعدہ ضبط میں دیا گیا وہ یہ تھا:۔

"ہر ایک معاملہ میں مجلس معتمدین اور اس کی ماتحت مجلس یا مجالس
اگر کوئی ہوں، اور صدر انجمن احمدیہ اور اس کی کُل شاخہائے
کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا حکم قطعی اور ناطق ہوگا۔"

مندرجہ بالا امور سے صاف ظاہر ہے کہ اس مجلس کی حیثیت امامِ وقت کے تابع ایک انتظامی ادارے سے بڑھ کر نہ تھی جس کی تشکیل اور جس کے اختیارات کلّیۃً امامِ وقت کی مرضی کے تابع تھے۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السّلام کی زندگی میں اس کی بعینہٖ یہی شکل رہی اور آپ کے وصال کے بعد جب ساری جماعت نے بشمول مجلس معتمدین حضرت حکیم مولانا نورالدین صاحبؓ کو حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی نیابت میں اپنا امام اور خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت نے خلافتِ احمدیہ کی شکل میں قدرتِ ثانیہ عطا کرنے کا وعدہ پورا فرما دیا تو خلافتِ اُولیٰ کے اوّلین سالوں میں یہ انجمن اسی طرح امامِ وقت کے ارشادات کے کلّیۃً تابع رہ کر مفوّضہ امور سرانجام دیتی رہی جیسے پہلے دیا کرتی تھی تاہم کچھ ایسی علامات بھی ظاہر ہونی شروع ہوئیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ مجلس معتمدین کے بعض ممبران اپنی حیثیت سے بڑھ کر اختیارات حاصل کرنے کے متمنی ہیں اور خلافتِ احمدیہ کی بجائے مجلس معتمدین ہی کو خلافت کا مقام دینا چاہتے ہیں اس فتنہ کا کسی قدر تفصیل سے پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ لہٰذا یہاں تکرار کی ضرورت نہیں۔

بہرحال حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جب خلافت کی اہم ذمہ داریاں سنبھالیں تو ان تمام خرابیوں پر آپ کی نظر تھی جو اس قسم کی انجمنوں کے قیام کی غرض و غایت کو نہ سمجھے کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں جماعت کے بڑھتے ہوئے کاموں کے پیشِ نظر بعض

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۷۔

ایسی نئی انتظامی ضرورتیں بھی سامنے آرہی تھیں جن کو یہ انجمن پورا نہ کرسکتی تھی۔عہد خلافت اُولیٰ تک دستور یہ تھا کہ ہر قسم کے انتظامی معاملات براہِ راست مجلس معتمدین میں ہی پیش ہوتے تھے جبکہ صیغہ جات کے افسران جو انتظامی امور کو چلانے کے ذمّہ دار تھے اس انجمن کے رُکن نہیں تھے۔پس انتظامی مسائل کا عملی تجربہ رکھنے والے کارکنان الگ تھے اور انتظامی امور کا فیصلہ کرنے والی انجمن الگ، جسے براہِ راست کوئی انتظامی تجربہ نہ تھا۔ یہ صورتِ حال فی ذاتہٖ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے مختلف احبابِ جماعت سے مشورہ کے بعد جو پہلا انتظامی اصلاحی قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ ایک الگ مجلس انتظامیہ قائم کی جو صیغہ جات کے سربراہوں پر مشتمل تھی اور براہِ راست خلیفۂ وقت کی رہنمائی میں کام کرتی تھی۔ انتظامی امور سے متعلق مشورے اسی مجلس انتظامیہ میں پیش ہوتے جو آخری فیصلہ کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں پیش کئے جاتے۔ اس مجلس کا نام مجلس نظارت رکھا گیا۔لیکن اس مجلس کے قیام کے باوجود مجلس معتمدین اسی طرح قائم رہی البتہ ان دونوں مجلسوں کے دائرۂ عمل اور طریقِ کار کو علیحدہ علیحدہ متعیّن کر دیا گیا۔اس نئی انتظامیہ کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

> "احباب جماعت کی اطلاع کے لئے شائع کیا جاتا ہے کہ ضروریاتِ سلسلہ کو پُورا کرنے کے لئے قادیان اور بیرونی جماعت کے احباب سے مشورہ کرنے کے بعد مَیں نے یہ انتظام کیا ہے کہ سلسلہ کے مختلف کاموں کے سرانجام دینے کے لئے چند ایسے افسران مقرر کئے جائیں جن کا فرض ہو کہ وہ حسب موقعہ اپنے متعلقہ کاموں کو پورا کرتے رہیں اور جماعت کی تمام ضروریات کو پورا کرنے میں کوشاں رہیں۔فی الحال مَیں نے اس غرض کے لئے ایک ناظر اعلیٰ۔ ایک ناظر تالیف و اشاعت۔ ایک ناظر تعلیم و تربیت اور ایک ناظر امورِ عامہ اور ایک ناظر بیت المال مقرر کیا ہے اور ان عہدوں پر سرِدست ان احباب کو مقرر کیا ہے۔ ناظر اعلیٰ مکرمی مولوی شیر علی صاحب۔ ناظر تالیف و اشاعت مکرمی مولوی شیر علی صاحب۔ ناظر تعلیم و تربیت مکرمی

مولوی سیّد سرور شاہ صاحب۔ ناظر امور عامہ عزیزم مرزا بشیر احمد صاحب۔ ناظر بیت المال مکرمی ماسٹر عبدالمغنی صاحب۔ ان کے علاوہ جماعت کی ضروریاتِ افتاء اور قضاء کو مدِّ نظر رکھکر افتاء کے لئے مکرمی مولوی سیّد سرور شاہ صاحب۔ مکرمی مولوی محمد اسماعیل صاحب اور مکرمی حافظ روشن علی صاحب اور قضاء کے لئے مکرمی قاضی امیر حسین صاحب، مکرمی مولوی فضل الدین صاحب اور مکرمی میر محمد اسحٰق صاحب کو مقرر کیا ہے آئندہ جو تغیّرات ہوں گے ان سے احباب کو اطلاع دی جاتی رہے گی۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ احباب ان لوگوں کے کام میں پوری اعانت کریں گے۔ اور سلسلہ کی کسی خدمت سے دریغ نہ کریں گے۔ اللہ تعالےٰ کی رضا کے حصول اور اس کے قائم کردہ سلسلہ کے استحکام کے لئے مجھے یقین ہے کہ سب احباب اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کریں گے اور اس طرح ان کارکنوں کا ہاتھ بٹا کر ثواب کے مستحق ہوں گے اور ان کی تحریرات کو میری تحریرات سمجھیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

خاکسار مرزا محمود احمد"[1]

نظارت بیت المال

آپ نے نئے نظام کے تحت نظارت بیت المال کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"ان کاموں کے علاوہ جن کا تعلق صدر انجمن سے ہے باقی تمام کاموں کے لئے جس قدر روپیہ کی ضرورت پیش آئے اُسے (یہ صیغہ) مہیا کرے۔ اس سے پہلے ہمارے افسروں کا یہ کام ہوتا تھا کہ ان عام کاموں کے لئے جو کچھ کوئی دے جائے یا بھیج دے، وہ لے لیں۔ لیکن جن لوگوں نے کوئی خاص کام کرنا ہو ان کے خزانے دوسروں کی رائے

---

[1] الفضل ۴ر جنوری ۱۹۱۹ء صد ۱-۲

پر نہیں چھوڑے جا سکتے۔ ان کے کارکنوں کا فرض ہے کہ ضرورت کے
مطابق روپیہ بہم پہنچائیں۔ البتہ ایسی حکمت و ترکیب سے وصول کریں،
کہ افراد تباہ و برباد نہ ہوں۔ کیونکہ جماعتیں افراد سے ہی بنتی ہیں اور
وُہ حکومتیں جو افراد کو برباد کر دیتی ہیں کبھی ترقی نہیں کر سکتیں۔"[لے]

نظارت تعلیم

نظارت تعلیم ایک ایسی نظارت تھی جس کے کام کا ایک حصّہ پہلے ہی صدر انجمن احمدیّہ کے سپرد تھا اور تعلیم الاسلام ہائی سکول اور مدرسہ احمدیّہ کا انتظام پہلے سے ہی صدر انجمن احمدیّہ کے زیرِ نگرانی تھا۔ آپ نے صدر انجمن کی اس علیحدہ حیثیت کو برقرار رکھا اور نئی نظارت تعلیم کے سپرد حسب ذیل نئے کام کئے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اس صیغہ کے ذمہ یہ کام ہوگا کہ جماعت کے لڑکوں کی فہرستیں تیار کرائے اور معلوم کرے کہ مثلاً زید کے تین لڑکے ہیں ان کی تعلیم کا کوئی انتظام ہے یا نہیں اور وہ دینی تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں یا نہیں۔ اگر معلوم ہو کہ نہیں تو اُسے لکھا اور سمجھایا جائے کہ اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔

ایسے لوگ خواہ کہیں رہتے ہوں ان کے بچّوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی یہ صیغہ کرے گا اور ممکن سہولتیں مہیّا کرنا اس کا فرض ہوگا اس طرح تمام جماعت کے بچّوں پر اس صیغہ کی نظر ہوگی۔ پھر جو شخص فوت ہو جائے گا اس کی اولاد کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہے۔ اس کے رشتہ داروں نے کچھ کیا ہے یا نہیں۔ اگر کیا ہے تو وہ تسلّی بخش ہے یا نہیں اور کس قدر امداد دینے کی ضرورت ہے۔"[لے]

نیز فرمایا:۔ اس صیغہ کی ذمہ داری جماعت کے عام افراد کو ایسے مسائل سے واقف کرانا بھی ہے جس کے بغیر کوئی مسلمان،

[لے] عرفانِ الٰہی تقریر جلسہ سالانہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۷۷ تا ۸۰۔

مسلمان نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔۔ عورتوں کی تعلیم کو عام کرنا بھی اس صیغہ کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ [1]

دونوں انجمنوں کا ادغام

کچھ عرصہ تک نئی قائم کردہ انتظامیہ (جو نظارت کہلاتی تھی) اور مجلس معتمدین صدر انجمن احمدیہ پہلو بہ پہلو اپنے اپنے دائرہ عمل میں مختلف فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ لیکن ایک لمبے تجربہ کے بعد جب اس میں بعض قباحتیں محسوس ہوئیں تو ۱۹۲۵ء میں آپ نے ان دونوں تنظیموں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا۔ اب جملہ نظارتوں کے ذمہ دار افسر جو ناظر کہلاتے تھے صدر انجمن احمدیہ کا جزو بن گئے اور انتظام کی نئی شکل یہ ابھری، کہ خلیفۂ وقت کے ماتحت صدر انجمن احمدیہ بحیثیت مجلس عاملہ تمام اہم اصولی فیصلوں کی ذمہ دار تھی۔ اور تمام مسائل پر غور و فکر کے بعد اپنی سفارشات آخری منظوری کے لئے خلیفۃ المسیح کی خدمت میں پیش کرتی تھی۔ صدر انجمن احمدیہ کے ایسے ممبران جو مختلف انتظامی شعبوں کے سربراہ ہوتے تھے وہ ناظر کہلاتے تھے۔ ناظر اصولی طور پر صدر انجمن احمدیہ کے ایسے فیصلوں کی روشنی میں کام کرتے تھے جن کو خلیفۃ المسیح کی منظوری حاصل ہو۔ لیکن انتظامی امور میں وہ براہِ راست خلیفۃ المسیح ہی کے ماتحت تھے اور خلیفۃ المسیح کے سامنے جواب دہ تھے اور ان کا انتخاب بھی کلیۃً خلیفۃ المسیح کے منشاء کے مطابق ہوتا تھا۔

صدر انجمن احمدیہ اور نظارتوں کے ادغام کے نتیجہ میں نئی انجمن کی صورت حسب ذیل تھی۔ اس میں مندرجہ ذیل چھ ناظر اور دو بیرونی ممبران مقرر ہوئے۔

ناظر اعلیٰ و بہشتی مقبرہ:۔ حضرت چوہدری نصر اللہ خانصاحبؓ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ (والد محترم حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خانصاحب)

ناظر دعوۃ و تبلیغ:۔ حضرت چوہدری فتح محمد صاحب سیال رضی اللہ عنہ

ناظر بیت المال:۔ حضرت مولوی عبد المغنی خانصاحب رضی اللہ عنہ

ناظر امور عامہ:۔ حضرت مولوی ذوالفقار علی خانصاحب گوہرؔ رضی اللہ عنہ (برادر مولانا محمد علی جوہرؔ بانیٔ تحریکِ خلافت)

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۴

ناظر امور خارجہ :۔ حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ
ناظر ضیافت :۔ حضرت میر محمد اسحٰق صاحب رضی اللہ عنہ۔
بیرونی ممبران :۔ (۱) ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب رضی اللہ عنہ
(۲) ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب رضی اللہ عنہ

رفتہ رفتہ ان نظارتوں کے علاوہ حسب ضرورت صدر انجمن احمدیّہ کے انتظام میں بعض دوسری نئی نظارتوں کا اضافہ اور شعبوں میں ردّ و بدل ہوتا رہا۔ مثلاً نظارت تعلیم کے ساتھ تربیت کو شامل کر کے اس نظارت کا نام تعلیم و تربیت رکھ دیا گیا۔ وہ تمام نظارتیں جو بعد میں مختلف سالوں میں قائم ہوئیں حسب ذیل ہیں :۔

نظارت تجارت و صنعت۔ نظارت تعلیم و تربیت۔ نظارت تالیف و تصنیف۔ نظارت زراعت۔ نظارت خدمتِ درویشان اور نظارت دیوان۔

اس کے علاوہ ان نظارتوں میں بعض اور تبدیلیاں بھی عمل میں لائی گئیں۔ مثلاً نظارت دعوۃ و تبلیغ کو ختم کر کے اس کی جگہ نظارت اصلاح و ارشاد کا قیام عمل میں لایا گیا جس کو تبلیغ کے علاوہ تربیت کا کام بھی تفویض کیا گیا۔ نظارت تعلیم و تربیت سے تربیت کا حصّہ نکال دیا گیا اور ایک مرتبہ پھر ابتدائی شکل کی طرف لوٹا کر صرف نظارت تعلیم بنا دیا گیا۔ اس وقت رائج الوقت نظامِ جماعت میں بعینہٖ یہی تنظیم مصروفِ کار ہے۔

آپ نے اپنے ۵۲ سالہ دَورِ خلافت میں جس عمدگی اور قابلیّت کے ساتھ اس نظام کی نگرانی اور رہنمائی فرمائی اور پیش آمدہ نقائص کو دُور کرتے ہوئے اسے مسلسل رُو بہ اصلاح رکھا اس کی داستان بہت طویل ہے۔ صدر انجمن احمدیّہ کے فیصلوں پر آپ کے ارشادات، علم و حکمت کا خزینہ ہیں جو ہمیشہ جماعت احمدیہ کے نظام کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوتے رہیں گے۔

بسا اوقات آپ مجلس مشاورت کے موقع پر یا بعض دیگر تقاریر اور خطبات میں بھی جماعت کی عمومی تربیت کی خاطر انتظامی امور پر حالات کے مطابق روشنی ڈالتے رہے، اور مختلف نظارتوں کی رہنمائی فرماتے رہے۔ محض نمونے کے طور پر ایسے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

کارکنوں کا انتخاب

"سلسلہ کا اصل ذمہ دار خلیفہ ہے اور سلسلہ کے انتظام کی آخری کڑی بھی خلیفہ ہے۔ خلیفہ، مجلس معتمدین مقرر کرتا ہے اور وہی مجلس شوریٰ مقرر کرتا ہے۔ دونوں مجلسیں اپنی اپنی جگہ خلیفہ کی نمائندہ ہیں...... میں صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ کارکنوں کا انتخاب سوائے خلیفہ کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے انتخابِ کارکنان کے متعلق تو مشورہ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ خلفاء کے وقت میں کبھی اس کے متعلق مشورہ کی پابندی تنظر نہیں آتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت سارے کہتے رہے کہ خالدؓ کو معزول نہ کیا جائے مگر انہوں نے اُن کی بجائے ابو عبیدہؓ کو مقرر کر دیا۔ [1]

نظارت عُلیا

ایک تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے جس نے نظارت عُلیا کو غیر ضروری قرار دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:۔

"دُنیا کی کوئی کانسٹی ٹیوشن ایسی نہیں جس میں کسی ممبر کو سینئر ممبر قرار نہ دیا جائے۔ کہیں اس کا نام وزیر اعظم رکھ لیا جاتا ہے اور کہیں کچھ اور۔ میں نے خصوصیت سے کئی ممالک کی کانسٹی ٹیوشنز کا مطالعہ کیا ہے۔ رشین کانسٹی ٹیوشن میں ایک کو ڈکٹیٹر مقرر کر لیا جاتا ہے۔ امریکن حکومت میں کوئی خاص ممبر مقرر نہیں کیا جاتا۔ مگر اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ پریذیڈنٹ اپنی ذات میں انتظامی طور پر جوابدہ ہوتا ہے اس لئے علیحدہ طور پر پریمیئر مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اب اس میں بھی

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صہ ۴۵

تغیّر کیا جا رہا ہے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کو بھی اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ پس رپورٹ کا یہ حصّہ اصول کے خلاف ہے۔ میرے پاس ہر روز ایسے کاغذات آتے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مَیں کسی ناظر کے پاس نہیں بھیج سکتا۔ آخر مجھے یہی لکھنا پڑتا ہے کہ ناظر اعلیٰ کے پاس جائیں...... ناظر اعلیٰ کا یہ بھی کام ہوتا ہے کہ اگر کوئی ناظر غلطی کرتا ہے، تو ناظر اعلیٰ کو اس کے متعلق رپورٹ کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ کام بہرحال کسی سینیئر ممبر ہی کے سپرد کرنا پڑے گا۔"[1]

نظارت تالیف و تصنیف

"تصانیف ہمیشہ کسی اصول کے ماتحت ہونی چاہئیں۔ ہر سال ایک میٹنگ بُلائی جائے جس میں اس امر پر غور ہو کہ زمانہ کا دماغ کدھر جا رہا ہے۔ اور لوگوں کے خیالات کی رَو کس طرف ہے۔ پھر اس کے مطابق کام ہونا چاہیئے۔ کسی زمانہ میں خالی وفاتِ مسیحؑ کے مسئلہ سے کام ہو جاتا تھا۔ لیکن اب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام پیٹ کے دھندوں کا کیا علاج کرتا ہے امن کے قیام کے لئے وہ کونسی تجاویز پیش کرتا ہے۔ یا کونسی تدابیر ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہو جائے اور اسلام دُنیا پر غالب آجائے۔ چونکہ اب مسلمانوں کو حکومت مل گئی ہے اس لئے نئے نئے سوالات ان کے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں ان سوالات کے متعلق ہماری طرف سے کتابیں شائع ہونی چاہئیں۔ ان امور کے متعلق ابھی کوئی پلاننگ نہیں ہوئی۔ اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ جنہیں لکھنے کا شوق ہے وہ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں کسی معیّن اور واضح سکیم کے ماتحت ان کا کام نہیں ہوتا۔"[2]

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۹۔ [2] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۲

نظارت تعلیم و تربیت

"نظارت تعلیم نوجوانوں کو قومی ضرورتوں کے مطابق تعلیم دلوائے اس غرض کے لئے وہ نوجوانوں کی ذہنیت کا جائزہ لیتی رہے۔ یہ کام تبھی ہو سکتا ہے جب سکولوں اور کالجوں کے طلباء سے رابطہ رکھا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ وہ کس کس لائن میں ترقی کر سکتے ہیں۔

۲۔ یہ محکمہ غرباء کو اُبھارنے کی کوشش کرے۔ مثلاً اگر محکمہ کی طرف سے تحریک کی جائے کہ پندرہ بیس زمیندار مل کر ایک لڑکے کی اعلیٰ تعلیم کا بوجھ اُٹھائیں اور اسے قرضہ کے طور پر ماہوار کچھ وظیفہ دے دیا کریں تو چند سالوں میں کئی لڑکے گریجوایٹ بن سکتے ہیں۔

۳۔ معلّم پیدا کرنا بھی ہمارے اس محکمہ کا کام ہے . . . .

۴۔ سلسلہ کی ضرورتوں کے مطابق مختلف فنون، زبانوں اور کاموں کی تعلیم دلوانا بھی محکمہ تعلیم کے فرائض میں شامل ہے۔

۵۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ جماعت کا ایک ایک مرد ایک ایک بچّہ ایک ایک عورت دین سے اس قدر واقفیت حاصل کرے جو مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے جب تک ایسا نہ ہو، تب تک ترقی نہیں ہو سکتی۔"[1]

ایک اور موقع پر فرمایا۔

"اس سے غرض جماعت کی دینی تعلیم و تربیت ہے۔ علماء بنانا نہیں بلکہ ایسے مسائل سے واقف کرنا ہے کہ جن کے سوائے کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اب کئی عورتیں آتی ہیں جو کلمہ بھی نہیں پڑھ سکتیں اور جب کلمہ نہیں پڑھ سکتیں تو نماز کس طرح

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صـ۲۲

پڑھ سکتی ہوں گی اور جب نماز نہیں پڑھ سکتیں تو مسلمان کس طرح ہو سکتی ہیں اور وہ غرض کس طرح قائم رہ سکتی ہے جو اس سلسلہ کی ہے جبکہ یہ حالت ہے نماز کوئی ٹونہ نہیں بلکہ با ترجمہ آنی چاہیئے۔ کیونکہ جو ترجمہ نہیں جانتا وہ سمجھ کہاں سکتا ہے اور معارف پر غور کہاں کر سکتا ہے اور جسے یہ بات حاصل نہیں وہ خدا سے تعلق کس طرح پیدا کر سکتا ہے اس کے بغیر تو یہ ناٹک ہے کہ تماشا کے طور پر ادا کی جاوے۔ ہم جلسے اور انجمنیں کرتے ہیں۔ مگر کیا نبی اسی لئے آتے ہیں۔ یہ تو اَور لوگ بھی کر لیتے ہیں ہماری غرض اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ہمارا ایک ایک مرد ایک ایک بچہ اور ایک ایک عورت اس قدر واقفیت دین سے رکھے جو مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو تب تک ترقی نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ بعض خاص آدمی اپنی ریاضت سے آگے نکل جائیں۔ مگر جماعتیں اسی لئے بنائی جاتی ہیں۔ کہ سارے مل کر ترقی کریں۔ اگر ساری جماعت ترقی نہ کرے تو پھر کیا ضرورت ہے چندہ جمع کرنے کی۔ اور کیا ضرورت ہے کانفرنس اور جلسوں کی۔ تو تعلیم و تربیت سے یہ مراد ہے کہ ہر احمدی کو ظاہری علوم کا اتنا حصّہ سکھا دیا جاوے کہ اُسے آئندہ ترقی کی بنیاد قرار دے سکیں .... دوسری چیز اس سے اُوپر اخلاقی تربیت تھی .... تبلیغ کے رستہ میں بھی اتنی روکیں نہیں جتنی تربیت کے رستہ میں ہیں۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا سچا ہونا چونکہ احمدی خود سمجھتے ہیں اس لئے دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں لیکن اخلاق سے چونکہ خود واقف نہیں اس لئے دوسروں کو سکھلا نہیں سکتے۔ اور موٹی موٹی باتیں مثلاً غیبت بد اخلاقی کیا ہوتی ہے یہ بھی نہیں جانتے اور مذاق اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ اوّل تو اخلاق سکھانا ضروری

ہے۔ پھر اس پر عمل کرانا۔ کہتے ہیں کوئی ہندو مسلمان ہوگیا تھا۔ جب کبھی کوئی بات ہوتی تو رام رام کہتا۔ جب پوچھا گیا تو کہنے لگا رام نکلتے ہی نکلیگا یہی حالت ہماری جماعت کی ہے۔ ابھی اخلاق کو سمجھے نہیں مگر جب سمجھائیں گے تو پھر بھی عمل کرتے وقت بھول جائیں گے اس لئے مشق کرانے کی ضرورت ہوگی۔ مَیں نے ابھی تجربہ کیا ہے۔ لاہور سے واپس آتے وقت مَیں ریل میں لیٹ گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ ایک صیغہ کے اعلیٰ رُکن کی ایک ریل والے سے لڑائی شروع ہوگئی۔ مَیں چُپ سُنتا رہا کہ دیکھوں کس طرح گفتگو ہوتی ہے۔ کوئی بیس منٹ تک جھگڑا ہوتا رہا۔ اس ساری لڑائی میں وہ کارکن بہت بڑی غلطی میں مبتلا اور ناحق پر تھا۔ اور باوجود اس کے بداخلاقی سے کام لے رہا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس وہ معاملہ فیصلہ کے لئے آتا تو مَیں اس کے خلاف فیصلہ کرتا۔ تو وہ باوجود اخلاق کو جاننے کے اُن کے خلاف کر رہا تھا اور عمل کے وقت پورا نہ اُتر رہا تھا۔ پس اوّل ہمیں یہ بتانا ہے کہ اخلاق کیا ہیں اور جب یہ بتادیں تو یہ بتانا ہوگا کہ ان کے قوعد کیا ہیں اور یہ بھی بتا دیں تو موقع پر استعمال کرانا ہوگا۔ جب تک یہ نہ ہو اخلاق کی تربیت نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک آدمی کو سکھانا بھی بڑا مشکل کام ہے کجا یہ کہ جماعت کے ہر فرد کو سکھائے جاویں اور ابھی تک تو بڑے بڑے آدمی بھی نہیں استعمال کر سکتے کجا یہ کہ جنگلی احمدی بھی استعمال کریں۔ سب کے تربیت یافتہ ہونے کا خیال اتنا بڑا ہے کہ ذہن میں لاتے ہوئے دل ڈرتا ہے کہ کیا ایسا ہوگا۔ مگر کرنا ہے کیونکہ ہمارا فرض ہے۔

پھر رُوحانیت کی تعلیم ہے۔ اخلاقی تعلیم کے بعد اس کا درجہ شروع ہوتا ہے۔ رُوحانی تعلیم سے باطن کی صفائی ہوتی ہے۔ لوگ موٹے موٹے مسائل سے واقفیت نہیں رکھتے مثلاً آدابِ خلیفہ اور

شیخ کیا ہیں۔ خدا سے کیا تعلق ہوتا ہے کس طرح محسوس کرے کہ خدا سے اُسے تعلق ہو گیا۔ یہ باتیں تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتی ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ نہ صرف ان سے ناواقف ہیں بلکہ ان میں سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ان باتوں کے حاصل کرنے کا کوئی انتظام ہونا چاہیئے۔ قادیان کے سنجیدہ لوگوں سے مَیں نے سُنا ہے کہ ان صیغوں کی کیا ضرورت ہے۔ تو کام کرنا تو الگ رہا ان کے متعلق سوال بھی نہیں پیدا ہوتا کہ ایسا ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے بڑی جد و جہد کی ضرورت ہے۔ پھر یہ ہمیں موجودہ نسل ہی کی اصلاح نہیں بلکہ یہ بھی کرنا ہے کہ آئندہ نسلوں کی حفاظت کا بھی انتظام کریں۔ لیکن اگر سلسلہ کا انتظام اعلیٰ چٹان پر قائم نہیں تو اگر آج نہیں تو کل اس کی موت ہو جائے گی۔ پھر ہماری جماعت کا فائدہ کیا ہوا۔ جس طرح آئیڈیل مَین (یعنی مثالی انسان۔ ناقل) کہتے ہیں اسی طرح چاہیئے کہ ہم آئیڈیل مسلم بنائیں اور یہ کوشش کریں کہ ہر ایک احمدی ایسا ہو۔ اور جو آئندہ پیدا ہو۔ وہ بھی ایسا ہی ہو بلکہ یہ کہ آئندہ نسلیں بڑھ کر ہوں۔ کیونکہ اگر اگلی نسل میں ترقی نہ ہو تو تنزّل شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت مَیں چند موٹی موٹی باتیں بتاتا ہوں۔ ان کو یاد رکھو۔ بعض لوگ تمسخر میں قرآن کی آیتیں پڑھ دیتے ہیں یا دوسرے کہہ دیتے ہیں یہ مولوی جو ہوئے ایسی باتیں کر دیتے ہیں گویا دین کی وقعت بٹھانے کی بجائے بُرا اثر ڈالا جاتا ہے اور آئندہ نسلوں پر اس کا بُرا اثر ہونا لازمی ہے۔ اس قسم کی باتوں کا اس قدر اثر ہوتا ہے کہ مجھے اپنے بچے کو مارنا بھی پڑا۔ ایک بھائی نے ہنسی کی دوسرے بھائی پر کہ تُو مولوی ہے کہ قرآن حفظ کرتا ہے۔ مَیں نے اس کو مدرسہ انگریزی میں داخل کیا تھا اس سے پہلے اس نے کبھی یہ نہ کہا تھا اس لئے معلوم ہوا کہ مدرسہ سے ایسا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا اس پر

مجھے اُسے مارنا پڑا کہ مولوی ہونا کونسی ہنسی کی بات ہے۔ ہمارا تو فرض ہے کہ جو دین کے لئے تیاری کرتا ہے اس کا زیادہ ادب و لحاظ کریں اُسے اپنا سردار سمجھیں۔ خدمتِ دین کرنے والوں کی عزّت کریں۔ مگر ابھی تو یہ حالت ہے کہ ایک دُنیاوی اعلیٰ پوزیشن والے کی بات دین کے معاملہ میں بھی اس کی نسبت زیادہ توجّہ سے لوگ سُنتے ہیں جو دین کا کام کرنے والا ہے۔

پھر مومن میں بڑی جرأت ہونی چاہیئے۔ مومن کو کسی چیز کی پرواہ نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں ذرا افسر ناراض ہو تو بڑی مصیبت آجاتی ہے۔ ایک نے لکھا کہ افسر ناراض ہو گیا ہے۔ اب مَیں کیا کروں۔ مَیں نے کہا۔ کیا ہؤا کیا افسر خدا ہے۔ مومن کا کام یہ ہے کہ ساری دنیا کو حقیر سمجھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کا ادب نہ کرے۔ ادب کرے مگر کسی سے ڈرے نہیں۔ دلیر ہو۔ تو مومن کو جرأت و دلیری پیدا کرنی چاہیئے۔ جوش پر قابو پانا چاہیئے۔ دیانت حق کی محبّت۔ بے رعایتی۔ سچی شہادت دینا۔ بدی کے مٹانے کا احساس رکھنا۔ محبّتِ عامہ رکھنا۔ زبان کو پاک رکھنا۔ یہ بہت سے اخلاق ہیں بلکہ سینکڑوں ہیں۔ مگر بہت سے لوگ واقف نہیں۔ اگر واقف ہیں تو ان کی کیفیت معلوم نہیں۔ ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک ایک مرد کا ایک ایک عورت کا ایک ایک بچّے کا۔ جب تک ان کی طرف خیال نہیں ہوگا۔ تعلیم و تربیت کا صیغہ اپنے کام میں ناقص ہوگا۔

پھر عورتوں کی تعلیم ہے اس کی طرف توجّہ نہیں۔ اس کے لئے ضروری انتظام کرنا ہے۔"[1]

نظارت امُورِ عامہ

"اُمورِ عامہ۔ قضا اور احتساب کا صیغہ ضروری ہے جو ہر جگہ ہونا

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صـ۲۳ تا صـ۲۷

چاہیئے کیونکہ یہاں کے صیغہ والے کس طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ لاہور میں سارے احمدی نماز باقاعدہ پڑھتے ہیں یا نہیں۔ یا تو نوکر رکھیں جو انہیں پتہ دیں مگر روپیہ کہاں سے لائیں اس لئے ضروری ہے کہ ان دفاتر کی شاخیں ہر جگہ ہوں اور ان کے ذریعے کام کیا جاوے اب چندہ کے لئے تو سارے جمع ہو جاتے ہیں لیکن یہ ہو کہ خطبہ کے روکنے کے لئے یا گالیاں بند کرنے کے لئے مشورہ کرنا ہے تو جمع نہیں ہوتے حالانکہ یہ بہت اہم باتیں ہیں۔ تو ہر جگہ قضا۔ امور عامہ اور احتساب ہو مثلاً امور عامہ کا کام ہے کہ سرکاری افسروں کو جماعت کے معاملات سے واقف کریں۔ اگر ہر جگہ ایسے آدمی ہوں جن کو مقرر کیا جاوے تو جماعت کی بہت سی مشکلات دُور ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ لوگ افسروں سے اپنی ملاقاتوں کو ذاتی فوائد کا ذریعہ نہ بنائیں اور اگر کوئی ایسا کرے تو اسے ہٹا دیا جاوے اور دوسرے کو مقرر کر دیا جاوے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے لئے لوگ کہتے ہیں کہ کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اگر وہاں بھی ایسا انتظام ہو جیسا کہ یہاں ہے تو جو لوگ اپنی قوم کے خیال سے رشتہ نہیں کرتے یا بڑے چھوٹے کو دیکھتے ہیں انہیں سمجھا سمجھا کر آپس میں رشتہ کرا دیں تو یہاں اتنا کام نہ بڑھے اسی طرح لڑائی جھگڑے ہیں اُن کا خیال رکھنا ہے۔ لین دین ہے۔" [1]

نظارت زراعت

"مَیں نے احمدی زمینداروں کو توجہ دلائی تھی کہ وہ بیدار رہوں اور زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانے کی کوشش کریں اس سلسلہ میں صدر انجمن احمدیہ کو چاہیئے کہ وہ ایک نظارت زراعت قائم کرے جس کے افسر تمام زرعی علاقوں کا دَورہ کر کے زمینداروں کی مناسب رہنمائی کریں کہ کس کس علاقے میں کس کس چیز کی فصل ہونی چاہیئے

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صہ ۲۷

اور پیداوار کو بڑھانے کے لئے کون سے ذرائع استعمال کرنے چاہئیں اسی طرح جہاں جہاں بڑی جماعتیں ہوں وہاں زراعتی سوسائٹیاں بنائی جائیں تاکہ وہ باہمی مدد اور تعاون کے ساتھ کام کر سکیں۔ اگر ایسا ہوجائے تو امید ہے ہمارے زمینداروں کی اخلاقی اور دینی حالت پر گہرا اثر پڑے گا اور جماعت کی آمد بھی بڑھے گی۔" [1]

نظارت تجارت

"یاد رکھو ہر وہ تجارت یا صنعت یا ملازمت جو قوم کے اکثر افراد کے ہاتھوں میں آجاتی ہے اُسے کوئی دشمن تباہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وُہ فرد کے ہاتھ سے نکل کر قوم کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہوتی ہے۔

اگر ہمارے آدمی مختلف فن سیکھ کر کافی تعداد میں ایک ایک پیشہ میں کام کر رہے ہوں تو مخالف ہمیں نکال نہیں سکتے۔ وہ اسی وقت نکال سکتے ہیں جب ہمارے افراد خال خال ہوں۔ یہی حال تاجروں کا ہے۔ اگر وہ مختلف مقامات پر چھائے ہوئے ہوں اور اپنی تجارت کو فروغ دے کر ارد گرد پھیلتے جائیں تو ان کا بائیکاٹ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر وہ ان کا بائیکاٹ کریں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنے فوائد کو آپ قربان کر دیں۔ دنیا میں کون ایسا احمق ہے جو اس شاخ کو کاٹنا شروع کر دے جس پر خود بیٹھا ہؤا ہو۔ پس جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں ایسے اصول یقیناً اختیار کئے جا سکتے ہیں جن سے کام کو وسیع طور پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ صرف اسی لئے کہ ہمارے تاجر کمپنیاں بنا کر کام کرنے کے عادی نہیں ان کی تجارت وسیع نہیں ہوتی۔ اجتماعی ضرورت کی وجہ سے ہی ایک لمبے عرصے سے یورپ و امریکہ تجارت پر چھائے ہوئے ہیں۔ فرد کبھی لمبی تجارت کر ہی نہیں سکتا۔ آخر ایک نہ ایک دن وہ ٹوٹ جاتی ہے۔"

---

[1] تقریر جلسہ سالانہ ۱۹۵۵ء و رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۶ء صفحہ ۶۸

اسی لئے کمپنیاں بنا کر تجارت کرنا ہی تجارت کا کامیاب طریق ہے۔
میر محمد اسحٰق صاحبؓ جو بڑے ذہین آدمی تھے ایک دفعہ بمبئی کے بڑے بڑے بوہرہ تاجروں سے ملے۔ وہ مذہباً شیعہ ہیں۔ مگر تجارت میں اُن کو بڑا غلبہ حاصل ہے۔ ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کو جو طاقت حاصل ہے اس کی وجہ کیا ہے اور وہ کونسا گُر ہے جو تمہاری اس ترقی کا باعث ہے انہوں نے کہا ہم نے اپنی جتھہ بندی اس رنگ میں کی ہوئی ہے کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مثلاً ہم میں سے ایک شخص کا دیوالیہ نکل جانے تو جب ہمیں اس کا علم ہوتا ہے تو ہم اُسے بُلا کر کہتے ہیں آج سے ہم فلاں چیز اپنی تمہیں دیتے ہیں اس کی تجارت کرو۔ جب ہمارے پاس کوئی گاہک آئے گا تو ہم اسے تمہارے پاس بھجوا دیا کریں گے چنانچہ کمیٹی بیٹھتی ہے اور فیصلہ کر دیتی ہے کہ آج سے کسی بوہرے نے تیل یا صابن یا ماچس فروخت نہیں کرنا۔ وہ ہول سیل تاجر ہیں۔ اس وجہ سے چند دن یا چند ہفتوں میں ہی لاکھ دو لاکھ روپیہ وہ کما لیتا ہے۔" [1]

نظارت ضیافت

فرمایا:۔ "یہ وہ کام ہے جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام خود کرتے رہے اور آپ نے اسے سلسلہ کا بہت اہم کام قرار دیا۔ اگر دوسرے کام مجھے اجازت دیتے اور لوگ اعتراض نہ کرتے کہ خلیفہ روپیہ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے تو وہ کام جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام خود کرتے رہے ہیں خود اسے اپنے ہاتھ میں رکھتا یہ کام اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ہر طبقہ کے اور ہر قسم کے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اُن سے ملاقات اور ان کے لئے

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۶ تا ۴۲

ضروری انتظام کوئی معمولی شخص نہیں کر سکتا۔ اور جو شخص یہاں جماعت کے مہمان کی حیثیت سے آتا ہے اُسے ریسیو کرنے والا ناظر ہونا چاہیئے۔ میری غیرت برداشت نہیں کر سکتی کہ اس صیغہ کو نظارت کے درجہ پر نہ رکھوں۔ مَیں تو اپنی زندگی میں اس کام کے انچارج کا نام ناظر ہی رکھوں گا۔ پیچھے معلوم نہیں کیا ہو۔" [1]

نظارت بہشتی مقبرہ

اس نظارت کے متعلق فرمایا:۔

"مقبرہ بہشتی کا ناظر مقرر کرنے کی بھی یہ وجہ ہے کہ یہ صیغہ خدا تعالیٰ کے الہام کے ماتحت حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے مقرر کیا۔ اور اس کے لئے جو کمیٹی بنائی اسے ایسے اختیارات دیئے کہ آج تک ان کو پیش کر کے غیر مبائعین ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے پس اس صیغہ کے لئے جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے الہامِ الٰہی سے بنایا مَیں نے آنریری ناظر رکھ دیا ہے۔ اس صیغہ کے وقار کے لئے۔ کیونکہ یہ اہم صیغہ ہے اور خدا تعالیٰ کے الہام سے مقرر کیا گیا ہے۔" [2]

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء۔ [2] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۷۱

انٹرنیشنل انجمن

فرمایا:۔

"باہر سے نوجوانوں کو یہاں آنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ مختلف ممالک کے لوگ یہاں آئیں اور انجمن کا کام سنبھالیں تا ہماری مرکزی انجمن انٹرنیشنل انجمن بن جائے۔ صرف پاکستانی نہ رہے۔ بعض لحاظ سے بے شک پاکستان کے لوگ دوسروں پر فوقیت رکھتے ہیں لیکن اگر ان کے ساتھ ایک ایک ممبر نائیجیریا۔ گولڈ کوسٹ۔ امریکہ۔ مشرقی افریقہ۔ ہالینڈ جرمنی اور انگلینڈ وغیرہ ممالک کا بھی ہو تو کام زیادہ بہتر رنگ میں چل سکتا ہے۔ جب یہ لوگ یہاں آکر کام کریں گے تو باہر کی جماعتوں کو اس طرف زیادہ توجہ ہو گی اور وہ سمجھیں گے کہ مرکز میں جو انجمن کام کر رہی ہے وہ صرف پاکستان کی جماعتوں کی انجمن نہیں بلکہ ہماری بھی انجمن ہے۔"

خطبہ جمعہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

(الفضل ۲۵ر نومبر ۱۹۵۵ء)

صدر انجمن احمدیہ کی رہنمائی

اور

اس کی سفارشات پر حضور کے فیصلے کا طریق

صدر انجمن احمدیہ کے اجلاسات میں جو فیصلے بھی کئے جاتے ہیں وہ ایک سفارش کا رنگ رکھتے ہیں جو حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں منظوری کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

حضرت مصلح موعودؓ کا عام دستور یہ تھا کہ صدر انجمن احمدیہ کی اکثر سفارشات حضور منظور فرمالیا کرتے لیکن ہر سفارش کا بڑی باریک نظر سے مطالعہ فرماتے اور جس سفارش کو نامناسب سمجھتے اُسے ردّ کرتے ہوئے نہایت معقول اور ٹھوس استدلال کے ساتھ ردّ کرنے کی وجہ بھی ضبطِ تحریر میں لاتے۔ بالخصوص حضور ایسے فیصلوں کو ردّ فرما دیا کرتے جن سے کمزور اور ماتحت کارکنان کے حقوق کی پامالی کا خدشہ ہوتا۔ اسی طرح بعض اوقات کسی ضرورت کو محسوس فرما کر صدر انجمن کو یہ ہدایت فرماتے کہ فلاں مصلحت یا ضرورت کے پیشِ نظر اس قسم کا قاعدہ بنایا جائے۔

صدر انجمن کے مطاع کی حیثیت سے آپ نے مندرجہ بالا طریق پر صدر انجمن کی جو رہنمائی فرمائی اس کا مطالعہ حضور کی بالغ قوتِ فکر و نظر کا جائزہ لینے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ صدر انجمن کے ریکارڈ میں سے محض چند نمونے ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں

ناظروں کے وقار کو قائم کرنے - اور ان کے عہدہ کے پیشِ نظر فیصلہ فرمایا:۔

> "صدر انجمن کو چاہیئے کہ ناظروں کے گریڈ اصولی طور پر ۵۰۰ روپیہ تک قرار دے اور یہ نوٹ بھی دے دے کہ چونکہ اس قدر رقم ماہوار دینے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے فی الحال یہ گریڈ دیئے نہیں جاسکیں گے۔
>
> اس طرح ناظر صاحب اعلیٰ کا گریڈ ۱۰۰+۵۰۰ اسی طرح پر رکھا جائے اور اسے ریکارڈ کیا جائے۔ اس کو بجٹ قابلِ اشاعت میں دکھانے

کی ضرورت نہیں۔ اصولی قاعدہ بنا دیا جائے۔"

(ریزولیوشن نمبر ۲۰۸ ۳۴-م/۴-۱۲-۵۴ صدر انجمن احمدیہ پاکستان)

صدر انجمن احمدیہ کے جو کارکن پنشن لینا اختیار کرتے تھے اگر وہ دَورانِ ملازمت فوت ہوجاتے تو قواعد کے مطابق ان کے ورثاء کو صرف کارکن کا جمع شدہ پراویڈنٹ فنڈ ملتا تھا۔ حضور نے ورثاء کی امداد کا خیال کرتے ہوئے یہ قاعدہ بنانے کا ارشاد فرمایا۔

"صدر انجمن کا جو کارکن دَورانِ ملازمت فوت ہوجائے۔ اُسے
پراویڈنٹ فنڈ پورا یعنی انجمن کے حصہ سمیت ملے اور جو زندگی میں
پنشن لیں۔ انہیں پنشن ملے۔"

(ریزولیوشن نمبر ۱۸۵/۱-۴-۴۴ صدر انجمن احمدیہ)

کارکنان کو سلسلہ کے کاموں کے سلسلہ میں باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ ان کے اہل وعیال کی خبر گیری کے لئے یہ قاعدہ بنوایا۔

"جب کسی صیغہ کی طرف سے کوئی کارکن یا غیر کارکن باہر بھجوایا
جائے تو اس صیغہ کا فرض ہوگا کہ صدر محلہ کے ذریعہ سے براہِ
راست ایسے کارکن یا کارکنوں کے اہل وعیال کا پُرسانِ حال رہے
اور اس بات کا خیال رکھے کہ ایسے باہر جانے والے کارکُن کی
غیر حاضری میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔"

(قواعد صدر انجمن احمدیہ ایڈیشن ۱۹۳۸ء۔ قاعدہ نمبر ۴۲۶/الف)

صدر انجمن احمدیہ نے حسب ذیل قاعدہ منظور کرکے جب حضرت المصلح الموعودؓ کے حضور بغرضِ منظوری پیش کیا۔ کہ

"اگر کسی قاعدہ کی تشریح میں اختلاف ہو تو ناظر اعلیٰ کی تشریح
اس وقت تک کہ صدر انجمن احمدیہ کوئی فیصلہ صادر نہ کرے۔
آڈیٹر کے لئے واجب التعمیل ہوگی۔"

حضور نے اس قاعدہ کو نامنظور کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"اس صورت میں آڈیٹر کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔"

کسی نجی ملازم نے شکایت کی کہ اسے مالک نے بلا نوٹس الگ کر دیا ہے۔ اس پر

الزام بھی کوئی نہیں۔ تو حضور نے اس شکایت کے انسداد کے لئے جس میں مالک اور ملازم دونوں کے حقوق کی حفاظت ہے یہ قانون نافذ فرمایا:۔

"جو شخص لمبے عرصہ کے لئے بمشاہرہ ملازم ہو اس کو فوراً بلا نوٹس الگ کر دینا درست نہیں۔ اس لئے یہ اصولی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کہ تاوقتیکہ کوئی معاہدہ اس کے خلاف نہ ہو تو اگر کوئی شخص متواتر چھ ماہ یا اس سے زائد عرصہ تک کسی کا ملازم ماہوار تنخواہ پر رہا ہو۔ تو اس کو کم از کم پندرہ دن کا نوٹس یا پندرہ دن کی تنخواہ دی جاتی ضروری ہے۔ اس طرح ایسا ملازم بھی اگر پندرہ دن کا نوٹس دیئے بغیر یا پندرہ دن کی تنخواہ کٹوائے بغیر چلا جائے۔ تو اسے مجبور کیا جائے گا کہ یا وہ دوبارہ ملازمت اختیار کر کے پندرہ دن کا نوٹس دے کر الگ ہو۔ یا پندرہ دن کی تنخواہ کے برابر رقم مالک کو ادا کرے۔ اگر علیحدگی کے عرصہ میں مالک کوئی اور ملازم رکھ چکا ہو تو اس صورت میں رقم کی ادائیگی ضروری ہوگی پندرہ دن کی ملازمت اختیار کرنے کا اختیار زائل ہو جائے گا یہ قاعدہ صرف احمدی ملازمین کے متعلق ہے۔ دوسرے چونکہ ہمارے تابع فرمان نہیں۔ اس لئے ہم ان سے اپنی جماعت کے حقوق نہیں دلوا سکتے۔ پس ان کے حقوق کے متعلق بھی ہماری قضاء کوئی دعویٰ سننے کی مجاز نہیں۔"

(ریزولیوشن نمبر $\frac{۳۲۰}{۱۰۔۱۱۔۲۹}$ قواعد صدر انجمن احمدیہ ایڈیشن ۱۹۳۸ء)

۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ صدر انجمن احمدیہ کے ایک قاعدہ کی عبارت حضرت المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے حضور پیش ہوئی جو یہ تھی:۔

"اگر کوئی شخص انجمن کے کسی صیغہ میں کارکن رہ کر برخاست یا مستعفی ہوا ہو۔ تو دوبارہ اس کا تقرر برخاستگی کی صورت میں بغیر منظوری مجلس نہیں ہو سکتا۔ اور استعفیٰ کی صورت میں ضروری ہوگا کہ جس افسر کے ماتحت وہ استعفیٰ کے وقت تھا بغیر اس کی

رائے حاصل کرنے کے نہ رکھا جائے سوائے اس کے کہ رائے لینا ناممکن ہو۔ اسی طرح کوئی شخص جو گورنمنٹ یا کسی ریاست یا بورڈ یا کمپنی وغیرہ کے کسی صیغہ کی طرف سے برطرف ہوا ہو۔ اس کو بغیر صدر انجمن کی خاص منظوری کے نہیں رکھا جائے گا۔ ایسی منظوری کے حصول میں یہ صراحت کرنی ضروری ہو گی کہ یہ شخص گورنمنٹ وغیرہ کی ملازمت سے برطرف شدہ ہے اور ایسے استعفے جو برطرفی کے قائم مقام ہیں۔ اُن کے متعلق بھی یہی قاعدہ چسپاں ہو گا۔"

(قواعد صدر انجمن احمدیہ ایڈیشن ۱۹۳۰ء قاعدہ نمبر ۱۳۰۱)

اس پر حضور نے مندرجہ ذیل ارشاد فرمایا:۔

"یہ نادرست ہے اس میں استعفے والا حصہ ظالمانہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ استعفے بعض دفعہ سزا سے بچنے کے لئے ہوتا ہے۔ تو افسر استعفے کو نامنظور کر کے کارروائی مکمل کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے فرض کو ادا نہیں کرتا تو اس کی سزا کارکن کو کیوں ملے۔ برخاستگی کی صورت میں بھی غیر معیّن قید لگائی گئی ہے۔ برخاستگی باقاعدہ ہونی چاہیئے کہ بوجہ ناپسندیدہ حالات کے برخاست کیا گیا ہے۔ اگر اس قسم کی برخاستگی ہو تو بغیر منظوری انجمن نوکر نہ رکھا جائے۔ لیکن اس صورت میں ملازم کو اپیل کا حق ہونا چاہیئے۔ اگر عام برخاستگی ہو جیسے سُست آدمی مل جاتا ہے۔ اور ایسی ہی صورتوں میں کوئی وجہ نہیں کہ انجمن سے منظوری لی جائے۔

بہر حال جب زیر الزام برخاست ہو۔ تو اپیل کا حق ہونا چاہیئے اور صراحتًا اس کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اور انجمن کو اس کی اطلاع باقاعدہ اور فورًا دی جانی چاہیئے۔"

(ریزولیوشن ۳۲۰ / ۱۴-۵-۲۷ صدر انجمن احمدیہ)

کارکنان کے حقوق کی حفاظت اور قدر دانی

تجویز:۔ جب کوئی کارکن بالا افسر کے پاس کسی فیصلہ کی اپیل کرے۔ تو درمیانی افسر کو حق نہیں کہ وہ اسے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک اپنے پاس روک رکھے۔ اس عرصہ میں بہرحال اسے اپنی رپورٹ پیش کر دینی چاہیئے۔

حضور نے فرمایا:۔

اس بارہ میں ہمارا تجربہ بہت تلخ ہے۔ میرے پاس کئی شکایات پہنچی ہیں کہ صدر انجمن کارکنوں کے کاغذات کو ناواجب طور پر روک لیتی ہے بعض کاغذات تو میرے سامنے سال سال اور ڈیڑھ ڈیڑھ سال بعد لائے گئے ہیں اور اس تاخیر کی وجہ کوئی نہیں سوائے اس کے کہ وہ اسے چونکہ اپنے خلاف سمجھتی ہے اس لئے نہیں چاہتی، کہ پیش ہوں حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ اس کے خلاف ہی فیصلہ ہو مثلاً یہی واقعہ جو مرزا ناصر احمد صاحب نے پیش کیا ہے اگر یہ میرے سامنے پیش ہوتا تو یقیناً ناصر احمد کے خلاف فیصلہ کرتا۔ کسی کارکن کو یہ حق نہیں کہ کہے مَیں فلاں حکم کی تعمیل نہیں کرتا۔ ہاں وہ یہ لکھ سکتا ہے کہ چونکہ مجھے اپیل کا حق ہے اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ میری اپیل منظور ہو گی اس لئے مَیں سمجھتا ہوں کہ مجھے حق ہے کہ اپیل کے فیصلہ تک اس کی تعمیل نہ کروں۔ اگر میری یہ رائے صحیح نہیں تو مجھے بتا دیا جائے کہ مَیں حکم کی تعمیل کروں۔ لیکن جو الفاظ بیان کئے گئے ہیں وہ بغاوت کا رنگ رکھتے ہیں اس کاغذ کو روک رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی سوائے اس کے کہ نظارت نے سمجھا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے........ یہ سخت افسوس کی بات ہے۔ بہرحال کارکنوں کے کاغذات کو اتنا اتنا عرصہ تک دبا چھوڑنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

میرے پاس تو جو کاغذات محکمانہ رنگ میں اپیل کے آتے ہیں

انھیں کسی تجربہ کار احمدی افسر کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ اسی طرح کا ایک کیس آیا اور مَیں نے بابو عبدالحمید صاحب شملوی کے پاس بھیجا انہوں نے رپورٹ اس کارکن کے حق میں کی۔ لیکن مجھے معلوم ہے۔ کہ وہ کارکن دو سال معطل رہا۔ اتنا عرصہ غرباء کو معطل رکھنا بہت بڑا ظلم ہے وہ بیچارہ نہ کہیں اَور نوکری کر سکتا ہے اور نہ کوئی کام کر سکتا ہے۔ اور جو کچھ پونجی تھوڑی بہت ہوتی ہے وہ فیصلہ کے انتظار میں بیٹھ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں اس تجویز کو منظور کرتا ہوں۔" (رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۴۹ء صـ۳۴-۳۵)

ناظروں کی رہنمائی

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا طریق کار یہ تھا کہ روزمرّہ کے انتظامی امور میں ناظروں کو بُلوا کر براہِ راست ہدایات دیتے تھے۔ اور ان کے کام کی خود نگرانی فرماتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ جماعتی تربیت کی خاطر بعض اوقات پبلک تقاریر میں بھی ناظروں کی اس رنگ میں رہنمائی فرماتے کہ جماعت بھی سلسلہ کے انتظامی طریق کار سے آگاہ ہو جائے اور آئندہ سلسلہ کو تربیت یافتہ کارکنان مہیا ہونے میں مدد ملے۔ اس ضمن میں حضور کے بعض ارشادات پیشِ خدمت ہیں:۔

۱۔ "میرے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ ناظروں کو اس بات کی مشق ہو کہ اپنے خیالات کی اہمیت لوگوں پر ثابت کر سکیں۔ مَیں نے بارہا بتایا ہے کہ کام کرنے والے کا یہی فرض نہیں کہ خود کام کر سکے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کی توجہ اور امداد اپنے کام کے لئے حاصل کر سکے۔ اس لئے ناظروں کے فرائض میں سے ایک یہ بھی فرض ہے کہ عمدگی کے ساتھ تقریر کرنے اور مشکل امور کو سہل الفاظ میں لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔"[۱]

۲۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو قوم اپنا وقار قائم رکھنا چاہتی ہے اس

---

[۱] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۵ء صـ۱۷

کے لئے ضروری ہے کہ اپنے معززین کا احترام کرے۔ میں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ ایک ناظر، محصّل کی طرح جائے بلکہ اس کا واجب احترام کرنا ضروری ہوگا کیونکہ وہ خلیفہ کا نائب ہوتا ہے۔ ضروری ہوگا کہ جس صیغہ کا ناظر کہیں جائے وہاں کی جماعت میں اس صیغہ کا جو انچارج ہو وہ اسے ریسیو کرے۔ پہلے سے جلسہ کا انتظام کر دیا گیا ہو اور جماعت کو ایک جگہ جمع کرنے کا انتظام ہو چکا ہو"۔

۳۔ سب سے بڑا نقص مجلسِ معتمدین کا یہ ہے کہ اس کے قواعد کی پابندی نہیں ہوتی۔ اور جب کسی فیصلہ کے متعلق پکڑا جاتا ہے کہ اس پر عمل کیوں نہیں ہوا تو کہا جاتا ہے عمل نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں اگر عمل نہیں ہو سکتا تو اُسے منسوخ کر دیا جاتا یہ کیا صورت ہے کہ قاعدہ تو موجود ہو مگر کہا جائے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ بہت بڑا نقص ہے"۔

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۲-۲۶ و مشاورت ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۶)

"ناظروں کا فرض ہے کہ جو لوگ اُن سے ملنے آئیں ان سے عزّت اور احترام سے پیش آئیں۔ مَیں خود بھی کونے میں بیٹھنے والا شخص نہیں ہوں۔ ہر روز دس پانچ بلکہ بیس تیس اشخاص مجھ سے ملنے آتے ہیں جن میں غریب سے غریب بلکہ سائل بھی ہوتے ہیں لیکن جیسا اعزاز بڑے سے بڑے آدمی کا کرتا ہوں ویسا ہی چھوٹے کا بھی کرتا ہوں۔ مثلاً حکومت کے عہدہ کے لحاظ سے ہماری ہندوستان کی جماعت میں چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب سب سے بڑے عہدیدار ہیں لیکن اُن کے آنے پر بھی مَیں ان کا استقبال اسی طرح کرتا ہوں جس طرح ایک غریب کے آنے پر۔ اور مَیں اس بارہ میں چوہدری صاحب اور ایک غریب کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسی طرح چوہدری صاحب کو کھڑا ہو کر ملتا ہوں جس طرح ایک غریب آدمی کو اور پہلے اُسے بٹھا کر پھر خود بیٹھتا ہوں بعض غریب آدمی اپنے اندازہ سے زمین پر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ مگر

مَیں نہیں بیٹھنے دیتا اور ان سے کہہ دیتا ہوں کہ جب تک آپ نہ بیٹھیں گے مَیں بھی کھڑا رہوں گا۔ بعض دفاتر کے چپڑاسی آتے ہیں اور وہ زمین پر بیٹھنا چاہتے ہیں مگر مَیں کہتا ہوں کہ نہیں۔ آپ چپڑاسی کی حیثیت سے نہیں بلکہ مجھے خلیفہ سمجھ کر ملنے آئے ہیں۔ غرضیکہ جب تک آنے والے کو نہ بٹھا لوں مَیں خود نہیں بیٹھتا۔ مجھے ملنے والوں کی تعداد ہزاروں تک ہے مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کبھی تخلّف ہُوا ہو سوائے اس کے کہ مَیں بیمار ہوں، یا کسی کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے کبھی غلطی ہو جائے۔ ہاں جلسہ سالانہ کے ایام مستثنیٰ ہیں۔ ان دنوں میں ملنے والے اس کثرت سے آتے ہیں کہ ہر ایک کے لئے اُٹھنا مشکل ہوتا ہے ہاں ان دنوں میں بھی جب کوئی غیر احمدی آئے تو چونکہ مَیں جانتا ہوں کہ یہ میری مشکلات کو نہیں سمجھ سکتا اس لئے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ یا پھر ان ایام میں جب ملاقات کا زور نہ ہو تو کھڑا ہوتا ہوں۔ یہ میرا اصول ہے اور مَیں سمجھتا ہوں ناظروں کو بھی ایسا کرنا چاہیئے اور اگر اس کے خلاف کبھی شکایت آئے تو مَیں چاہتا ہوں کہ جس کے خلاف شکایت ہو اُسے تنبیہہ کی جائے جب تک یہ بات نہ ہو اسلام کی رُوح قائم نہیں ہو سکتی ''

(الفضل ۲۷ راپریل ۱۹۳۶ء صـ۳)

ایک اَور موقع پر فرمایا:۔

''کامل اطاعت اور فرمانبرداری نہایت ضروری ہے اور یہ صرف خلیفہ سے ہی مخصوص نہیں۔ بعض لوگ اس وہم میں مبتلا ہوتے ہیں، کہ بس خلیفہ کی بات ماننا ہی ضروری ہے اَور کسی کی ضروری نہیں خلیفہ کی طرف سے مقرر کردہ لوگوں کا حکم بھی اسی طرح ماننا ضروری ہوتا ہے جس طرح خلیفہ کا۔ کیونکہ خلیفہ تو براہِ راست ہر ایک شخص تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا۔ رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ مَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَ مَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ ۔"

(الفضل ۲۲؍ دسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۶)

اسی طرح فرمایا:-

"مَیں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ اگر ایک طرف ناظروں کا احترام اور اعزاز جماعت کے دلوں میں پیدا کیا جائے تو دوسری طرف جماعت کی عظمت کو بھی قائم رکھا جائے۔ مَیں جانتا ہوں کہ اگر ایک حصّہ کو چھوڑ دیا جائے تو باوجود نیک نیتی اور نیک ارادہ کے ایک حصّہ دوسرے کو کھا جائے گا۔ اگر کارکنوں کے اعزاز اور احترام کا خیال نہ رکھا جائے تو نظام کا چلنا مشکل ہو جائیگا اور اگر جماعت کے حقوق کی حفاظت نہ کی جائے اور اس کی عظمت کو تباہ ہونے دیا جائے تو ایک ایسا آئین بن جائے گا جس میں خود رائی اور خود ستائی غالب ہو گی۔ اس لئے مَیں ہمیشہ اس بات کو مدِّنظر رکھتا ہوں کہ جس کی غلطی ہو اُسے صفائی کے ساتھ کہہ دیا جائے۔"

(الفضل ۲۲؍ اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ ۳-۲)

روزمرّہ کے انتظامی اُمور میں طریقِ کار

عمومی نگرانی اور محاسبہ

انتظامیہ کے سربراہِ اعلیٰ کی حیثیت سے آپ جہاں اصولی اور بسا اوقات تفصیلی رہنمائی فرماتے وہاں وقتاً فوقتاً کام کا محاسبہ بھی کرتے رہتے اور کبھی سختی اور کبھی نرمی کے ساتھ کبھی سخت گرفت اور کبھی دل موہ لینے والے عفو کے ساتھ منتظمین اور کارکنان کی اصلاح فرماتے رہتے۔ عفو کے وقت آپ کے درگذر کا انداز بہت پیارا ہوتا اور کئی غفلتوں سے آنکھیں بند کر لیتے اور گرفت کے وقت نہایت باریک نظر کے ساتھ انتظامی کمزوریوں کو کرید کرید کر باہر نکالتے۔ اگرچہ عام کارکنان کے لئے روزمرّہ کے دفتری اوقات مقرر تھے۔ مگر اہم جماعتی ضرورت کے وقت آپ دفتری اوقات کا کبھی لحاظ نہ کرتے اور ہر کارکن سے توقع رکھتے کہ اگر چوبیس گھنٹے حاضر رہنے کا مطالبہ کیا جائے تو چوبیس گھنٹے حاضر رہنے کے لئے تیار ہو۔ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے آپ دفتری اوقات سے قطع نظر اور دن رات کی گردش سے بے نیاز حتّی الامکان اپنا اکثر وقت جماعتی کاموں کے لئے وقف رکھتے۔ تقریباً سولہ گھنٹے روزانہ کام آپ کا عام دستور تھا۔ اپنے ماتحت کارکنان سے بھی آپ اسی طرح محنت کی توقع رکھتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی جماعتی مفاد کا تقاضا ہوتا وقت کا لحاظ کئے بغیر آپ متعلقہ افسران کو یاد فرما لیتے اور ضرورت سمجھتے تو پُورے دفتر ہی کو کسی اہم فریضہ کے سرانجام دینے کے لئے کھلا رکھنے کی ہدایت فرما دیتے۔ دفاتر کو کھلا رکھنے کے مواقع عموماً تین وجہ سے پیدا ہوتے۔ اوّل سلسلہ کے اُوپر مشکلات اور ابتلاء کے خاص ادوار آنے سے ایسے وقتوں میں دفاتر بعض اوقات ۲۴-۲۴ گھنٹے کھلے رہتے۔ اور کبھی یہ سلسلہ حسبِ حالات دنوں ہفتوں بلکہ مہینوں تک بھی جاری رہتا۔ کارکنان کی باری باری ڈیوٹیاں لگا دی جاتیں لیکن عموماً ناظروں سے ہمہ وقت حاضر رہنے کی توقع کی جاتی تھی۔ چنانچہ بعض دفعہ ناظر صاحبان اپنا بوریا بستر اُٹھا کر دفاتر میں ہی رہائش پذیر ہو جاتے۔ اور حالات کے معمول پر آنے تک گھر کی خبر نہ لیتے۔

دوم :- بیرونی جماعتوں پر آنے والے ناگہانی حالات اور ابتلاؤں کی اطلاع ملنے پر بھی متعلقہ دفاتر کو کھلا رہنے کی ہدایت دے دی جاتی اور کارکنان سے توقع کی جاتی کہ وہ دن رات متعلقہ جماعتوں کی مشکلات دور کرنے کی سعی کریں۔ بعض احباب جماعت کی انفرادی مصیبت کی اطلاع پر بھی خواہ دن رات کا کوئی حصّہ بھی ہو سلسلہ کے متعلقہ کارکنان کو طلب فرما کر فی الفور ان کی مدد کے لئے بھجوا دیا جاتا۔

سوم :- ایسی شکایات کی صورت میں جو دفتر کی انتظامیہ سے تعلق رکھتی ہوں، اور جن کے نتیجہ میں جماعت کے کسی حصّہ پر بُرا اثر پڑ رہا ہو یا کسی اہم فائل یا کاغذ کے گم ہو جانے کے نتیجہ میں سلسلہ کے کاموں کا نقصان ہو رہا ہو تو برائے اصلاحِ احوال آپ متعلقہ دفاتر کو اس وقت تک کھلا رہنے کی ہدایت فرما دیتے جب تک شکایت کا ازالہ نہ ہو جائے۔

مندرجہ بالا تینوں صورتوں میں حضور خود بھی دفاتر کے عملہ کے ساتھ اسی طرح جاگتے جس طرح باقی کارکنان جاگ رہے ہوتے۔ اور متعلقہ کارکنان سے مسلسل رابطہ قائم رکھتے۔ اور عموماً یہ ہدایت ہوتی کہ جہاں تک حضرت صاحب کی ذات کا تعلق ہے آپ کے آرام اور وقت کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے جس وقت کوئی ضروری اطلاع دینی ہو وہ بلا روک ٹوک دی جائے اور جو ہدایت طلب کرنی ہو فی الفور طلب کی جائے۔ بچپن میں جس گھر میں ہماری رہائش تھی اس کے ایک طرف قریب ہی صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر تھے اور دوسری طرف حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا پرائیویٹ دفتر واقع تھا جو ہمارے گھروں کے ساتھ ملحق تھا۔ یہ دفتر حضور کے لئے دفتر کے علاوہ ذاتی رہائش گاہ کا کام بھی دیتا تھا۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ بعض ایسے مواقع پر جب دفتروں کو رات بھر کھلا رہنے کا حکم دیا جاتا تو ایک طرف ہمیں دفاتر کی بتیاں جلتی ہوئی نظر آتیں تو دوسری طرف حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ذاتی دفتر کی بتیاں بھی روشن دکھائی دیتیں۔ کئی مرتبہ جب حضور دفتر کی بجائے اپنے حرم میں کسی کے گھر شب باشی فرماتے تو رات مختلف وقتوں میں دروازے کھٹکتے رہتے اور کارکنان بار بار حاضر ہو کر کوئی ضروری اطلاع دیتے یا کوئی ضروری ہدایت حاصل کرتے۔ دس گیارہ بجے رات تک تو بچے یا بعض ملازم پیغام رسانی کا کام کیا کرتے۔ دروازہ کھول کر پتہ کرتے کیا بات ہے اور پیغام پہنچا کر حضور سے ہدایت لیتے۔ لیکن رات کے دوسرے حصّوں میں اکثر حضور خود ہی اُٹھ کر دروازے پر پہنچ کر آنے والے کا مدعا معلوم کیا کرتے۔ پہلی صورت میں بھی اہم

معاملات میں خود دروازے پر جا کر بالمشافہ گفتگو فرمانا حضور کی عادت تھی۔

کسی ناظر یا کارکن کی غفلت سے اگر کسی فردِ جماعت کی دل آزاری ہو۔ یا جماعتی مفاد کو نقصان پہنچا ہو تو حضور نہایت سختی سے متعلقہ کارکن کا محاسبہ فرماتے اور بعض اوقات اس جلال کے ساتھ تنبیہہ فرماتے کہ شخص مذکور کی کائنات پر گویا زلزلہ سا آجاتا۔ بعض کارکنان اس کے نتیجہ میں نہایت ملول اور نڈھال ہو جاتے لیکن ان سب کی تربیت ایسے عمدہ رنگ میں کی گئی تھی اور ایسا اعلیٰ درجہ کا اخلاص ان میں پایا جاتا تھا کہ اپنے قصور پر استغفار کرتے لیکن حضرت صاحب کے ساتھ محبت اور وفا اور اطاعت کے تعلق میں سرِ مُو فرق نہ آتا۔

جن کارکنوں کی گرفت ہوتی وہ دوسرے تمام کارکنوں کے لئے نصیحت بن جاتے۔ اور ایسے کسی واقعہ کے بعد ایک عرصہ تک انتظامیہ نہایت مستعدی اور احتیاط سے کام کرتی رہتی بعض اوقات بعد کی تحقیق سے ثابت ہو جاتا کہ جس کارکن کے خلاف شکایت تھی اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ ایسی صورت میں دوہرے التفات کے ساتھ آپ اس کی دلجوئی کرتے اور وہ ایسی خوشی محسوس کرتا گویا اُسے کبھی آپ کی ناراضگی کا صدمہ نہیں پہنچا تھا۔

کارکنان میں بعض ایسے بھی تھے جنہیں صفِ اوّل کے کارکنان کا سا صبر و رضا کا ارفع مقام حاصل نہ تھا بعض ایسے ہی کبیدہ خاطر کارکنان اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے سامنے دل کا غبار نکال لیتے اور آپ مختلف رنگ میں اُن کی تسلّی اور تشفّی فرمانے کے علاوہ نہایت قیمتی مشوروں سے ان کی رہنمائی بھی فرماتے اور انہیں سمجھاتے کہ ان کے قصور کی نوعیت کیا ہے اور کس طرح اس کا ازالہ ہونا چاہیئے اور ازسرِ نو حضور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صحیح طریقِ کار کیا ہے۔

ایک مرتبہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہ حضور بعض اوقات انتظامی کوتاہیوں پر بڑی سخت گرفت کرتے ہیں۔ کسی دوست نے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب سے پوچھا کہ الہامِ الٰہی میں تو حضرت صاحب کو دل کا حلیم قرار دیا گیا ہے لیکن آپ تو بعض دفعہ بڑے جلال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے برجستہ جواب دیا کہ حلیم نہیں بلکہ دل کا حلیم فرمایا ہے۔ جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ بعض اوقات وہ بظاہر سختی بھی کرے گا لیکن عفو اور حلم کے

جذبات وقتی طور پر دب جانے کے باوجود بہرحال غالب آئیں گے۔

حضرت مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ کی اِس تشریح سے اُس شکایت کنندہ کا دل مطمئن ہوگیا اور اس باریک نکتہ کو وہ سمجھ گیا کہ کیوں محض حلیم کہنے کی بجائے آپ کو دل کا حلیم کہا گیا ہے آپ جب بھی ناراض ہوتے انصاف کے تقاضوں اور جماعتی ذمہ داریوں اور فرائض کے پیشِ نظر ہمیشہ لومۃ لائم سے بے نیاز اپنا فرض ادا فرماتے۔ نہ رشتے کی کوئی پرواہ ہوتی اور نہ تعلقات کا کوئی خیال۔ محض اللہ تعالےٰ کا تقویٰ پیشِ نظر ہوتا۔

سلسلہ عالیہ احمدیہ کے انتظامی سربراہ کی حیثیت سے جس فریضہ کی ادائیگی آپ کو کرنی تھی۔ وہ بہرحال کی جاتی تھی۔ مگر آپ کی گرفت دل کی سختی کے نتیجہ میں نہیں بلکہ فرض شناسی کے نتیجہ میں حالات کے تقاضوں کے مطابق ہوا کرتی اور جہاں تک دل کا تعلق ہے آپ اس سختی کی تکلیف کو جو مجبوراً کرنی پڑتی خود بھی محسوس فرماتے اور دُکھ اُٹھانے والے کے ساتھ خود بھی دُکھ اُٹھاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ادائیگیٔ فرض کے بعد آپ متعلقہ کارکن سے ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں اس کے سارے خاندان سے انتہائی مُشفقانہ سلوک کرتے اور ان کی دلداری فرمایا کرتے۔

بحیثیت منتظم اعلیٰ منتظمین اور دفاتر کے عملہ سے آپ کا تعلق محض افسر ماتحت کے رسمی رشتے تک محدود نہ تھا بلکہ اصل تعلق رُوحانی تھا اور یہی تعلق غالب اور قوی تر تھا لہذا آپ کی ناراضگی پر کارکنان کی بے چینی اور بے قراری اس بناء پر نہ ہوتی کہ کسی دنیاوی منفعت سے محروم کئے جارہے ہیں۔ بلکہ اس بناء پر ہوتی کہ اپنے رُوحانی پیشوا کی نظرِ لُطف وعنایت سے محروم ہورہے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ سخت بے قراری محسوس کرتے اور جس طرح بن پڑتا اپنے عمل سے تلافیٔ مافات کی کوشش کرتے۔

○

حضورؓ کی رہائش و سادگی

حضورؓ کی رہائش کا جو کمرہ تھا وہ نہایت سادہ اور مختصر تھا۔ ایک طرف میز پر چند کتابیں پڑی ہوتیں اور دوسری طرف میز پر کچھ خطوط ہوتے اور ایک طرف ہومیوپیتھک کی کچھ شیشیاں پڑی ہوتیں اور ایک طرف حضور کی چارپائی ہوتی جس پر معمولی سا بستر بچھا ہوا ہوتا۔ ساتھ والا کمرہ لائبریری روم کہلاتا تھا جس میں مختلف قسم کی کتابیں الماریوں میں ہوتیں۔ نیچے فرش پر قالین بچھا ہوتا تھا جس پر کچھ کتابیں اور کچھ خطوط پڑے ہوتے اور حضور نیچے فرش پر بیٹھ کر مطالعہ فرماتے۔ اور دفتر کا کام بھی کرتے۔ باہر برآمدہ میں ملاقات کے لئے کرسیاں بچھی ہوتیں اور ایک طرف پلنگ پر ڈاک پڑی ہوتی۔ حضور رات گئے تک کام میں مصروف رہتے۔

حُسنِ سلوک

حضور سلسلہ کے کارکنوں کے ساتھ کس طرح حسنِ سلوک فرماتے۔

اس ضمن میں مکرم و محترم قاضی عبدالحمید صاحب سابق ایڈیٹر "سن رائز" مرحوم کی حسب ذیل روایت بھی بیان کے لائق ہے۔

"۱۹۳۵ء میں جب مجھے "سن رائز" کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اور اگرچہ میں واقفِ زندگی نہیں تھا۔ میرا گذارہ الاؤنس جس پر کام شروع ہوا۔ ایک سو روپے ماہوار تھا۔ اور "سن رائز" کی ایک نگران کمیٹی تھی۔ جس کے صدر شیخ مبشر احمد صاحب مرحوم تھے اس کمیٹی نے ایک سال کے بعد میرے گذارہ الاؤنس میں دس روپے اضافہ کیا۔ کمیٹی کو کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ وہ سالانہ ترقی کا کوئی قاعدہ مقرر کرے۔ سارا کام حسبِ دستور ہوتا رہا۔ چنانچہ جب میرا نکاح ہوا تو اس وقت میرا یہی ایک سو دس روپے ماہوار گزارہ تھا۔

اس کے علاوہ بجلی، پانی اور رہائش کی مفت سہولت ملی ہوئی تھی۔ لیکن حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کو اس تیرہ سال کے عرصہ میں جب کبھی میں نے اپنی ضرورت کے

متعلق اور گذارہ میں اضافہ کی اشارۃً درخواست کی تو حضور نے کمال شفقت سے اُسے بلا تردد قبول فرمایا۔ یہاں تک کہ ایک ایک وقت میں ۵۰۔۵۰ روپے ماہوار اضافہ منظور فرمایا۔"

قاضی صاحب مرحوم نے اسی موضوع پر مزید فرمایا۔

"خاکسار نے تقسیم ملک کے وقت فسادات اور کشت و خون کے ایام میں سن رائز کا چارج چھوڑا تھا اس وقت مجھے وکالت کا کام کرتے ہوئے جو امرتسر میں کیا کرتا تھا تیرہ سال ہو چکے تھے جس طرح ہندوستان سے ہمارے احمدی احباب لُٹے پٹے ہوئے آئے تھے اور پریشان حال تھے میری حالت بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے میری اس پریشانی کے پیشِ نظر کمال شفقت اور بندہ نوازی سے ایک ہزار روپے کا چیک بھجوایا جسے اس وقت مَیں نے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور حضور کی ذرّہ نوازی کا شکریہ ادا کیا۔"

محاسبہ کے متعلق آپ کے اصولی ارشادات اور طریقِ کار

انتظامی محاسبہ کے ضمن میں آپ نے مختلف تقاریر میں جو موقف جماعت احمدیہ پر واضح فرمایا وہ جماعت کے لئے انشاء اللہ ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتا رہے گا۔ اس یقینِ محکم کا اظہار کرتے ہوئے کہ دُنیا کی تقدیر اب احمدیت سے وابستہ ہو چکی ہے آپ نے فرمایا۔

> "مَیں اپنے آپ کو اور آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو ان ذمہ داریوں کا احساس کرو، جو ہم پر عاید ہیں۔ آئندہ سینکڑوں سالوں کے لئے دنیا کی قسمتوں کا فیصلہ ہم سے وابستہ ہے۔ ہم آج جو فیصلے کریں گے وہ آئندہ سینکڑوں سالوں کے لئے دنیا کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیں گے۔ ان تغیرات کی باگ اللہ تعالےٰ نے ہمارے ہاتھوں میں دی ہے اور یہ کام خدا تعالےٰ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پس اللہ تعالےٰ سے دُعا کرو۔ اور اپنی نیّتوں کو درست کرو۔ مَیں نے پہلے بھی کئی بار کہا ہے کہ جب تک نظارتیں میل ملاپ نہیں بڑھاتیں، وہ اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتیں۔ بار بار ملنا، جماعتوں کی مشکلات معلوم کرنا۔ سادگی سے ان کی تقاریب میں شرکت کرنا ان کے لئے بہت

ضروری ہے۔“ [1]

مختلف اداروں کی کڑی اور منصفانہ نگرانی کے سلسلہ میں فرمایا۔

”وہ دوست جو اس وقت باہر سے تشریف لائے ہیں اگر ان کو مرکز میں کام کرنے کا موقعہ ملے تو انہیں معلوم ہو کہ کیسی حالت ہے۔ اگر انہیں وہ تحریریں جن میں مَیں ناظروں اور دوسرے کارکنوں کی خبر لیتا ہوں پڑھنے کا موقع ملے تو وہ تسلیم کر لیں کہ موجودہ کارکن جس طرح کام کر رہے ہیں اس طرح وہ خود نہ کر سکیں اِلّا ماشاء اللہ۔ ہر ایک آدمی دفاتر کے کاغذات سے یہ بات معلوم کر سکتا ہے کہ تمدن کے لحاظ سے کوئی حقیر سے حقیر اور ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی ایسا نہیں ہوگا جس نے کوئی شکایت کی ہو اور مَیں نے اس کی شکایت کی طرف توجہ نہ کی ہو اور وہ حق پر ہو تو جس کے خلاف اس کی شکایت تھی اس سے سختی کے ساتھ باز پرس نہ کی ہو۔ ایک طالب علم تھا جس کا ایک صیغہ کے ناظر سے کچھ مطالبہ تھا مَیں نے اسے جرمانہ کر کے دلا دیا۔“ [2]

ایک اور موقعہ پر فرمایا۔

”مَیں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ مَیں سلسلہ کے کام میں کسی کی رعایت کروں۔ مجھے نہ نظارت کی پرواہ ہے نہ جماعت کی۔ اگر ان کی اصلاح نہ ہوئی تو مجھے ان میں سے کسی کو نکالنے میں کوئی دریغ نہ ہوگا خواہ کوئی میرا بھائی ہو یا بیٹا یا کوئی اور رشتہ دار۔ مَیں خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس امر کی توفیق دے کہ مَیں سلسلہ کے مفاد کے لحاظ سے کسی کی کوئی پرواہ نہ کروں۔“ [3]

اصلاحِ احوال کے لئے پبلک محاسبہ کی اہمیت واضح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

”میرے نزدیک انتظامی نقائص کی بڑی وجہ عدم محاسبہ ہے جماعت

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۴۔ [2] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۹ تا ۲۰۔

[3] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۴۰۔

کی طرف سے کوئی محاسبہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ہمارے اداروں
کے کاموں میں غفلت اور سستی چھائی ہوئی ہے سستی کی بڑی وجہ
یہی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور جب
قوم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو افسروں کے اندر سستی کا احساس
ترقی کر جاتا ہے۔" [1]

"پس ہر احمدی کا فرض ہے کہ جب اسے جماعتی اداروں میں کوئی
خرابی یا نقص نظر آئے یا کسی محکمہ کی غفلت اور سستی کا اسے علم
ہو تو وہ پوری تفصیل کے ساتھ بلا خوف و خطر اس کی اطلاع دے۔" [2]

پھر پبلک محاسبہ کے لئے صحیح راہِ عمل اختیار کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"میرے نزدیک ہر آدمی کا حق ہے کہ سلسلہ کے کاموں میں دخل دے
مگر کسی کا بھی یہ حق نہیں کہ بے موقع اور ایسے رنگ میں کہ بھائی بھائی
کے مقابلہ میں اور قوم قوم کے مقابلہ میں کھڑی ہو جائے دخل دے
اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ اگر وہ ایماندار ہے تو
تو نادانی سے کام کرتا ہے ورنہ وہ جماعت کا دشمن ہے اور تباہی کی
کوشش کرنے والا ہے۔" [3]

علاوہ ازیں محاسبہ کے اصول کو زیادہ منظم شکل دینے کے لئے مجلسِ شوریٰ کے مشورہ سے آپ نے وقتاً فوقتاً تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا سلسلہ بھی جاری فرمایا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۲۶ء میں پہلی بار آپ نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر فرمایا اور پھر ۱۹۲۹ء میں اس کی تجدید فرمائی۔ اس کمیشن کے پریذیڈنٹ چوہدری نعمت اللہ خان صاحب سب جج دہلی اور ممبر پیر اکبر علی صاحب وکیل فیروز پور اور چوہدری غلام حسین صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس منتخب ہوئے۔ حضور نے کمیشن کو ہدایت فرمائی۔ کہ وہ سارے دفاتر کا معائنہ کرے اور مندرجہ ذیل امور کے متعلق تفصیلی رپورٹ مرتب کرے۔

۱۔ کمیشن تحقیقات کرے کہ ناظر اپنے مقررہ فرائض منظور شدہ رقم میں پوری طرح ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۲۔ [2][3] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۹ تا ۲۰

۲- کیا نظارتیں ان قواعد کی جو وہ پاس کرتی ہیں اور ان ہدایتوں کی جو انہیں دی جاتی ہیں پابندی کرتی ہیں اور کراتی ہیں یا نہیں؟ نیز کیا دفاتر کا عملہ کم ہے اور کام زیادہ۔ یا عملہ زیادہ ہے کام کم ہے؟

۳- نظارتیں مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں یا نہیں؟

۴- انجمن کے کارکن اپنے اختیارات ایسے طور پر تو استعمال نہیں کرتے کہ لوگوں کے حقوق ضائع ہوں؟

۵- کیا کوئی صیغہ اخراجات کے بارے میں اسراف سے کام تو نہیں لے رہا؟

چنانچہ کمیشن کے ارکان نے اپنے مفوّضہ کام کو پوری تندہی سے سرانجام دیا۔ کثیر شہادتیں لیں جو ہزاروں صفحات پر مشتمل تھیں اور مکمل چھان بین کے بعد ایک مفصّل اور ضخیم رپورٹ تیار کرکے حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں پیش کی۔ کمیشن کے سپرد یہ کام چونکہ پہلی بار ہوا تھا اور سابق میں اسے جماعتی اداروں کے معائنہ اور ان کے طریق کار کا وسیع تجربہ نہ تھا اس لئے کمیشن سے رپورٹ مرتب کرنے میں کئی ایک غلطیاں بھی ہوئیں لیکن بحیثیت مجموعی کمیشن کی یہ رپورٹ بڑی عمدہ اور قابلِ قدر تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کی مجلس مشاورت میں جب یہ رپورٹ پیش ہوئی تو اس کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے فرمایا:-

"جو کام انہوں (کمیشن کے ممبران) نے کیا ہے اُسے مدِّ نظر رکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ پہلی دفعہ یہ کام کیا گیا ہے جس کے لئے انہوں نے پوری محنت کی ہے کافی وقت صرف کیا ہے اور ایک لمبی رپورٹ تیار کی ہے جس کے لئے وہ جماعت کے شکریہ کے مستحق ہیں اور دوسروں کے لئے نمونہ .... کمیشن کا کام باعثِ خوشی ہے اور میں اس پر خوشی اور امتنان کا اظہار کرتا ہوں۔" [1]

اس کے بعد آپ نے دوسرا کمیشن مقرر کیا اور اس سلسلہ میں فرمایا:-

"اب میں پھر کمیشن مقرر کرتا ہوں جو نظارتوں کا کام دیکھے لیکن اس وقت آج (اپریل ۱۹۳۰ء) سے نہیں بلکہ آئندہ آنے والے سالانہ جلسہ

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صہ ۹

کے بعد شروع ہو گا۔ یعنی جنوری، فروری، مارچ ۱۹۳۱ء میں وہ کام کرے اور مئی، جون تک اپنی رپورٹ پیش کرے مَیں یہ پسند کروں گا کہ پہلے کمیشن سے ایک ممبر اس میں ضرور شامل ہوں، تاکہ کمیشن آسانی سے دیکھ سکے کہ کام میں پہلے کی نسبت کچھ اصلاح ہوئی ہے یا نہیں۔ اس وقت پہلے کمیشن سے ایک ہی ممبر موجود ہیں ان سے مَیں دریافت کرتا ہوں کہ وہ دوسری بار بھی کام کر سکیں گے؟
(اس موقع پر خان صاحب چوہدری نعمت اللہ صاحب نے جواب میں عرض کیا کہ کر سکوں گا)

اس پر آپ نے فرمایا:۔

مَیں انہیں ممبر مقرر کرتا ہوں دوسرے ممبر چونکہ نہیں آئے۔ اس لئے ان میں سے کسی کو مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ دو اَور ممبر ہوں۔ یہ کمیشن جون ۱۹۳۱ء تک رپورٹ مرتب کر کے دے سکتا ہے۔ نظارتوں کو اس وقت تک کا عرصہ کام کرنے کے لئے مل سکتا ہے اور وہ اصلاح کر سکتی ہیں۔ یہ کمیشن چوہدری نعمت اللہ صاحب ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب اور پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب پر مشتمل ہو اس کے صدر چوہدری صاحب ہی ہوں گے۔ نئے کمیشن کو یہ بات خاص طور پر مدِّنظر رکھنی چاہیئے کہ وہ دیکھے کہ ہر کام قاعدہ کی پابندی سے کیا جاتا ہے یا نہیں۔"[1]

ادائیگئ فرض کے سلسلہ میں آپ کو خوب احساس تھا کہ آپ کے بعض فیصلے بعض لوگوں کے لئے تلخی کا موجب بن جاتے ہیں لیکن آپ ایک ایسے مقام پر فائز تھے کہ ان مواقع سے صرفِ نظر کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:۔

"جب میں جماعت کے دوستوں کو ان کی غلطی کی وجہ سے سمجھاتا ہوں تو کہا جاتا ہے کہ ضمیر کی حرّیت کہاں گئی۔ اور جب مَیں دیکھوں کہ ناظروں نے غلطی کی ہے اور ان کی گرفت کروں تو بعض دفعہ ان

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۵ء صفحہ ۴۸-۴۹

کو بھی شکوہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کام میں رکاوٹیں
پیدا کی جارہی ہیں مگر مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا فرض
ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا اور در اصل
خلافت کے معنی ہی یہ ہیں۔" [1]

نظامِ امارت

صدر انجمن احمدیہ کے نظام کی تکمیل کے ساتھ ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جماعت احمدیہ کی متفرق شاخوں کی از سرِ نو تنظیم کی طرف بھی توجہ دی اور ہر جگہ باقاعدہ امارت کا نظام رائج کرنے کے علاوہ صدر انجمن احمدیہ کے شعبہ جات کا ایک مقامی نمائندہ بھی مقرر کرنے کا انتظام فرمایا۔

امیر کی اصطلاح اسلام میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جس کے معنے ایک لحاظ سے امیر مقرر کرنے والے کے نائب کے ہوتے ہیں۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے امیر کی اطاعت پر بڑا زور دیا ہے۔ امارت کا نظام قائم کرنے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے تمام رہنمائی آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہی سے حاصل کی اور اطاعتِ امیر کی رُوح کو نظامِ جماعت میں بڑی کوشش اور محنت سے جاری و ساری کیا۔ ابتداء میں جب آپ نے باقاعدہ نظامِ امارت قائم کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس ارادہ کا اظہار مجلس مشاورت میں کیا اور مشورہ مانگا تو اس بارہ میں بڑی دلچسپ آراء کا اظہار کیا گیا۔ عملاً مشورہ دینے والے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ جو اس شدت سے ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے تھے کہ گویا امیر بنانے کے حق میں جو لوگ تھے ان کے نزدیک امیر مقرر نہ ہونے کی صورت میں ایمان جاتا رہے گا۔ اور جو مخالف تھے ان کے نزدیک نظامِ امارت کے مقام سے اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ یہ نظامِ خلافت کا متوازی نظام بن کر جماعت کو تباہ کر دے گا۔ دونوں طرف کے قائلین نہایت مخلص اور سلسلہ کے اعلیٰ درجہ کے وفادار

---

[1] الفضل ۲۷ اپریل ۱۹۳۶ء صہ

اور اطاعت گذار خدّام تھے جو سوائے سلسلہ کی بہبُود اور فلاح کے اور کوئی جذبہ نہ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود آراء میں دیانتدارانہ اختلاف اس قدر تھا اور ایسے دلائل دونوں طرف سے پیش کئے جارہے تھے کہ بظاہر دونوں گروہوں کے مابین اتفاق رائے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے دونوں آراء سُنکر اس عمدگی اور حکمت سے تمام صورتِ حال کا تجزیہ کیا کہ تمام حاضرین مطمئن اور متفق ہو گئے کہ بعض ضروری احتیاطوں اور شرائط اور استثناء کا لحاظ رکھتے ہوئے جماعت کی مختلف شاخوں میں امیر مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ امیر کے فرائض اور اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

اُمارت کے فرائض

در اصل امارت کے فرائض کو لوگوں نے نہیں سمجھا جو مَیں نے بتائے تھے۔ گو اس تفصیل سے احادیث میں نہیں ملتے کیونکہ تیرہ سو سال کی بات ہے۔ مگر ان کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

رسُولِ کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے جو مشورہ سے کام نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں اور مَیں نے امیر کے لئے رکھا تھا۔ کہ علی العموم کثرت رائے سے فیصلہ کریں۔ لیکن میں بھی یہی کرتا ہوں کوئی ایک آدھ ہی معاملہ سال میں ہوتا ہوگا جس میں مَیں کہوں کہ میری یہ رائے ہے اس کے مطابق عمل ہو ورنہ عموماً کثرت رائے سے جو تجویز ہو اسی کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ دیکھو اُحد کے دن رسُولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ مَیں پسند نہیں کرتا کہ باہر جا کر مقابلہ کیا جائے۔ مگر سب نے کہا کہ لوگ ہمیں بُزدل کہیں گے۔ جب ہم کفر میں بُزدل نہیں ہوئے تو اب کیوں کہلائیں۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن اُبَیّ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا تھا مگر اس دن اس کو بلایا اور پوچھا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ شاید وہی کہے کہ باہر نہ جائیں۔ اور لوگوں میں اس بات کی تحریک ہو۔ مگر اس نے بھی

کہا کہ باہر ہی جانا اچھا ہے۔ جب باہر جانے لگے اور جوش کم ہوا تو صحابہ رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ باہر آنا غلطی تھی، اور ہم نے غلطی کی۔ مگر آپؐ نے نہ مانا اور کہا کہ نبی جب تیار ہو جاتا ہے تو پھر نہیں لوٹتا اس وقت انہیں سبق دینے کے لئے رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات مان لی۔ اور اس جنگ میں ایک امیر مقرر کیا کہ اس کے حکم کے بغیر نہیں ہٹنا۔ مگر پھر جو حالت ہوئی وہ ظاہر ہے۔

امیر کی پوزیشن

تو یہ بات کہ امیر کثرتِ رائے کی اتباع کرے۔ ۹۹ فیصد یہی ہوگا، کہ ایسا ہی کرے اور ممکن ہے کہ پانچ پانچ سال ایسا ہی ہو کہ اس کو اپنی بات منوانے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہو جس کے خلاف مشورہ دیا گیا ہو اور مَیں نے کہا ہو کہ یہی کرو۔

تو امیر کے لئے یہ رکھا ہے کہ کثرت رائے سے فیصلہ کرے اور اگر اس کے خلاف کرے تو وجوہات لکھے۔ دوسرے لوگ اگر چاہیں تو خلیفۂ وقت کے پاس شکایت کریں۔ . . . .

اطاعت کی رُوح پیدا کرو

ہماری جماعت میں اطاعت کی رُوح ہونی چاہیئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو مقرر فرماتے جو کم حیثیت ہوتے اور اشارۃً بیان کیا کہ دیکھوں لوگ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں۔ اسامہؓ کو ایک بڑے لشکر کا سردار مقرر کیا اس خیال سے کہ آیا لوگ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں۔ مدینہ میں والی غیر معروف مقرر کئے اور ماتحت بڑے بڑے صحابی کئے۔ پس جماعت میں یہ مادہ ہونا

چاہیئے کہ ذاتی فوائد کو جماعت کے لئے قربان کردیں۔ یہی گر ہے جس سے دشمن پر فتح پا سکتے ہیں۔ تو امراء کے تقرر سے انجمن ٹوٹتی نہیں بلکہ یہ فائدہ ہے کہ پارٹی فیلنگ (PARTY FEELING) پیدا نہیں ہوگی۔ اور کثرت رائے صحیح کثرت رائے ہوگی۔ انجمنوں میں پارٹی فیلنگ پیدا کی جاتی ہے ممبروں سے کئی کئی وعدے خطابوں عہدوں کے دے کر ان کی رائے لی جاتی ہے۔ اصل میں اسلام ہی کی جمہوریت ہے جو امراء کے ذریعہ قائم ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت صاحب کے قواعد بنانے خلاف نہیں جبکہ صدر انجمن احمدیہ کے قواعد ہوتے خلافت کو مانا اور بیعت ہوئی۔" [1]

اسلام نے امارت کا جو تصور قائم کیا ہے، حضور اس سے بدرجہ کمال واقف تھے۔ اور اس کے ہر پہلو پر آپ کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ زیرِ نظر مجلس مشاورت سے قبل بھی آپ نے متعدد بار اس موضوع پر جماعت کو بڑی قابلِ قدر نصائح فرمائیں اور منصب امارت کو اچھی طرح احبابِ جماعت کے ذہنوں میں جاگزین کرنے کی کوشش فرمائی۔ ذیل میں آپ کے اس خطاب سے دو اقتباس پیش کئے جا رہے ہیں جو آپ نے ۱۲ر فروری ۱۹۱۹ء کو لاہور روانگی سے قبل اہلِ قادیان سے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے باہر کسی مقام پر تشریف لے جاتے تھے تو مدینے میں اپنے بعد کسی کو امیر مقرر فرما دیتے تھے جس کے سپرد مقامی انتظام ہوتا تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ میں یہ بھی تھا کہ آپ ہمیشہ بدل بدل کر آدمی مقرر کیا کرتے تھے اور اس طریق میں بہت سے فوائد ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اگر ہمیشہ ایک ہی شخص کو مقرر کیا جائے تو لوگ اس کے متعلق عجیب عجیب خیال اور قیاس خود بخود کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب بدل بدل کر امیر مقرر کئے جاتے ہیں تو ہر ایک میں فرمانبرداری کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم بعض بڑے

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۳ تا صفحہ ۲۱)

بڑے صحابہؓ پر ایسے لوگوں کو بھی امیر مقرر فرمایا کرتے تھے جو بظاہر چھوٹے نظر آتے تھے۔ مثلاً اُسامہؓ کے ماتحت ابوبکرؓ وعمرؓ جیسوں کو کر دیا۔ اس میں حکمت یہی تھی کہ لوگوں میں ایک دوسرے کی اطاعت کا مادہ پیدا ہو۔ ایک اطاعت تو ایک شخص کی ذات کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن ایک اور اطاعت ہے جو خالصۃً لِلّٰہ ہوتی ہے۔ جب ایک انسان خدا کے نبی یا خدا کے مقرر کردہ خلیفہ یا کسی خلیفہ کے مقرر کئے ہوئے شخص کی اطاعت کرتا ہے تو دراصل وہی اطاعت خالص اور خدا کے لئے ہوتی ہے۔" [1]

اور فرمایا:۔

"میرے نزدیک امارت کا سوال ساری جماعتوں کے لئے محتاجِ توجہ ہے اور میرا ارادہ ہے کہ ساری جماعتوں کے لئے امیر مقرر کئے جائیں اور اس میں بعض مقامات میرے مدِّنظر ہیں۔ جن میں ابتداءً امیر مقرر کئے جائیں گے۔

بعض لوگوں نے مقامی امارت کو سمجھا نہیں اس لئے مَیں اس کے متعلق مختصراً بیان کرتا ہوں۔ چونکہ قادیان مرکز ہے۔ تو بعض لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ خلیفہ کے بعد قادیان کی جماعت کا امیر بھی خلیفہ ہی ہو جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ چلو ان سے بعض معاملات ان کی خلافت کی حیثیت میں حل کرائیں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ مقامی امارت کے ساتھ صرف مقامی امور وابستہ ہوتے ہیں۔ جیسے مثلاً جماعت سیالکوٹ کا امیر ہو تو اس کے متعلق سیالکوٹ کے ہی معاملات ہونگے بیرونجات کے نہیں ہوں گے۔ اسی طرح قادیان کے متعلق بھی ہے۔ ورنہ مرکزی معاملات جن کا تعلق خلافت سے ہوگا وہ بہرحال خلیفہ سے ہی متعلق ہوں گے۔ خواہ خلیفہ کہیں ہو اور جو ناظروں یا صدر انجمن احمدیہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کو وہی انجام دیں گے۔ تعلیم کے متعلق

---

[1] الفضل ۱۸ فروری ۱۹۱۹ء صفحہ ۵

آخری فیصلہ ناظر تعلیم و تربیت کا ہوگا اور محاسبہ کے متعلق ناظر
محاسبہ کا اور امورِ عامہ کے متعلق ناظر امورِ عامہ کا اور امیر سے
صرف وہی معاملات متعلق ہوں گے جو مقامی ہیں " [1]

امارتوں کے قیام کے علاوہ اسی سال حضور نے مجلس شوریٰ کے مشورہ کے ساتھ ہر جماعت میں مختلف سیکرٹریوں کا تقرر بھی فرمایا جو مرکزی نظارتوں کے کام میں اپنی اپنی جماعت کی نمائندگی کریں۔ اس اہم انتظامی فیصلہ کے نتیجہ میں جماعت کی ہر شاخ میں ایک قسم کی چھوٹی سی صدر انجمن احمدیہ کی تصویر بن گئی۔ ہر نظارت سے تعلق رکھنے والا ایک ایک سیکرٹری ہر جماعت میں اس غرض سے مقرر ہوا کہ متعلقہ نظارت کے ہر قسم کے کاموں کی نگرانی کرے اور تعمیری کاموں کو فروغ دینے کی کوشش کرے۔ یہ نظام آج بھی جماعت احمدیہ میں قائم ہے اور مزید مستحکم ہو چکا ہے البتہ چھوٹی جماعتوں میں امیر کی بجائے صدر مقرر ہوتا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے امارت کے نظام کو نافذ کرنے کے بعد اُسے نہایت عمدہ رنگ میں پروان چڑھایا اور بڑی احتیاط اور پیار کے ساتھ جماعت کی اس بارہ میں تربیت فرمائی یہاں تک کہ آج قریباً ہر احمدی نظامِ جماعت کے اس پہلو سے خوب واقف ہو چکا ہے۔ فرائض اور اس کے بارہ میں ہدایات کا اُسے علم ہے۔ اور احبابِ جماعت اپنے حقوق اور فرائض سے خوب واقف اور آشنا ہیں۔ چنانچہ جب کبھی بھی کسی فتنہ پرداز نے اس نظام میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کی جماعت نے بیک آواز اُسے ناکام کر دکھایا۔ اختلافات کا پیدا ہونا تو ایک طبعی امر ہے۔ اور زندگی کی علامت ہیں۔ لیکن حضرت مصلح موعودؓ نے اختلافات سلجھانے کا ایک ایسا عمدہ اسلوب جماعت میں رائج کر دیا کہ بڑے بڑے اہم اختلافات بھی بغیر کسی قباحت اور فتنے کے اس اعلیٰ نظام اور تربیت کی برکت سے زائل ہو جاتے ہیں۔ جب بھی جماعت کے کسی فرد نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو کسی ایسے امر سے آگاہ کیا جو اس کے نزدیک امیر کو نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے ایسے موقع پر عموماً حسبِ ذیل طریق اختیار فرمایا۔

اگر وہ شکایت بے نام ہوتی تو اس پر کوئی کارروائی نہ فرماتے اور خطبات میں بھی اس امر پر کئی دفعہ اظہارِ رائے فرمایا اور بتایا کہ اگر اس طرح بے نام شکایت کرنے والے ہوں، تو

---

[1] الفضل ۱۸ ؍ فروری ۱۹۱۹ء صفحہ ۵۔

اس سے جماعت میں بُزدلی پیدا ہو گی اور جھوٹی شکایات کا ایک ایسا سلسلہ چل پڑے گا۔ جس کی روک تھام ممکن نہ رہے گی۔ اگر شکایت کنندہ اپنا نام اور پتہ وغیرہ درج کرتا لیکن امیر جماعت کی وساطت کے بغیر شکایت بھیجتا تو حضور فوری طور پر امیر متعلقہ سے اس بارہ میں وضاحت طلب فرماتے۔ حضور عموماً یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ شکایت اس منتظم کی وساطت کے بغیر کی جائے جس کے خلاف وہ شکایت کر رہا ہے اس خطرہ کے ازالہ کے لئے کہ شکایت کہیں راستہ میں روک نہ لی جائے بلاوجہ تاخیر سے پہنچنے والی شکایات کی نقل براہِ راست بھجوانے کے طریق کو پسند فرماتے۔ چنانچہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اگر شکایت کنندہ کوئی صائب الرائے شخص ہوتا اور شکایت میں سرسری مطالعہ ہی سے کوئی وزن نظر آتا تو متعلقہ منتظم کی طرف سے اصل شکایت پہنچنے کا انتظار کئے بغیر فوری رپورٹ طلب فرما لیا کرتے۔ اس طریق پر امراء کو یہ حق حاصل تھا کہ نائب ناظروں یا ناظروں کے خلاف شکایت کریں لیکن ہر دو صورت میں حضور ہرگز یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ شکایت کنندہ ادب کے پہلو کو نظر انداز کر دے یا کوئی ایسی زبان یا طرزِ کلام اختیار کرے جس سے افسر صیغہ کے وقار کو صدمہ پہنچنے کا احتمال ہو۔ بڑی بڑی جماعتوں کے امراء میں سے ایسے امراء جن کو جماعت کی غیر معمولی خدمت اور تعلیم و تربیت کا موقع ملا ہو حضور ان کو خاص احترام کی نظر سے دیکھتے اور جماعت میں بھی مختلف رنگ میں اُن کی عزت کو قائم فرماتے تاکہ جماعت میں اچھے کارکنان کے احترام کا جذبہ پیدا ہو بعض اوقات ایسے امراء کو اس بات کی اجازت دیتے کہ مناسب حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی ایسے ناظر کے کام پر کھل کر تنقید کریں جس کی کوتاہی کی وجہ سے کسی اہم جماعتی مفاد کو نقصان پہنچا ہو اور جماعت کی تربیت کے لئے ضروری ہو کہ اس معاملہ پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے۔ چنانچہ مجلس مشاورت کی کارروائی میں قارئین کو بعض اوقات ناظروں پر ایسی سخت تنقید نظر آئے گی جس کی عام حالات میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اجازت نہیں دیا کرتے تھے اسی طرح جب تنقید کرنے والے امراء کے عمومی مزاج اور کردار پر نظر ڈالیں تو ان کی اس غیر معمولی تنقید پر مزید تعجب ہو گا کیونکہ ایسی تنقید کرنا عموماً ان کی عادت میں داخل نہ تھا۔ کئی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ بعض دوست کم فہمی میں ایسے مواقع سے غلط نتیجہ اخذ کرتے ہوئے سلسلہ کے مرکزی کارکنان پر مشاورت میں تنقید شروع کر دیتے گویا دُنیا کی کسی پارلیمنٹ میں وزراء کی گوشمالی کی جا رہی ہو تو حضور ایسے موقع پر فوری طور پر ان کو سمجھا کر سلسلہ کلام بند کر دیتے اگر ناظر کی

غلطی ہوتی تو خود اسے سمجھا دیتے ورنہ بدظنی اور مبالغہ کرنے والے ناقد کی خاطر خواہ گوشمالی فرماتے۔

عموماً امراء کے ساتھ حضور کا سلوک نہایت مشفقانہ تھا۔ خصوصاً پرانے خدامِ سلسلہ سے تو گہرا قرب کا تعلق تھا۔ ان پر غیر معمولی اعتماد فرماتے۔ وقتاً فوقتاً اہم امور میں مشورہ کے لئے طلب فرماتے رہتے۔ امارت کے کام کے علاوہ بھی اہم جماعتی ذمہ داریاں ان کے سپرد کرتے کبھی ناراض بھی ہوتے لیکن ناراضگی کے بعد جس غیر معمولی شفقت اور دلداری کا سلوک فرماتے وہ قلوب میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کرتا کہ شخصِ متعلقہ زبانِ حال سے یہ کہہ اٹھتا کہ ؎

صحتیں لاکھوں مِری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بار ہا انکی عیادت کے مزے

خفا ہوتے لیکن ناز برداری بھی کرتے۔ بے تکلف مجالس میں بے تکلف اظہارِ خیال کی نہ صرف اجازت دیتے بلکہ پسند فرماتے کہ احباب کھل کر اپنے دل کی بات کریں۔ خود اپنے خلاف شکوے بھی سنتے اور بڑے دلپذیر انداز میں ان کا ازالہ بھی فرماتے۔

اپنے مقرر کردہ امراء سے حضور خاص محبت اور شفقت کا تعلق رکھتے تھے۔ خلیفہ اور امیر کے مابین محض رسمی قانونی رشتہ نہ تھا بلکہ اس میں ذاتی تعلق اور گہری ہمدردی اور شفقت کی وجہ سے ایک غیر معمولی جذباتی قوت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ اگر اس سلسلہ میں ان تمام امراء کے ذاتی تجارب مشاہدات اور واردات کو اکٹھا کیا جائے جنہیں حضور کے ساتھ آپ کے مقرر کردہ امیر کی حیثیت سے کام کرنے اور اس تعلق سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا، تو بلا شبہ یہ ایک طویل داستان بن جائے گی۔ سرِدست صرف اتنا ذکر کافی ہے کہ جب بھی بعض ایسے امراء سے گفتگو ہوئی جنہیں آپ کے زمانہ میں امارت کے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا تو مَیں نے دیکھا کہ حضور کی شفقت کی یادیں برساتی گھٹاؤں کی طرح ان کے قلب و ذہن کی کائنات پر چھا گئیں۔

مکرم مرزا عبدالحق صاحب سلسلہ کے اُن پرانے مخلص خادموں میں سے ہیں، جنہیں امیر جماعت مقامی و ضلع و صوبہ کی حیثیت سے بہت لمبا عرصہ سلسلہ کی خدمت کی توفیق ملی ہے۔ ایک مرتبہ سیالکوٹ سے واپسی پر ہمیں اکٹھے کار میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ اس سفر میں سیالکوٹ سے لے کر سرگودھا تک مسلسل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا ذکر چلتا رہا۔ محترم مرزا صاحب مختلف واقعات بیان کرتے رہے۔ بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ یہ ذکر

اتنا دلچسپ اور دل گداز تھا کہ اس لمبے سفر کے ختم ہونے کا احساس بھی نہ ہوا۔ محترم مرزا صاحب حضرت صاحب کی غیر معمولی شفقت کے واقعات بیان کرتے تو بسا اوقات آواز گلوگیر ہو جاتی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ مختلف واقعات میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ مرزا صاحب کو ایک غیر از جماعت دوست کی سفارش کے سلسلہ میں ان کے ساتھ حضور کی ملاقات کے لئے دھرم سالہ جانا پڑا۔ دھرم سالہ ایک صحت افزا، پہاڑی مقام ہے جہاں حضور کبھی کبھی گرمیوں میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کو رہائش کے لئے ان کوارٹروں میں جگہ ملی جہاں مکرم ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب رضی اللہ عنہ اور مکرم مولانا عبدالرحیم صاحب درد رضی اللہ عنہ قیام پذیر تھے۔ وہ جگہ کوئی خاص آرام دہ جگہ نہیں تھی۔ حضرت صاحب سے ملاقات کے بعد مرزا صاحب جب واپس اپنے گھر گورداسپور پہنچے تو حضرت صاحب نے خط لکھکر آپ سے دریافت فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کے چہرے پر بہت افسردگی تھی۔ اس پر مرزا صاحب نے بے تکلفی سے یہ لکھ دیا کہ کچھ تو سفر کی تکان کا اثر تھا لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ جہاں میں ٹھہرا تھا وہ جگہ کوئی آرام دہ جگہ نہ تھی۔ جب حضور پہاڑ پر تشریف لے جاتے ہیں تو کوٹھی کوئی ایسی لیا کریں۔ جہاں مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے نسبتاً زیادہ مناسب انتظام ہو۔ بظاہر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن دوسرے ہی سال جب حضرت صاحب دوبارہ دھرم سالہ تشریف لے گئے تو مرزا صاحب کو تار دے کر طلب فرمایا۔ وہ کہتے تھے کہ میں گیا تو اس حصہ میں جہاں حضور خود قیام فرما تھے۔ ساتھ کا کمرہ خالی کروا دیا اور بے حد تلطف کے ساتھ غیر معمولی مہمان نوازی کے علاوہ خود میرے کمرے میں تشریف لائے اور میری چارپائی پر بیٹھ کر دیر تک بڑی محبت سے گفتگو فرماتے رہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب اُس شکوہ کا ازالہ ہو رہا ہے جو میں نے بے تکلفی میں گزشتہ سال کیا تھا۔

عموماً سب احبابِ جماعت سے حضور کا سلوک ایسا ہوتا تھا کہ سب یہی تأثر لیتے کہ ہم خاص مقرب ہیں۔ لیکن امراء میں تو بالخصوص یہ تأثر غیر معمولی شدت سے پایا جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے جن پرانے امراء سے بھی بات کی ہر ایک نے یہی بیان کیا کہ اُن پر حضور کی شفقت کی نظر غیر معمولی تھی۔ یہ ایسی یادیں ہیں جو دل سے مٹائی نہیں جا سکتیں۔ حضور کے پرانے ساتھی اور سلسلہ کے دیرینہ کارکنان جس محبت اور عشق کے ساتھ آپ کا ذکر کرتے ہیں اس جذبے کو

ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ ذکر کرنے والے پر ایک عجیب سوز و گداز کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو ذکر سننے والے کے دل کو بھی گرمیٔ عشق سے پگھلا دیتی ہے اور آہیں دعائیں بن کر دل سے اُٹھنے لگتی ہیں۔

مجلس مشاورت کا باقاعدہ قیام

قرآن کریم نے مثالی اسلامی معاشرہ کا تصوّر پیش کرتے ہوئے جو مختلف رہنما اصول بیان فرمائے ہیں ان میں ایک باہمی مشورہ کا اصول بھی ہے جیسا کہ فرمایا۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (سورہ شوریٰ آیت ۳۹)

اس مشورہ کے امر کو جماعت احمدیہ میں ایسے رنگ میں قائم کرنا جو صحیح اسلامی اقدار کے عین مطابق ہو اور افراط و تفریط سے پاک ہو قیامِ جماعت احمدیہ کے اوّلین اغراض و مقاصد میں شامل ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اہم امور میں صائب الرائے احباب سے مشورہ لینے کی سنّت پر ہمیشہ کاربند رہے اور وقتاً فوقتاً عند الضرورت کبھی انفرادی طور پر اور کبھی اجتماعی طور پر احباب جماعت سے مشورہ لینے کا انتظام فرمایا۔ اجتماعی مشورہ کی ایک اہم مثال ۱۸۹۱ء میں ہمارے سامنے آتی ہے جبکہ دسمبر میں جماعت احمدیہ کا پہلا جلسہ سالانہ منعقد کیا گیا۔ جماعت کی تعداد اس وقت اتنی قلیل تھی کہ جلسہ کے موقع پر صرف ۷۵ زائرین شامل ہوئے۔ اس قلیل تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے جلسہ اور مشاورت کا الگ انتظام کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لہٰذا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اسی جلسہ سالانہ سے مشاورت کا کام بھی لیا۔ اور جماعت احمدیہ کی اس پہلی مجلس مشاورت میں جو تجویز پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے بکثرت ظاہر ہونے والے نشانات کا ریکارڈ محفوظ کرنے کی خاطر ایک ایسی انجمن بنائی جائے جو احمدی اور غیر احمدی حضرات پر مشتمل ہو۔ یہ تجویز بالاتفاق اس ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی کہ فی الحال حضرت مسیح موعود کے رسالہ آسمانی فیصلہ کو جس میں یہ تجویز موجود ہے شائع کر دیا جائے۔ اس پر مخالفین سلسلہ کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد بتراضیٔ فریقین مجوّزہ انجمن کے ممبران مقرر کئے جائیں۔

اجتماعی مشاورت کا یہ سلسلہ باقاعدہ سالانہ صورت میں جاری نہیں کیا گیا تھا بلکہ خلافتِ ثانیہ کے آغاز تک ایسی مجلس حسب ضرورت بلائی جاتی رہی۔ ۱۹۲۲ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے پہلی مرتبہ باقاعدہ سالانہ مجلس مشاورت کا نظام قائم فرمایا۔ حضور کے اس فیصلہ پر جسے جماعت احمدیہ کی تاریخ میں ایک بنیادی حیثیت حاصل تھی، بعض کم فہم اشخاص نے اعتراضات بھی کئے کہ یہ ایک ایسا مالی بوجھ ہوگا جو جماعت برداشت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس زمانہ میں چندوں کی کیفیت یہ تھی کہ بعض اوقات کارکنوں کو ماہانہ تنخواہ دینے کے لئے بھی کئی کئی ماہ انجمن کے پاس پیسے نہ ہوتے تھے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے اس اقدام کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور فرمایا:۔

”کہا جاتا ہے کہ اس قدر کام جاری کرنے کی طاقت نہیں۔ مگر مشکل کے وقت یا ناسمجھی کے باعث ایسے خیال پیدا ہونے کوئی بڑی بات نہیں اور میں سمجھتا ہوں جو کہتا ہے کہ جماعت یہ بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں، وہ معذور ہے۔ مگر میں بھی معذور ہوں۔ میری طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہے کہ میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کونسا کام کریں، جس سے دنیا میں ہدایت پھیلے ...... وہ دن یا وہ سال جس میں جماعت کا قدم آگے نہ ہو میرے لئے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے ..... میری نظر اس بات پر پڑ رہی ہے کہ ہماری جماعت نے آج ہی کام نہیں کرنا بلکہ ہمیشہ کرنا ہے۔ دنیا کی انجمنیں ہوتی ہیں جو یہ کہتی ہیں آج کام کر کے دکھا دو اور لوگوں کے سامنے رپورٹ پیش کر دو۔ مگر میں نے رپورٹ خدا کے سامنے پیش کرنی ہے۔ اور خدا کی نظر اگلے زمانوں پر بھی ہے۔ اس لئے مجھے یہ فکر ہوتی ہے کہ آج جو کام کر رہے ہیں یہ آئندہ زمانہ کے لئے بنیاد ہو۔ ہمارا کام یہ نہیں کہ دیکھیں ہمارا کیا حال ہوگا بلکہ یہ ہے کہ جو کام ہمارے سپرد ہے اُسے اس طریق پر چلائیں کہ خدا کو کہہ سکیں کہ اگر بعد میں آنے والے احتیاط سے کام لیں، تو تباہ نہ ہوں گے۔ پس مجھے آئندہ کی فکر ہے اور میری نظر آئندہ پر ہے کہ ہم آئندہ کے لئے بنیاد رکھیں۔ جس کی نظر وسیع نہیں اُسے تکلیف

نظر آرہی ہے۔ مگر اس کی آئندہ نسل ان لوگوں پر جو یہ بنیادیں رکھیں گے درود پڑھے گی ...... وہ زمانہ آئے گا جب خدا ثابت کر دے گا، کہ اس جماعت کے لئے یہ کام بنیادی پتھر ہے۔"

مجلس شوریٰ کا قیام خالصتہً ایک مذہبی حیثیت رکھتا تھا اور دنیوی پارلیمنٹوں اور ہم شکل مجالس کو اس رُوحانی ادارے سے سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی نسبت نہ تھی۔ آپ نے مجلس مشاورت کے اغراض و مقاصد کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں پھر توفیق دی کہ ہم ساری دنیا سے اختلاف رکھتے ہوئے آج اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ باقی دنیا کو جو اپنی مادی ترقی کے لئے مشورے کرتی اور دنیوی ترقی کے لئے اپنے دماغوں کو خرچ کرتی ہے دین کی دعوت دیں اور رُوحانیت کی طرف متوجہ کریں۔ باقی دنیا صرف دنیا کے لئے جدّ وجُہد کر رہی ہے لیکن ہم خدا کے فضل سے اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ وہ نُور وہ ہدایت اور وہ صداقت جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجی ہے اس کی ترقی کے لئے کوشش کریں اس کی اشاعت کے لئے غور کریں اور اسے پھیلانے کے لئے تجاویز سوچیں۔ اور ان کے ضمن میں جو مادی تمدّنی اور سیاسی باتیں پیدا ہوں اُن پر غور کریں۔ لیکن اس لئے نہیں کہ اپنی ذات کے لئے کچھ حاصل کریں بلکہ اس لئے کہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچائیں کیونکہ کوئی نبی کی جماعت ایسی نہیں ہو سکتی جس کے کسی کام کی غرض محض اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا ہو بلکہ اس کی ہر کوشش اور ہر کام کی غرض یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ دوسروں کی مشکلات کو دُور کرے اور دوسروں کی بہتری اور بھلائی مدّ نظر رکھے۔ پس ہم بھی اگر نبی کی جماعت بننا چاہتے ہیں تو ہماری تمام کوششیں اور تدبیریں ایسی ہونی چاہئیں کہ اُن سے سب دنیا کو فائدہ پہنچے۔ قطع نظر اس کے کہ کوئی احمدی ہو یا غیر احمدی، مسلم ہو یا غیر مسلم۔ سب کی

خدمت اور سب کی بھلائی ہمارا فرض ہے کیونکہ مومن سب دُنیا کا
خدمت گزار ہوتا ہے۔

پس یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ جب دوسرے لوگ اس لئے
جلسے کرتے ہیں کہ چھینا جھپٹی کر کے خود فائدہ اٹھائیں۔ ہم اس لئے
جمع ہوتے ہیں کہ دنیا میں امن قائم کریں۔ راستی اور انصاف پر
دنیا کو کاربند کریں۔ پس ساری دنیا ہماری مخاطب ہے اور ہم ساری
دنیا کی خدمت کرنے والے ہیں۔ اور یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا
فضل اور احسان ہے۔"[1]

۱۹۲۲ء کی یہ مجلس مشاورت جو ایک باقاعدہ ادارہ کی پہلی کڑی تھی، جماعت کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے بالخصوص حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا افتتاحی خطاب جس میں آپ نے مجلسِ شوریٰ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلامی طریقِ مشاورت آدابِ شوریٰ، رائے دہندہ کے فرائض، ایجنڈے پر غور کا طریق اور شوریٰ کے فیصلے اور ان کی حیثیت کو بیان فرمایا ہے۔ آپ کی یہ افتتاحی تقریر جماعت احمدیہ کے نظامِ شوریٰ کے لئے بلاشبہ ایک چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ فکر و تدبّر اور علم و عرفان کا ایک بہتا ہوا دریا ہے اور حضور کی ان استعدادوں کا منہ بولتا ثبوت ہے جو ایک عظیم مصلح میں بدرجہ اتم پائی جانی چاہئیں اس خطاب میں سے بعض ایسے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو جماعت احمدیہ کے نظامِ شوریٰ کا تعارف کروانے کے لئے کافی و شافی ثابت ہوں گے اور کسی مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت انشاء اللہ پیش نہ آئے گی۔

مجلس مشاورت کی ضرورت بیان کرتے ہوئے حضور رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

"سب سے پہلے مَیں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مجلس جس کو پرانے نام کی
وجہ سے کارکن کانفرنس کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں کیا چیز
ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا شیوہ یہ ہے کہ
اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ اپنے معاملات میں مشورہ لے لیا
کریں۔ مشورہ بہت مفید اور ضروری چیز ہے اور بغیر اس کے کوئی

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صفحہ ۱-۲

کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس مجلس کی غرض کے متعلق مختصر الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی اغراض جن کا جماعت کے قیام اور ترقی سے گہرا تعلق ہے ان کے متعلق جماعت کے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ لے لیا جائے، تاکہ کام میں آسانی پیدا ہو جائے یا ان احباب کو ان ضروریات کا پتہ لگے جو جماعت سے لگی ہوئی ہیں تو یہ مجلس شوریٰ ہے۔" [1]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشورہ کا طریق بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"اب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خلفاء کے زمانہ میں مشورہ کا جو طریق تھا وہ بیان کرتا ہوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاء تین طریقے سے مشورہ لیتے تھے۔

(۱) جب مشورہ کے قابل کوئی معاملہ ہوتا تو ایک شخص اعلان کرتا کہ لوگ جمع ہو جائیں اس پر لوگ جمع ہو جاتے۔ عام طور پر یہی طریق رائج تھا کہ عام اعلان ہوتا اور لوگ جمع ہو کر مشورہ کر لیتے اور معاملہ کا فیصلہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا خلیفہ کر دیتے۔ . . . . . .

(۲) دوسرا طریق مشورہ کا یہ تھا کہ وہ خاص آدمی جن کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مشورہ کا اہل سمجھتے ان کو الگ جمع کر لیتے۔ باقی لوگ نہیں بلائے جاتے تھے۔ جن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مشورہ لیتے تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے تیس[۳۰] کے قریب ہوتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سب کو ایک جگہ بلا کر مشورہ لے لیتے۔ کبھی تین چار کو بلا کر مشورہ لے لیتے۔

(۳) تیسرا طریق یہ تھا کہ آپؐ کسی خاص معاملہ میں جس میں آپؐ سمجھتے تھے کہ دو آدمی بھی جمع نہ ہونے چاہئیں۔ علیحدہ علیحدہ مشورہ لیتے۔ پہلے ایک کو بلا لیا۔ اس سے گفتگو کر کے اس کو روانہ کر دیا اور دوسرے کو بلا لیا۔ یہ ایسے وقت میں ہوتا جب خیال ہوتا کہ ممکن ہے رائے کے اختلاف کی وجہ سے دو بھی آپس میں لڑ پڑیں۔

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۴

یہ تین طریقے تھے مشورہ لینے کے اور یہ تینوں اپنے اپنے رنگ میں بہت مفید ہیں۔ مَیں بھی ان طریق سے مشورہ لیتا ہوں۔" [1]

آدابِ مشورہ

مشورہ کے لئے ہدایات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

"ہمارے مشورے تبھی مفید ہو سکتے ہیں کہ خدا پر نظر رکھیں۔ اس لئے پہلی نصیحت مَیں یہ کرتا ہوں کہ ہر شخص خدا کی طرف توجہ کرے اور دعا کرے کہ الٰہی! مَیں تیرے لئے آیا ہوں۔ تو میری راہ نمائی کر۔ کسی معاملہ میں میری نظر ذاتیات کی طرف نہ پڑے۔ نہ ایسا ہو کہ کوئی رائے غلط دُوں۔ اور اس پر زور دُوں کہ مانی جائے اور اس سے دین کو نقصان پہنچے۔ نہ ایسا ہو کہ کوئی ایسی رائے دے جو ہو تو غلط مگر اس کی چکنی باتوں یا طلاقتِ لسانی سے مَیں اس سے متفق ہو جاؤں۔ مَیں تجھ سے دُعا کرتا ہوں کہ نہ ایسا ہو کہ مجھ میں نفسانیت آجائے۔ یا اپنی شہرت و عزت کا خیال پیدا ہو یا یہ کہ بڑائی کا خیال پیدا ہو یا یہ کہ بڑائی کا خیال آجائے۔ نہ ایسا ہو کہ میری رائے غلط اور مضر ہو۔ نہ یہ ہو کہ میں کسی کی غلط رائے کی تائید کروں۔ میری نیّت درست رہے۔ میری رائے درست ہو اور تیری منشاء کے ماتحت ہو۔ یہ دُعا ہر دوست کو کرلینی چاہیئے اور ہمیشہ کرنی چاہیئے۔ جب بھی ہماری جماعت مشورہ کرنے لگے۔ صرف آج کے لئے ہی نہیں۔

۲- یہ کہ پہلی نصیحت دُعا کے متعلق ہے مگر کوئی دعا قبولیت کا جامہ نہیں پہنتی جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ مثلاً انسان دُعا تو کرے کہ اُسے خدمتِ دین کی توفیق ملے۔ مگر عملاً ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو اُسے کیا توفیق ملے گی۔ تو دُعا

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۶-۷

کے ساتھ عمل کی ضرورت ہے۔ اس لئے مَیں نصیحت کرتا ہوں کہ آج بھی اور کل بھی اور پھر بھی جب کبھی مشورہ ہو ذاتی باتوں کو دل سے نکال دیا جائے۔ لوگوں نے بعض باتیں دل میں بٹھائی ہوتی ہیں کہ یہ منوائیں گے۔ لیکن مشورہ کے یہ معنی نہیں کہ ایسی باتوں کو بیان کرو بلکہ یہ ہیں کہ اپنے دماغ کو صاف اور خالی کر کے بیٹھو اور صحیح بات بیان کرنی چاہیئے۔ عام طور پر لوگ فیصلہ کر کے بیٹھتے ہیں کہ یہ بات منوانی ہے اور پھر اس کی پیچ کرتے ہیں۔ مگر ہماری جماعت کو یہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ صحیح بات ماننی اور منوانی چاہیئے۔

۳۔ یہ کہ جب مشورہ کے لئے بیٹھیں تو مقدم نیّت یہ کر لیں کہ جس کام کے لئے مشورہ کرنے لگے ہیں اس میں کس کی رائے مفید ہو سکتی ہے نہ یہ کہ میری رائے مانی جائے۔

۴۔ یہ بات مدِّنظر رکھنی چاہیئے کہ آج بھی اور آئندہ بھی ہر وقت جب مشورہ لیا جائے کسی کی خاطر رائے نہیں دینی چاہیئے۔ بعد میں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ میری تو یہ رائے نہ تھی مگر فلاں دوست نے کہا تھا اس لئے دی تھی۔ روپیہ غبن کرنا اتنا خطرناک نہیں جتنی یہ بات خطرناک ہے مگر یہ ایسی آسان سمجھی جاتی ہے کہ بڑے بڑے مدبّر بھی اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ہندوستان کی کونسل کا واقعہ ہے کہ ایک ممبر نے کہا میری یہ رائے نہ تھی مگر فلاں دوست نے چونکہ کہا تھا اس لئے مَیں نے اس کی خاطر رائے دے دی۔ تعجب ہے اس نے اس بات کے بیان کرنے میں بھی کوئی حرج نہ سمجھا مگر یہ سخت بد دیانتی ہے۔ ہماری جماعت کے لوگ اس سے بچیں اور کسی کی خاطر نہیں بلکہ جو رائے صحیح سمجھیں وہ دیں۔

۵۔ کسی اور حکمت کے ماتحت رائے نہیں دینی چاہیئے بلکہ یہ مدِّنظر ہو کہ جو سوال درپیش ہے اس کے لئے کونسی بات مفید ہے اس کی تشریح میں مثال دیتا ہوں۔ مثلاً ایک سوال پیش ہے کہ فلاں

کام جاری کرنا تو مفید سمجھتے ہیں مگر یہ خیال کر کے کہ اگر جاری ہو گیا تو فلاں اس پر مقرر ہو گا اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ بد دیانتی سے بھی کرتے ہیں اور کبھی اس شخص کو مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر بجائے اس کے کہ اس کے تقرر کا جب سوال آئے تو اس وقت بحث کریں۔ یا اس طرح کہیں کہ اس کو جاری نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ فلاں کے سوا اور کوئی نہیں جسے اس کام پر لگایا جاوے اور وہ موزوں نہیں۔ یہ کہتے ہیں یہ کام ہی موزوں نہیں۔ چونکہ یہ بد دیانتی ہے اس لئے یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یا اس طرح کہ ایک مشن مقرر کرنا ہے جس کے لئے فلاں کو مقرر کرنا ہے۔ اس پر ان کی غرض تو یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ جائے مگر بحث یہ شروع کر دیتے ہیں کہ مشن قائم کرنا ہی ٹھیک نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ اصل معاملہ میں صحیح رائے دینی چاہیئے۔

۶۔ جو سچی بات ہو اُسے تسلیم کرنے سے پرہیز نہیں کرنا چاہیئے خواہ اُسے کوئی پیش کرے مثلاً ایک بات ایسا شخص پیش کرے جس سے کوئی اختلاف ہو مگر ہو سچی۔ تو اگر کوئی اس کو اس لئے چھوڑتا ہے کہ پیش کرنے والے سے اس کی مخالفت ہے تو بد دیانتی کرتا ہے۔

۷۔ چاہیئے کہ کوئی رائے قائم کرتے وقت جلد بازی سے کام نہ لے۔ کئی لوگ پہلے رائے قائم نہیں کرتے مگر فوراً بات سُن کر رائے ظاہر کرنے لگ جاتے ہیں۔ چاہیئے کہ لوگوں کی باتیں سُنیں۔ ان کا موازنہ کریں۔ اور پھر رائے پیش کریں۔ اور نہ ایسا ہو کہ دوسروں کی رائے پر انکار کریں۔

ایک تو میں نے یہ کہا تھا کہ دوسرے کے لئے رائے نہ دی جائے، اور ایک یہ کہ دوسرے کے کہنے پر رائے قائم نہ کی جائے۔ مثلاً ایک کہے فلاں کام میں خرابی ہے۔ دوسرا بغیر خرابی معلوم کئے کہے کہ ہاں خرابی ہے۔ اُسے خود اپنی جگہ تحقیقات کرنی چاہیئے۔

۸۔ کبھی اس بات کا دل میں یقین نہ رکھو کہ ہماری رائے مضبوط

اور بے خطا ہے۔ بعض آدمی اس میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہماری رائے غلط نہیں ہو سکتی اور پھر حق سے دُور ہو جاتے ہیں بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ بچّے بھی عجیب بات بیان کر دیتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بیویوں سے بھی مشورہ پوچھتے تھے۔ حدیبیہ کے وقت بھی جب لوگ غصہ میں تھے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ اُنہوں نے کہا آپ جا کر قربانی کریں اور کسی سے بات نہ کریں آپؐ نے ایسا ہی کیا اور پھر سب لوگوں نے قربانیاں کر دیں۔ تو اپنی کسی رائے پر اصرار نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بڑوں بڑوں سے رائے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اور بعض اوقات معمولی آدمی کی رائے درست اور مفید ہوتی ہے۔ مجلس میں علم کی وسعت کے خیال سے بیٹھنا چاہیئے ہاں یہ بھی عیب ہے کہ انسان دوسرے کی ہر بات کو مانتا جائے۔ سچّی اور علمی بات کو تسلیم کرو اور جہالت کی بات کو نہ مانو۔

۹۔ ہمیشہ واقعات کو مدِّ نظر رکھنا چاہیئے۔ احساسات کی پیروی نہ کرنی چاہیئے۔ کئی لوگ احساسات کو اُبھار دیتے ہیں اور پھر لوگ واقعات کو مدِّ نظر نہیں رکھتے۔ مَیں نے بھی ایک دفعہ احساسات سے فائدہ اٹھایا ہے مگر ساتھ دلائل بھی پیش کئے تھے۔ . . . . . .
احساسات کو تائیدی طور پر پیش کرنا اور ان سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے مگر محض ان کے پیچھے پڑنا یا ان کو اُبھار کر رائے بدلنا خیانت ہے۔ اگر کوئی یہ جانتا ہو کہ اس کے دلائل کمزور ہیں۔ اور پھر وہ جذبات کو اُبھارے تو وہ بددیانت ہے اور اگر کوئی یہ جانتا ہو کہ دلائل غلط ہیں مگر احساسات کے پیچھے لگ کر رائے دے دے تو وہ بھی بددیانت ہے۔

۱۰۔ دو قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن میں دنیوی فائدہ زیادہ ہوتا ہے اور دینی کم۔ چونکہ ہم دینی جماعت ہیں اس لئے ہمیں اس

بات کے حق میں رائے دینی چاہیئے جس میں دینی فائدہ زیادہ ہو۔
۱۱۔ ہمیشہ یہ بات مدِنظر رکھنی چاہیئے کہ ہماری تجاویز نہ صرف غلط نہ ہوں بلکہ یہ بھی مدِنظر رہے کہ جن کے مقابلے میں ہم کھڑے ہیں اُن کی تجاویز سے بڑھ کر اور مؤثر ہوں اور ہمارا کام ایسا ہونا چاہیئے کہ دشمن کے کام سے مضبوط ہو۔

مثلاً اگر ایسی جگہ ایک مکان بناتے ہیں جہاں پانی کی رَو نہیں آتی وہ اگر زیادہ مضبوط نہیں تو خیر لیکن جہاں زور کی رَو آتی ہو، وہاں اگر مضبوط نہیں بنائیں گے تو غلطی ہوگی۔ پس ہماری مجلسِ شوریٰ میں یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ اس میں غلطی نہ ہو بلکہ یہ بھی ہو کہ ایسی اعلیٰ اور زبردست تجاویز ہوں جو دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر ایک تو یہ بات ہے کہ دشمنوں کے مقابلہ سے ہماری کوششیں اور تجاویز اعلیٰ ہوں۔ دوسری یہ کہ ہماری تجاویز ہماری پچھلی تجاویز سے اعلیٰ ہوں۔ ان دونوں باتوں کو بھُولنے سے قومیں تنزّل میں پڑ جاتی ہیں۔ ان میں سے اگر ایک کو چھوڑ دیں تو بھی تنزّل شروع ہو جاتا ہے ....

۱۲۔ رائے دیتے وقت یہ بات دیکھ لینی چاہیئے کہ جو بات پیش ہے وہ واقعہ میں مفید ہے یا مضر۔ مقابلہ میں آ کر کسی معمولی سی بات پر بحث شروع ہو جاتی ہے حالانکہ اس کا اصل بات کے مضر یا مفید ہونے سے تعلق نہیں ہوتا۔ پس فروعی باتوں پر بحث نہ شروع کرنی چاہیئے بلکہ واقعہ کو دیکھنا چاہیئے کہ مفید ہے یا مضر۔
۱۳۔ سوائے کسی خاص بات کے یونہی دُہرانے کے لئے کھڑا نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص بولے۔ ہاں اگر نئی تجویز ہو تو پیش کرے۔
۱۴۔ چاہیئے کہ ہر ایک اپنا وقت بھی بچائے اور دوسروں کا وقت بھی ضائع نہ کرے۔

مشورے اور اس کے اثر کی وضاحت کرتے ہوئے حضور نے فرمایا:۔

یہ نہیں کہ ووٹ لئے جائیں اور ان پر فیصلہ کیا جائے بلکہ جیسا اسلامی طریق ہے کہ مختلف خیالات معلوم کئے جائیں اور مختلف تجاویز کے پہلو معلوم ہوں تاکہ ان پر جو مفید باتیں معلوم ہوں وہ اختیار کر لیں۔ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ خیال پیدا ہوتا کہ کیوں رائے نہ لیں اور ان پر فیصلہ ہو۔ مگر ہمارے لئے دین نے یہی رکھا ہے کہ ایسا ہو فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ۔ مشورہ لو مگر جب ارادہ کر لو تو پھر اس بات کو کر لو۔ یہ نہ ہو کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اور اسلام میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ جب ایران پر حملہ کیا گیا تھا تو دشمن نے ایک پل کو توڑ دیا اور بہت سے مسلمان مارے گئے تھے۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے لکھا کہ مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ اگر جلد فوج نہ آئے گی تو عرب میں دشمن گھس آئیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رائے طلب کی تو سب نے کہا خلیفہ کو خود جانا چاہیئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُن کی خاموشی پر خیال آیا اور پوچھا آپ کیوں چُپ ہیں؟ کیا آپ اس رائے کے خلاف ہیں انہوں نے کہا کہ ہاں مَیں خلاف ہوں۔ پوچھا کیوں تو کہا اس لئے کہ خلیفہ کو جنگ میں شامل نہیں ہونا چاہیئے اس کا کام یہ ہے کہ لڑنے والوں کو مدد دے۔ جو قوم ساری طاقت خرچ کر دے اور جسے مدد دینے کے لئے کوئی نہ رہے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کے جانے پر شکست ہو گئی تو پھر مسلمان کہیں نہ ٹھہر سکیں گے۔ اور عرب پر دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ گئے اور انہی کی بات مانی گئی۔ تو مشورہ کی غرض ووٹ لینے نہیں بلکہ مفید تجاویز معلوم کرنا ہے۔ پھر چاہے تھوڑے لوگوں کی اور چاہے ایک ہی کی بات مانی جائے۔ پس صحابہؓ کا یہ طریق تھا اور یہی قرآن سے معلوم ہوتا ہے اور عارف کے لئے یہ کافی ہے۔"[1]

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۸-۱۳

پارلیمنٹ کی نسبت شوریٰ کے طریق کی فضیلت واضح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"پارلیمنٹ میں یہی ہوتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ رائے نہ ملی تو گورنمنٹ ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے سارے رائے دے دیتے ہیں تو عام طبائع ایسی نہیں ہوتیں کہ صحیح رائے قائم کر سکیں۔ اس لئے اکثر لوگ دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں اگر کہیں کہ وہ اہل الرائے ہوتے ہیں تو بھی یہی ہوتا ہے کہ بڑے کی رائے کے نیچے ان کی رائے دب جاتی ہے اس لئے یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے دونوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر وقت مقابلہ رہتا ہے۔ مگر شوریٰ میں یہ بات نہیں ہوتی کیونکہ اس میں پارٹی کا خیال نہیں ہوتا ...... پس چونکہ پارٹی ہوتی نہیں اور خلیفہ سب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا تعلق سب سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے باپ بیٹے کا۔ بھائی بھائی تو لڑ پڑتے ہیں مگر باپ سے لڑائی نہیں ہو سکتی۔ چونکہ خلیفہ کا سب سے محبت کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ان میں لڑائی بھی ہو جائے تو وہ دور کر دیتا ہے اور بات بڑھنے نہیں پاتی۔"[1]

شوریٰ کے فوائد گنواتے ہوئے فرمایا:۔

"اب میں شوریٰ کے فوائد بیان کرتا ہوں۔

۱۔ کئی نئی تجاویز سوجھ جاتی ہیں۔

۲۔ مقابلہ کا خیال نہیں ہوتا اس لئے لوگ صحیح رائے قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ یہ بھی فائدہ ہے کہ باتوں باتوں میں کئی باتیں اور طریق معلوم ہو جاتے ہیں۔

۴۔ یہ بھی فائدہ ہے کہ باہر کے لوگوں کو کام کرنے کی مشکلات معلوم ہوتی ہیں۔

۵۔ یہ بھی فائدہ ہے کہ خلیفہ کے کام میں سہولت ہو جاتی ہے۔ وہ بھی انسان ہوتا ہے اس کو بھی دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح معلوم ہو جاتا

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۶

ہے۔ کہ لوگوں کا رجحان کدھر ہے۔ یُوں تو بہت نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ غلط راستہ پر نہ پڑجائیں۔ مگر جب شوریٰ ہو تو جب تک اعلیٰ درجہ کے دلائل عام رائے کے خلاف نہ ہوں۔ لوگ ڈرتے ہیں کہ اس پر عمل کریں اور اس طرح خلیفہ کی نگرانی میں سہولت ہوجاتی ہے۔

مجلس شوریٰ کا طریق کار

۱۔ خلیفہ عام ہدایات پیش کرے گا کہ کن باتوں پر مشورہ لینا ہے اور کن باتوں کا خیال رکھنا ہے۔

۲۔ اس کے بعد ہر محکمہ کے لئے سب کیٹیاں مقرر ہوجائیں گی۔ کیونکہ فورًا رائے نہیں دینی چاہیئے۔ بلکہ تجربہ کار بیٹھ کر سکیم تجویز کریں اور پھر اس پر بحث ہو۔ پہلے کمیٹی ضرور ہونی چاہیئے جیسے معاملات ہوں اُن کے مطابق وہ غور کریں سکیم بنائیں پھر اس پر غور کی جائے۔ کمیٹی پوری تفاصیل پر بحث کرے اور پھر رپورٹ کرے۔ وہ تجاویز مجلسِ عام میں پیش کی جائیں اور ان پر گفتگو ہو۔

۳۔ جب تجاویز پیش ہوں تو موقع دیا جائے کہ لوگ اپنے خیالات پیش کریں کہ اس میں یہ زیادتی کرنی چاہیئے یا یہ کمی کرنی چاہیئے۔ یا اس کو یوں ہونا چاہیئے۔ تینوں میں سے جو کہنا چاہے کھڑے ہو کر پیش کردے۔ ان تینوں باتوں کے متعلق جس قدر تجاویز ہوں ایک شخص یا بہت سے لکھتے جائیں پھر ایک طریق یا ایک طرز کی باتوں کو لیکر پیش کیا جائے کہ فلاں یہ کمی چاہتا ہے اور فلاں یہ زیادتی۔ اس پر بحث ہو مگر ذاتیات کا ذکر نہ آئے۔ اس بحث کو بھی لکھتے جائیں۔ جب بحث ختم ہوجائے تو وہ اس وقت یا بعد حلفیہ بیان کردے، کہ یہ بات یوں ہوئی۔"[1]

مجلس شوریٰ کے طریقِ آغاز کے متعلق ہدایت دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"ہماری مجلس کی ابتداء میں ہمیشہ دُعا ہوتی ہے۔ آئندہ میں اس

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۶-۱۷

کے لیے ایک طریق مقرر کر دیتا ہوں۔ ایک دعا افتتاح کے موقعہ پر تینوں دنوں میں ہوا کرے گی اور ایک دعا آخر میں شوریٰ کے اختتام پر۔ گویا شوریٰ کے تینوں دنوں میں چار دفعہ دعا ہو گی ایک پہلے دن پھر دوسرے پھر تیسرے دن ابتداء میں اور پھر شوریٰ کے اختتام پر۔

پس میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو صحیح طور پر غور کرنے اور صحیح نتائج پر پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمارا کام وسیع لیکن ذرائع محدود۔ ذمہ داریاں نہایت اہم لیکن ہمارے مزاج نہایت سُبک۔ ہم اپنی تعلیم کی کمی یا تربیت کے نقص کی وجہ سے اہم چیزوں کو موقعہ پر اہم سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اتنی اہمیت دے دیتے ہیں۔ کہ ہمارا وقت بجائے صحیح طور پر خرچ ہونے کے ضائع ہو جاتا ہے۔ اور ہماری طاقت منتشر ہو جاتی ہے۔ پس ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو عقل اور ہمت بخشے تا کہ ہم ان تھوڑے تھوڑے سے سامانوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر استعمال کر سکیں ہماری تدبیر اور سعی کے نتیجہ میں ہمارے سامان آنے والے کل میں آج سے زیادہ ہوں۔ جو ذمہ داریاں ہمارے سپرد کی گئی ہیں۔ ہم ان کو پورا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہماری باتیں باتیں ہی نہ ہوا کریں۔ بلکہ وہ عمل کا پیش خیمہ ہوں اور ہماری فکر لغو ہی نہ ہو بلکہ وہ ایک سنجیدہ اور اٹل حقیقت ہو جس کے بعد دنیا کا کوئی عزم اس کے آگے ٹھہر نہ سکے اور کوئی طاقت اس کو دبا نہ سکے۔"

"رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ کہ میرے سب صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ انہیں لوگوں نے بڑے بڑے دکھ دیئے۔ بڑے بڑے مصائب ان پر وارد کئے مگر وہ صبر و استقلال سے کام لیتے چلے گئے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے مدرسہ میں سبق پڑھتے پڑھتے انہوں نے نیکی اور تقویٰ کے امتحان میں

کامیابی حاصل کر لی۔ اب تمہارا یہ فرض ہے کہ تم ان کی اتباع کرو۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے لئے نیا راستہ اختیار کرو اپنی تربیت کے لئے نئے مدرسے کھولو اور اپنے آپ کو نئے تجربات کی بھٹی میں سے گزارو تم ان کو دیکھو اور جو کچھ انہوں نے کیا ہو وہی خود بھی کرنے لگ جاؤ۔"[۱]

سب کمیٹیوں کی تشکیل سے متعلق ہدایات

اس موضوع پر کہ سب کمیٹیوں کی تشکیل کیسے کی جائے ہدایات دیتے ہوئے آپ نے عام رسمی طریقِ کار بھی معین فرمایا اور باریک در باریک مصالح کو بھی پیشِ نظر رکھا اور ان غلطیوں کی نشاندھی بھی کی جو ایسے مواقع پر ارادی یا غیر ارادی طور پر سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس ضمن میں حسب ذیل دو اقتباسات پیشِ خدمت ہیں؛

"سب کمیٹیوں کے لئے ایسے آدمی کا نام پیش کرنا چاہیئے جو اس کا اہل ہو۔ یہ ضروری ہے جس فن کے متعلق کسی کا نام پیش کریں وہ اسے سمجھتا ہو۔ اگر مالی معاملہ ہو تو اُسی دوست کا نام تجویز کیا جائے جو وسعتِ معلومات بھی رکھتا ہو اور اپنے علاقہ کے حالات اور چندہ کی وصولی وغیرہ کا اُسے تجربہ ہو یا چندوں کے حصول میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کو وہ جانتا ہو یا وہ ذرائع جو جماعت کی ترقی کے لئے اختیار کرنے ضروری ہیں اُن سے آگاہ ہو۔ پھر یہ بھی مدِنظر رہے کہ ایسے نمائندے جو پاکستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں کمیٹیوں میں ضرور آنے چاہئیں۔ گویا بنگال۔ کراچی۔ سندھ بلوچستان۔ کشمیر۔ سرحد۔ بہاولپور۔ پنجاب آٹھ صوبے ہیں۔ آٹھ صوبوں کی نمائندگی ہونی چاہیئے۔ پنجاب کی جماعتیں چونکہ زیادہ ہیں اس لئے لازمًا ان کی نمائندگی بھی زیادہ ہوگی۔ مگر ایسے آدمی آنے چاہئیں جو ہمیں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکیں۔"[۲]

---

[۱] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۵۱ نیز دیکھیں رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۱۲
[۲] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۲ء صفحہ ۴-۵۔

اس سلسلہ میں ایک اور موقع پر نمائندگان کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا۔

"سب کمیٹیوں کے لئے ممبران کا انتخاب کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ مجھے شکایت پہنچی ہے کہ اس بارہ میں دوست اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے بلکہ خود میرے کانوں نے ایک دفعہ سُنا کہ ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ فلاں سب کمیٹی کیلئے میرا نام پیش کردو۔ کسی سب کمیٹی کے لئے خود اپنا نام پیش کر دیا بشرطیکہ جس امر پر غور کرنے کے لئے سب کمیٹی بنائی گئی ہو اس میں کوئی مہارت رکھتا ہو کوئی حرج کی بات نہیں مگر دوسرے سے اپنا نام پیش کرانا اور کہنا کہ تم میرا نام پیش کرو ایک معیوب امر ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عہدہ کے لئے اپنا نام پیش نہ کرو۔ تاہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں چونکہ وہی لوگ شامل ہوتے تھے جو رات دن آپ کے قرب وجوار میں رہتے تھے اس لئے آپ جانتے تھے کہ کون مشورہ دینے کا اہل ہے اور کون نہیں مگر ہماری مجلس شوریٰ مختلف جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور مَیں ہر ایک کے متعلق نہیں جانتا کہ وہ کسی امر کے متعلق مشورہ دینے کا اہل ہے یا نہیں۔ اگر قادیان کے لوگوں تک ہی یہ مجلس شوریٰ محدود ہو تو مَیں خود ہی سب کمیٹیوں کے لئے ممبروں کا انتخاب کرلوں لیکن چونکہ ہماری اس مجلس میں بیرونی جماعتوں کے دوست بھی کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ اور مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون قانون کے متعلق زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ کون اخلاق کے متعلق کون تعلیم کے متعلق کون آڈٹ کے متعلق زیادہ واقفیت رکھتا ہے اس لئے اگر کوئی دوست اپنا نام پیش کردیں یا کوئی دوست اپنی ذاتی واقفیت کی بناء پر کسی اور دوست کا نام پیش کردیں تو یہ کوئی معیوب بات نہیں لیکن دوسرے کو کہنا کہ تم میرا نام پیش کرو سخت معیوب بات ہے۔"[1]

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۴۱ء صفحہ ۸

وقتاً فوقتاً آپ سب کمیٹیوں کی بھی رہنمائی فرمایا کرتے تھے جو نہایت قیمتی نصائح پر مشتمل ہوتی۔

"جو سب کمیٹی بجٹ پر غور کرے وہ آمد بڑھانے کے ذرائع پر پوری طرح غور کرے۔ اب جنگ کے ختم ہونے کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اور جنگ کے خاتمہ پر آمد پر بہت اثر پڑے گا۔ اس سے پہلی جنگ کے متعلق ہمارا جو تجربہ ہے وہ یہ ہے کہ جنگ کے ختم ہونے کے معاً بعد آمدنی کم ہوگئی اور یہ کمی برابر دس سال تک جاری رہی ۔ پس اس وقت غور کرنا چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ آمدنی کس طرح بڑھائی جاسکتی ہے۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ ریزروفنڈ قائم کرلینا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی غور کرنا چاہیئے کہ جس قدر خرچ گھٹایا جاسکے گھٹا دیا جائے"۔[1]

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۴۵ء صفحہ ۵

نظامِ مجلس شوریٰ کی امتیازی خصوصیات اور تدریجی ترقی

مجلس مشاورت کا نظام ایک دلچسپ اور اہم مطالعہ کا مواد پیش کرتا ہے۔ ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۶۵ء تک یہ ادارہ براہِ راست حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی زیرِ تربیت اور زیرِ نگرانی نشوونما پاتا رہا۔ اس میں جو بھی نئی نئی شاخیں نکلیں اور جو خدوخال ظاہر ہوئے وہ دو امور کی بالخصوص عکاسی کرتے ہیں۔

اوّل۔ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اسلام کے مشاورتی نظام کا تصور کیا تھا۔

دوم۔ اس تصور کے نفاذ میں اور عملی صورت میں اُسے باحسن جاری کرنے میں آپ نے کیا اہم کردار ادا کیا۔

جماعت احمدیہ میں رائج مجلس شوریٰ کے نظام کا مطالعہ فی ذاتہٖ بھی اس زمانہ میں خاص دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ مذاہب اور نظریات کے موازنہ میں دلچسپی رکھنے والے اہلِ فکر ونظر کے لئے یہ تحقیق کا ٹھوس مواد اور اسلامی نظام شوریٰ کا دیگر مذہبی اور غیر مذہبی مشاورتی اداروں سے مقابلہ اور موازنہ کا بہترین موقعہ فراہم کرتا ہے۔

ضمناً یہ ذکر بے جا نہ ہو گا کہ اس زمانہ میں بعد ازاں جماعت اسلامی کے سربراہ جناب مولوی مودودی صاحب نے بھی جماعت اسلامی میں ایک مجلس شوریٰ قائم کی۔ قطع نظر اس سوال کے کہاں تک انہوں نے نظام جماعت احمدیہ سے استفادہ کیا یا برعکس شکل اختیار کی۔ اُن کے تصورِ اسلام اور جماعت احمدیہ کے تصورِ اسلام کی عملی تشکیل کی ان دو صورتوں کے مابین مقابلہ و موازنہ کا مضمون آئندہ محققین کے لئے ایک دلچسپ مطالعہ کا سامان فراہم کرے گا۔ اور دن بدن یہ حقیقت زیادہ عیاں اور روشن تر ہوتی چلی جائے گی کہ دونوں نظاموں میں سے کونسا نظام درحقیقت الٰہی نظام کہلانے کا مستحق ہے اور خدا تعالیٰ کی براہِ راست آسمانی ہدایت اور رہنمائی کے تحت جاری ہوا ہے۔

اب ہم ذیل میں اس مشاورتی ادارے کے خدوخال کو اجمالی صورت میں پیش کرتے ہیں جماعت احمدیہ میں مجلس مشاورت کا نظام نظامِ خلافت سے وابستہ اور اسی پر منحصر ہے اور

جماعت احمدیہ کے نزدیک خلیفۃ المسیح شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ کے مخاطب کی حیثیت سے جب چاہے اور جس رنگ میں چاہے مشورہ کے لئے صائب الرائے احباب کو دعوت دے سکتا ہے۔

۲- ہر ایسے مشورہ کی ابتداء دعاؤں اور ذکر الٰہی کے ساتھ ہوتی ہے تاکہ فیصلہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف اور تقویٰ مدنظر رہے اور اس کی نصرت اور رہنمائی شامل حال رہے۔

۳- ہر وہ شخص جسے کوئی مشورہ پیش کرنا ہو اُسے پوری آزادی ہے کہ باجازت صدر مجلس بے تکلفانہ رائے کا اظہار کرے۔ لیکن ضروری ہے کہ اس مشورہ میں اصل مخاطب حاضرین مجلس نہ ہوں بلکہ خلیفۃ المسیح ہوں بعد مشورہ خلیفۃ المسیح کو پورا اختیار ہے کہ خواہ کثرتِ رائے کے مشورہ کو قبول کریں یا ردّ کر دیں۔ یہ جماعت کی مجلس مشاورت کے نظام کا اصولی خلاصہ ہے۔

اب ہم اس کے ارتقائی ادوار کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور خصوصاً ایسے پہلوؤں کو ہم ملحوظ رکھیں گے جو کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے حضرت خلیفۃ المسیح کی قلبی ذہنی اور رُوحانی صلاحیتوں پر روشنی ڈالنے والے ہوں۔

ابتداء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے نمائندوں کے انتخاب کا یہ طریق اختیار فرمایا کہ جن صائب الرائے دوستوں کو آپ ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اور ان کی ضرورت محسوس فرماتے تھے ان کو براہِ راست دعوت دے کر مجلسِ مشاورت میں شمولیت کے لئے بلایا جاتا تھا۔ لیکن اکثر ممبرانِ مجلسِ مشاورت ایسے نمائندگان پر مشتمل ہوتے تھے جنہیں جماعت احمدیہ کی مختلف شاخیں یعنی مقامی جماعتیں اپنے میں سے صائب الرائے سمجھ کر یا کسی ایسے فن کا ماہر دیکھ کر جس پر بحث مطلوب ہو منتخب کر لیتی تھیں۔ لیکن تعدادِ نمائندگی پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جب جماعت کی تعداد بڑھ گئی اور مجلس مشاورت کے متعلق دلچسپی میں بھی نمایاں اضافہ ہو گیا۔ تو ضروری سمجھا گیا کہ تعدادِ نمائندگان کی حد بندی کی جائے اس ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

> "اس سال نمائندگان کے انتخاب کو بعض خاص شرائط عائد کر کے محدود کر دیا گیا ہے۔ بعض جماعتوں کو اس طرح اب کلّی آزادی حاصل نہیں رہی کہ وہ اپنی جماعتوں میں سے جتنے نمائندے چاہیں بھجوا دیں۔ بلکہ حد بندی کر دی گئی ہے اور جوں جوں ہماری جماعت ترقی کرے گی اس کے ساتھ ساتھ یہ پابندیاں شاید اور بھی بڑھانی پڑیں گی بلکہ

شاید کیا یقیناً ایسا وقت آئے گا جب بجائے جماعتوں کے مختلف اضلاع
بلکہ صوبوں سے نمائندے منتخب کرنے پڑیں گے۔ کیونکہ کوئی مجلسِ شوریٰ
ایسی وسیع نہیں ہو سکتی کہ ہزاروں لاکھوں آدمی اس میں بُلائے جاسکیں
جب خدا ہماری جماعت کو ساری دنیا میں پھیلا دے گا تو اس وقت
ضلعوں اور صوبوں بلکہ مختلف ملکوں کے نمائندے ہی لئے جائیں گے
ہر جماعت سے نمائندہ نہیں لیا جا سکے گا۔ پس اس پابندی پر جماعتوں
کو بُرا نہیں منانا چاہیئے یہ ایک مجبوری ہے اور یہ مجبوری اب بڑھتی
ہی جائے گی۔ لیکن بہرحال جب تک چھوٹی جماعتوں کو اپنے نمائندے
بھیجنے کا حق حاصل ہے انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے حق سے فائدہ اُٹھائیں
اور مجلس شوریٰ کے موقع پر بہترین نمائندے منتخب کرکے بھیجا کریں۔"[1]

نمائندگی کا یہ طریق اب تک جاری ہے البتہ نمائندگان کی تعداد میں مختلف حالات کے پیشِ نظر ترمیم ہوتی رہتی ہے۔

منتخب نمائندوں کے علاوہ تمام جماعتوں کے امراء بحیثیت اپنے عہدے کے اس مجلس کے ممبر ہوتے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے صحابہ کو بھی بحیثیت صحابی نمائندگی کا حق دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مرکزی تنظیمات کو بھی مجلس مشاورت میں بحیثیت عہدیدار مختلف شعبوں کی نمائندگی کا حق دیا جاتا ہے اور یہ طریق بھی مسلسل جاری ہے۔ کہ خلیفۂ وقت منتخب نمائندگان کے علاوہ ایسے اہلِ علم و فن دوستوں اور بزرگوں کو براہِ راست دعوت بھیجتے ہیں جن کی شمولیت خلیفۃ المسیح کے نزدیک کسی پہلو سے مفید ہو سکتی ہے۔

عورتوں کی نمائندگی

ابتداء میں مستورات کی آراء معلوم کرنے کا کوئی علیحدہ انتظام نہ تھا لیکن ۱۹۳۰ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے حسب ذیل طریق پہ اہم مسائل پر عورتوں کی آراء معلوم کرنے کا طریق معیّن فرمایا۔

"عورتوں کے حقِ نمائندگی کے متعلق مَیں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ جہاں

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۳ نیز دیکھیں رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۵

جہاں لجنہ اماء اللہ قائم ہیں وہ اپنی لجنہ رجسٹرڈ کرائیں یعنی میرے دفتر سے اپنی لجنہ کی منظوری حاصل کریں۔ ان کو جنہیں میری اجازت سے منظور کیا جائے گا مجلس مشاورت کا ایجنڈا بھیج دیا جائے وہ رائے لکھکر پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس بھیج دیں۔ میں جب ان امور پر فیصلہ کرنے لگوں گا تو ان آراء کو بھی مدِ نظر رکھ لیا کروں گا۔ اس طرح عورتوں اور مردوں کے جمع ہونے کا جھگڑا بھی پیدا نہ ہوگا اور مجھے بھی پتہ لگ جائے گا کہ عورتیں مشورہ دینے میں کہاں تک مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اُن کی رائیں فیصلہ کرتے وقت مجلس میں سُنا دی جائیں گی"[1]

۱۹۴۱ء تک اسی طریق پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن جب آپ نے اس طریق میں کئی نقص محسوس کئے تو ۱۹۴۱ء کی مجلس شوریٰ میں اس میں تبدیلی کرتے ہوئے حسب ذیل فیصلہ فرمایا:۔

"ایک ضروری بات میں لجنہ کی نمائندگی کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں ہر سال لجنہ سے رائے لی جاتی ہے اور ہر سال اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے اور کبھی اُسے مجلس شوریٰ میں پیش نہیں کیا جاتا۔ میری تجویز یہ ہے کہ آئندہ مجلس شوریٰ میں ایک لجنہ اماء اللہ کا نمائندہ بھی ہوا کرے۔ اور بیرونی جماعتوں کی لجنات سے جو تجاویز پرائیویٹ سیکرٹری کو موصول ہوں وہ سب دفتر پرائیویٹ سیکرٹری لجنہ کے اس نمائندے کو پہنچا دیا کرے۔ اس نمائندے کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ہر موقع پر لجنات کی رائے بھی پیش کرتا چلا جائے اور بتائے کہ فلاں لجنہ کی اس کے متعلق یہ رائے ہے اور فلاں کی یہ رائے۔ اس طرح نہ صرف ان کی آراء کا پتہ لگ جائے گا بلکہ ممکن ہے کہ بعض دفعہ کوئی لطیف اور مفید بات بھی معلوم ہو جائے۔ اور اگر اس طریق کا کوئی اور فائدہ نہ بھی ہوا تو بھی کم سے کم اس طرح یہ پتہ لگتا رہے گا کہ ہماری جماعت کی مستورات کی دینی ترقی کا کیا حال ہے جب ان کی آراء پڑھی جائیں گی تو اس وقت معلوم ہوگا کہ

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۲۷

بعض دفعہ تو ان کی رائے نہایت ہی مضحکہ خیز ہو گی جس سے ہم یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ فلاں فلاں معاملہ میں عورتوں کو حالات کا بالکل علم نہیں اور بعض دفعہ ان کی رائے بہت اعلیٰ ہو گی جس سے ہم یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ فلاں فلاں معاملہ میں عورتوں کا علم زیادہ پختہ ہے۔ تو ان کی آراء پڑھے جانے پر ہماری جماعت کے دوست ساتھ ساتھ یہ موازنہ بھی کرتے چلے جائیں گے کہ ہماری عورتوں کی دماغی اور ذہنی ترقی کس طرح ہو رہی ہے اور بعض دفعہ یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ یہ دیکھ کر کہ عورتوں کی فلاں معاملہ میں جو اِن کی ذات سے تعلق رکھتا ہے یہ رائے ہے وہ ان کا احترام کرتے ہوئے اپنی رائے بدل لیں اور انہی کے حق میں فیصلہ کر دیں۔“ [1]

حاضری کا معیار

جماعت احمدیہ کی مجلس شوریٰ کے ممبران سے جو توقعات وابستہ ہیں ان کا معیار اتنا بلند ہے کہ دنیا کے کسی بھی ہم شکل ادارہ میں انفرادی طور پر ممبران کے اخلاق و آداب اور نظم و ضبط کے بارہ میں ایسی بلند توقعات تو درکنار اس کا عشر عشیر بھی پیشِ نظر نہیں رکھا جا سکتا۔ مجلسِ مشاورت کے کورم کو ہی لیجئے۔ توقع یہ کی جاتی ہے کہ سو فیصد نمائندگان حاضر ہوں اور مسلسل حاضر رہیں اور وقت کی پابندی اتنی ہو کہ خلیفۂ وقت یا ان کے نمائندہ کے آنے سے قبل تمام نمائندگان اپنی اپنی نشستوں پر موجود ہوں۔ یہ نظم و ضبط کی عادت اور حاضری کا یہ بلند معیار بھی بلاشبہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی عظیم الشان تربیت کا مرہونِ منت ہے۔ آپ نے ابتداء ہی سے ایسے خطوط پر مجلس مشاورت کو چلایا کہ نظم و ضبط اور حاضری کا اعلیٰ معیار گویا اس مجلس کی فطرتِ ثانیہ بن گیا۔ حاضری کی ایسی تعداد جو دنیا کی کسی دوسری مجلس میں قابلِ فخر سمجھی جا سکتی ہے آپ کے نزدیک قابلِ افسوس شمار ہوتی تھی ایک موقع پر حاضری کی کمی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

”کل ۴۴۲ نمائندے مجلس میں شامل ہیں اور اس وقت صرف ۱۱۴ دوست

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۱۷-۱۱۸

موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے ممبران کے نام ٹکٹ جاری کئے گئے تھے وہ سارے کے سارے اجلاس میں موجود نہیں۔ اور یہ افسوسناک امر ہے۔ میرے نزدیک جو ممبرانِ شوریٰ اس وقت اجلاس میں حاضر نہیں ان کا پتہ لگایا جائے کہ وہ کون کون ہیں اور انہیں آئندہ کے لئے شوریٰ کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا جائے۔ وہ گھر سے شوریٰ میں شامل ہونے کے لئے آئے ہیں لیکن اجلاس میں وہ حاضر نہیں ہوئے۔ مَیں بیماری کے باوجود شوریٰ میں شامل ہونے کیلئے نتھیا گلی (حضور ان دنوں نخلہ میں قیام فرما تھے) سے چل کر یہاں آیا ہوں اور یہ لوگ ربوہ میں موجود ہونے کے باوجود یہاں حاضر نہیں ہوئے۔“ ؎۱

مجلس شوریٰ کے ایجنڈے کی ترتیب اور ردّ شدہ تجاویز

مجلس مشاورت میں جو ایجنڈا پیش ہوتا ہے اس کی ترتیب کے متعلق حضور نے جو طریق کار مقرر فرمایا وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں یا افراد اپنی تجاویز جو وہ مناسب سمجھیں حسب قواعد دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں ارسال کر دیتے ہیں یہ تجاویز پرائیویٹ سیکرٹری صاحب صدر انجمن احمدیہ میں بھجوا دیتے ہیں۔ صدر انجمن احمدیہ ان تجاویز پر غور کر کے اپنی رائے کے ساتھ انہیں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں پیش کرتی ہے کہ اس کے نزدیک کونسی تجاویز اس سال کی مجلس شوریٰ میں پیش کرنے کے لائق ہیں اور کون سی قابلِ ردّ ہیں۔ یہ ردّ شدہ تجاویز شوریٰ کے اجلاس میں پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تاکہ نمائندگان کو معلوم ہو کہ اس سال کس نوعیّت کی تجاویز جماعتوں نے ارسال کی تھیں اور کون سی تجاویز کو صدر انجمن احمدیہ نے شوریٰ میں پیش کرنے کی رائے نہیں دی۔ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس طریق کار کے سلسلہ میں صدر انجمن احمدیہ کو یہ ہدایت فرمائی کہ

”جن تجاویز کو صدر انجمن احمدیہ نے ردّ کر دیا ہے مناسب یہ تھا، کہ صدر انجمن احمدیہ ان کو ردّ کرنے کی وجہ بھی ساتھ ہی بیان کر دیتی

؎۱ رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۲

تاکہ دلوں پر یہ اثر نہ ہوتا کہ صدر انجمن احمدیہ نے بعض نہایت ہی مفید تجاویز کو بغیر غور و فکر کرنے کے یُونہی ردّ کر دیا ہے اور اگر ان کے جواب کے بعد بھی کسی قسم کی کمزوری رہ جاتی تو جماعت کو غور کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ اور صدر انجمن کو صحیح مشورہ حاصل ہو جاتا...... وجوہ بیان کئے بغیر نہیں کہا جا سکتا کہ کس بناء پر انہوں نے تجاویز کو ردّ کیا ہے...... تجاویز کو ردّ کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان کو ردّ کرنے کی وجوہ بھی بیان کریں اور درحقیقت اگر وہ غور کریں تو اُن کا اپنا فائدہ بھی اسی میں ہے اگر وہ محض تجاویز سُنا دیں اور ان کو ردّ کرنے کی وجوہ بیان نہ کریں تو لوگ کہیں گے کہ انجمن والے کیسے کم عقل ہیں جن باتوں میں اپنی عزت اور نیک نامی ہے ان کو بھی وہ ردّ کر رہے ہیں۔ پس انجمن کے ناظر اگر دنیا کی نگاہ میں کم عقل بننا نہیں چاہتے تو وہ تجاویز کو ردّ کرنے کے ساتھ ہی دلیل بھی دیا کریں تا لوگ سمجھ سکیں کہ محض قلتِ تدبّر سے نہیں بلکہ کسی معقولیّت کی بناء پر اُن کو ردّ کیا گیا ہے۔"[1]

فیصلوں کی منظوری کا طریق

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ آخری فیصلے پر پہنچنے سے قبل حاضرینِ مجلس کو اظہار رائے کی نہ صرف آزادی دیتے تھے بلکہ بعض اوقات ایسے دوستوں کو جو خاموش طبع ہوں اور پبلک میں خطاب سے جھجکتے ہوں لیکن صائب الرائے اور وقیع ہوں خود بلوا کر اظہارِ رائے کی ترغیب دیتے پھر اس بات کو بھی ملحوظ رکھتے تھے کہ کوئی اہم مشورہ میں شمولیت سے محروم نہ رہ جائے۔ بعض اوقات دیہاتی نمائندوں کو خاص طور پر بُلوا کر اُن کی آراء لیتے۔ بعض اوقات شہری یا قصباتی نمائندوں کو کبھی تجار کو بلوایا جاتا۔ کبھی اہلِ حرفت دوستوں کو، کبھی وکلاء کبھی ڈاکٹروں کبھی اساتذہ کو نام لے کر رائے دینے کی ترغیب دی جاتی۔ پابندی اگر تھی تو صرف اتنی کہ اخلاق کی حدود سے کوئی تجاوز نہ کرے اور ذاتیات میں نہ اُلجھے۔

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۶-۱۸

اسی طرح وقت کی قیمت کا احساس پیدا کرنے کے لئے بھی تربیت دی جاتی کہ جو نکتہ ایک مرتبہ بیان ہو چکا ہے بعد میں آنے والا مقرر اُسے دُہرا کر وقت ضائع نہ کرے۔ اگر کسی شخص کو رائے دیتے وقت کسی پہلو سے غیر محتاط پاتے یا اس میں انانیّت کی بُو دیکھتے یا شخصی دوستی کی بناء پر رائے دینے کا رجحان محسوس فرماتے تو کبھی نرمی اور کبھی سختی کو کام میں لا کر نمائندگان کے دل میں بارہا اس تعلیم کو مزید گہرائی کے ساتھ اتارتے چلے جاتے کہ مشورہ محض لِلّٰہ ہونا چاہیئے اور کسی نفسانی محرّک کو مشورہ میں راہ پانے کی مجال نہیں ہونی چاہیئے۔ اس ماحول میں مشورہ کے بعد جب رائے شماری کی جاتی تو اکثر اوقات ممبران مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہو کر بھاری اکثریت کے ساتھ ایک رائے پر متفق ہو جاتے۔ ہاں کبھی کبھی تقسیم ایسی بھی ہوتی جو تقریباً برابر ہوتی۔ ہر دو صورت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اِلّا ماشاء اللہ اکثریت کی رائے کو بالعموم منظور فرمایا کرتے اور یہی طریق آج تک رائج ہے۔ وہ لوگ جو جماعت احمدیہ کے اس رُوحانی نظام کو دنیاوی پیمانوں سے جانچتے ہیں اور اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر خلیفۂ وقت کو آراء کو ردّ کرنے کا آخری اختیار حاصل ہے تو ایسے مشورہ کا فائدہ ہی کیا اور اس طریق مشورہ کو محض ایک پردہ سمجھتے ہیں جو گویا آمریّت کو چھپائے ہوئے ہے۔ ان کے لئے مجلس مشاورت جماعت احمدیہ کی کارروائیوں کا مطالعہ یقیناً آنکھیں کھولنے کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ حیرت سے اس حقیقت کا مشاہدہ کریں گے کہ خلیفۂ وقت ۹۹ فیصدی سے زائد مرتبہ کثرتِ رائے کی تائید کرتا ہے اور جب کثرت رائے سے اختلاف کرتا ہے تو ایسے قوی دلائل اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتا ہے کہ کثرت رائے ہی نہیں تمام مجلس بالاتفاق خلیفۂ وقت کی رائے کی فضیلت کی قائل ہو جاتی ہے۔ گویا یہ ایک ایسی مجلسِ مشاورت ہے جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو مشوروں کو قبول یا ردّ کرنے کا اختیار رکھنے والا عوامی نمائندوں کی آراء سے متفق ہو یا عوامی نمائندے بشرح قلب اس فیصلہ کرنے والے کے فیصلہ سے مطمئن ہوں دنیا کے پردہ پر ایسے عظیم طوعی اتفاقِ نظر و فکر کی کوئی مثال نظر نہیں آسکتی۔ مزید برآں تربیت یہ کی گئی ہے۔ اور واقعتہً اس طریقِ کار پر سو فیصدی عمل بھی ہے کہ جن دوستوں کی آراء کو کثرت رائے نے ردّ کر دیا ہو وہ آخری فیصلہ کے بعد عملدرآمد کے وقت اپنی رائے کو اتنی بھی اہمیّت نہیں دیتے جو ردّی کی ٹوکری میں پھینکے ہوئے ایک کاغذ کے پُرزے کو ہو سکتی ہے بلکہ بلا استثناء اپنی تمام استعدادوں کے ساتھ کثرت رائے کے اس فیصلہ پر بشرح صدر عمل پیرا ہو جاتے ہیں جیسے

خلیفۂ وقت کی منظوری حاصل ہو اس حیرت انگیز نظامِ مشاورت کی تشکیل و ترویج میں جسے آج ہم انتہائی کامیابی سے روبعمل دیکھتے ہیں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی ۵۲ سالہ محنت اور لگن اور ان تھک محنت کا غالب دخل ہے اور مجلس مشاورت کا جو ورثہ آپ جماعت کے لئے چھوڑ گئے ہیں وہ ایک احسانِ جاریہ ہے جو قیامت تک جماعت کی ہر آنے والی نسل کو مجبور کرتا رہے گا کہ دلی دعاؤں کے ساتھ اس عظیم مصلح کا شکریہ ادا کرتے رہیں واللہ الموفق۔

سمندِ فکر کو ٹھوکروں سے بچانے کے لئے جو سب سے زیادہ شاندار اسلامی اصول آپ نے بار بار ذہن نشین کروایا وہ یہ تھا کہ رائے دیتے وقت محض تقوی اللہ کو پیشِ نظر رکھا جائے دیگر حاضرین کی رائے کا لحاظ تو درکنار آپ کا موحدانہ مسلک تو یہ تھا کہ آخری فیصلہ سے قبل خود خلیفۃ المسیح کی رائے کے باوصف بھی اپنے ذاتی مشورہ کو تبدیل نہ کیا جائے محض للّٰہ ایسی رائے دی جائے جو مشورہ دینے والا دیانتداری کے ساتھ رکھتا ہو۔ ایک مرتبہ اسی طرزِ فکر کو تقویت دینے کی خاطر آپ نے ایجنڈے میں اپنی طرف سے بھی ایک تجویز رکھی اور جب یہ دیکھا۔ کہ بعض مخلصین محض اس لئے اس تجویز کی تائید کر رہے ہیں کہ وہ خلیفۃ المسیح کی طرف سے ہے تو آپ نے اپنے مدّعا کو واضح کرتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی:۔

> "میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ محض اس خیال سے کہ کوئی تجویز میری طرف سے ہے اس پر غور نہ کرنا اور یہ سمجھ لینا کہ جو تجویز خلیفہ کی طرف سے پیش کی گئی ہے اس میں ضرور برکت ہو گی اس لئے ہمیں اس پر غور کرنے کی کیا ضرورت ہے درست نہیں۔ دوستوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ بحیثیت مشیر آپ لوگوں کا فرض ہے کہ دیانتداری کے ساتھ تجاویز پر غور کریں اور اگر سمجھیں کہ کسی تجویز میں نقائص ہیں یا اس پر عمل کرنے سے سلسلہ کو نقصان ہو گا یا مشکلات میں اضافہ ہو گا تو دلیری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں ...... آپ محض اس وجہ سے اس پر غور کرنے سے پہلو تہی نہ کریں کہ میری طرف سے یہ پیش کی گئی ہے۔ بلکہ آپ کے دل کی گہرائیوں سے یہی آواز نکلے کہ اس تبدیلی کی ضرورت ہے تو اُسے چھپائیں نہیں بلکہ دلیری سے

گفتگو کرکے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کریں۔ اگر تغیر کے متعلق مشورہ کو مَیں
قابلِ قبول نہ سمجھوں گا تو اپنی ذمہ داری پر اُسے رد کر دوں گا۔ جب اس
پر عمل کرنے کا وقت آئے اس وقت اختلافِ رائے کے اظہار کی اجازت
نہ ہوگی لیکن مشورہ کے وقت ہر ایک کو اجازت ہے کہ اپنا مشورہ پیش کرے[1]

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا کثرتِ رائے سے اختلاف

نمائندگانِ شوریٰ کی کثرتِ رائے سے اختلاف کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ نے کثرتِ رائے سے اختلاف کیا تو اس اختلاف کی وجہ بیان فرمائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس وقت کے حاضر ممبران آپ کی رائے سے دلی طور پر مطمئن ہو گئے بلکہ آج بھی ہر معقول آدمی ان معاملات پر نظر ڈال کر یقیناً اس فیصلہ تک پہنچے گا کہ آپ کا کثرتِ رائے کو قبول نہ کرنا نہ صرف معقول اور مناسب تھا بلکہ ایسا نہ کرنا قومی مفادات کے لئے مضر ثابت ہوتا۔ کہیں ایک جگہ بھی محقق آپ کے اختلافِ رائے میں آمریت کا شائبہ تک نہ پائے گا۔ یہ تمام امور جماعتِ احمدیہ کے ریکارڈ میں موجود اور رسائل و جرائد میں شائع شدہ ہیں۔ اور ہر دلچسپی رکھنے والے کو دعوتِ فکر و نظر دے رہے ہیں۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

اوّل:۔ مجلسِ شوریٰ میں یہ تجویز پیش تھی کہ صوبائی امیر جمعہ کے روز اگر کہیں موجود ہوں اور وہاں کا امیرِ مقامی کوئی اور شخص ہو تو جمعہ کے پڑھانے کا اصل حق امیرِ مقامی کا ہوگا۔ البتہ صوبائی امیر مقامی امیر کو اطلاع دے کر حسبِ ضرورت جمعہ پڑھا سکے گا۔ اس تجویز کے متعلق جب رائے شماری ہوئی تو اکثریت نے اس کے حق میں رائے دی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اکثریت کے اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مَیں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں اکثریت کی رائے درست نہیں ہے
میرے نزدیک جب تک یہ عہدے الگ الگ ہیں۔ اس وقت تک
یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہاں پراونشل امیر ہو وہاں اُسے اپنے
خیالات کے اظہار اور ان کی اشاعت کے لئے کوئی موقعہ حاصل ہونا

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۰۹)

چاہیئے۔ مجھے تو یہ ذریعہ حاصل ہے کہ اخبار ہے اور اخبار والے میری تقریریں اور خطبے نوٹ کر کے شائع کرتے اور جماعت تک پہنچاتے ہیں مگر صوبہ کی جماعتوں کے امراء کو یہ ذریعہ حاصل نہیں کہ ایک جگہ اپنے جن خیالات کا وہ اظہار کریں وہ سارے صوبہ کی جماعتوں تک پہنچ جائے اس لئے باوجود اس کے کہ اکثریت دوسری طرف گئی ہے مَیں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ اپنے صوبہ میں جہاں بھی پراونشل امیر ہو جمعہ کا خطبہ دینے کا حق اسے مقدّم طور پر حاصل ہوگا۔ اس کی موجودگی میں اس کی اجازت سے لوکل امیر یا کوئی اَور شخص خطبہ پڑھا سکتا ہے۔ ہاں جہاں پر پراونشل امیر موجود نہ ہو یا اس غرض کے لئے کوئی دوسرا امام مرکزِ سلسلہ کی طرف سے مقرر نہ ہو تو خطبہ دینے کا اوّل حق لوکل امیر کو حاصل ہوگا۔"[1]

ثانیاً۔ مجلسِ شوریٰ میں یہ تجویز پیش تھی کہ کراچی اور لاہور اور راولپنڈی کو مقامی ضروریات کے لئے ان کے چندوں کا تیسرا حصّہ بطور گرانٹ دیا جائے۔ جماعت کے مالی حالات کے لحاظ سے یہ تجویز اپنی موجودہ صورت میں درست نہ تھی لیکن اس تجویز کو اپنے اختیارات کے تحت ردّ کرنے کی بجائے آپ نے اس تجویز کے ناموزوں ہونے کے دلائل دیئے اور اس کے نقصان دِہ پہلوؤں کی جماعت کے نمائندگان کے سامنے وضاحت فرمائی۔ چنانچہ اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

"چندوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اگر اس تجویز کو منظور کر لیا جائے، تو قریباً دو لاکھ روپیہ بجٹ آمد سے کم ہو جاتا ہے۔ ہمارا کل بجٹ بارہ لاکھ ننانوے ہزار کا ہے اور اگر یہ دو لاکھ روپیہ اس سے نکال دیا جائے تو آمد دس لاکھ ننانوے ہزار بلکہ اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ اور اس دس لاکھ ننانوے ہزار روپیہ کی آمد سے بارہ لاکھ ننانوے ہزار کے اخراجات چلانا کسی انجمن کی طاقت سے باہر ہے۔ درحقیقت یہ بحث اخراجات کی کمیٹی کے سامنے اُٹھانی چاہیئے تھی کہ اس قدر اخراجات کم کر دیئے جائیں۔ کالج بند کر دو۔ زنانہ کالج بند کر دو

---

[1] مجلس مشاورت ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۸

لنگر خانہ بند کر دو۔ نظارت امور عامہ بند کر دو۔ نظارت اصلاح وارشاد کے کارکنوں کو رخصت کر دو اور اخراجات کے بجٹ کو دس لاکھ ننانوے ہزار پر لے آؤ۔ ورنہ یہ کہ خرچ تو وہی رکھو اور آمد تقسیم کر لو یہ وہی بات ہے جیسے کوئی شخص ایک ناممکن چیز کی خواہش کرے یا جیسے بچے روتے ہیں تو کہتے ہیں ستارے دے دو۔ دس لاکھ ننانوے ہزار میں بارہ لاکھ ننانوے ہزار کے اخراجات کا بجٹ پورا کرنا بھی ستارے لانے والی بات ہے یہ ایک ناممکن العمل بات ہے اس لئے اس تجویز پر رائے دیتے وقت سوچ لیا جائے کہ آیا اس بجٹ کو نامنظور کیا جائے یا رہنے دیا جائے۔ کیونکہ تخفیف کے بعد خرچ نہیں چل سکتا۔ کہا گیا ہے کہ اس کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے اس کی ضرورت ہے لیکن اگر کوئی ضرورت ہو تو اس کے لئے آمد بڑھائی جانی چاہیئے۔"

"دعائیں کرتے رہو اللہ تعالیٰ کو سب طاقت ہے اور وہ سب برکتیں دے سکتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب مجھے خلیفہ بنایا گیا۔ تو خزانہ مقروض تھا اور اس میں صرف اٹھارہ آنے تھے اور اب آپ کا بجٹ تحریک کے سالانہ بجٹ کو ملا کر انتیس لاکھ روپے کا ہے۔ اب دیکھو کُجا اٹھارہ آنے اور کُجا انتیس لاکھ روپیہ۔ تو اللہ تعالیٰ بڑی طاقت ہے ...."[1]

مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی اہمیت

مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حضور نے فرمایا:۔

"مجلس شوریٰ میں جو فیصلہ ہوتا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ خلیفہ کا فیصلہ ہے کیونکہ ہر امر کا فیصلہ مشورہ لینے کے بعد خلیفہ ہی کرتا ہے اس لئے ان فیصلوں کی پوری پوری تعمیل ہونی چاہیئے۔ جب تک

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۷ء صفحہ ۸۳۔۹۱

کام کرنے والوں میں یہ روح نہ ہو کہ جو حاکم ہو اس کے احکام کی اطاعت کی جائے اس وقت تک ان کے حکم کا بھی کوئی احترام نہ کرے گا۔“ [۱]

حقیقت یہ ہے کہ جب تک قانون کی پابندی پورے طور پر نہ کرائی جائے اس وقت تک کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ .... مَیں سمجھتا ہوں قانون کو بدلوائے بغیر اس کا توڑنا جائز نہیں لیکن مجھے جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ان میں سے بہت کم لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔“ [۲]

مجلس شوریٰ کا منصب

مجلس شوریٰ کا منصب اور جماعتی نظام میں اس کا مقام کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضور نے فرمایا۔

”خلیفۂ وقت نے اپنے کام کے دو حصّے کئے ہوئے ہیں ایک حصّہ انتظامی ہے اس کے عہدیدار مقرر کرنا خلیفہ کا کام ہے۔ .... دوسرا حصّہ خلیفہ کے کام کا اصولی ہے اس کے لئے وہ مجلس شوریٰ کا مشورہ لیتا ہے۔ پس مجلسِ معتمدین انتظامی کاموں میں خلیفہ کی ایسی ہی جانشین ہے جیسی مجلسِ شوریٰ اصولی کاموں میں خلیفہ کی جانشین ہے۔“ [۳]

”مجلس شوریٰ ہو یا صدر انجمن احمدیہ خلیفہ کا مقام بہرحال دونوں کی سرداری ہے۔ انتظامی لحاظ سے وہ صدر انجمن احمدیہ کا راہنما ہے اور آئین سازی اور بجٹ کی تعیین کے لحاظ سے وہ مجلس شوریٰ کے نمائندوں کے لئے بھی صدر اور رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔“ [۴]

---

[۱] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۶
[۲] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء
[۳] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۶
[۴] الفضل ۲۷ را پریل ۱۹۳۸ء

مجلسِ مشاورت کا پاکیزہ اور بے مثال ماحول

جماعت احمدیہ کی مجلس شوریٰ صرف اپنے تنظیمی ڈھانچے اور طریقِ کار کے لحاظ سے ہی دُنیا کی دوسری ایسی مجالس سے مختلف نہیں بلکہ اس کی فضا اور ماحول بھی دنیوی مجالس سے اس درجہ مختلف ہیں کہ کوئی ظاہری نسبت نظر نہیں آتی۔ جب تک کوئی شخص اس ماحول کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے۔ وہ اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ تاہم ذیل میں اسے لفظوں میں بیان کرنے کی کسی قدر کوشش کی جائے گی۔

قومیں ایک دن میں نہیں بنا کرتیں۔ بلکہ قومی تربیت سالہا سال کی مسلسل عرقریزی اور بھرپور نگرانی کی محتاج ہوتی ہے۔ مشاورت کے جس ماحول کا مَیں نے ذکر کیا ہے اس کو قائم کرنے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی سالہا سال کی شدید محنت عرقریزی نگرانی اور پُرخلوص دعاؤں کا بہت بڑا دخل ہے۔ اس مشاورت کے گوشہ گوشہ پر جسے ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے کردار اور شخصیّت کی چھاپ ہے اور یہ پاکیزہ ماحول جو آج ہمیں نظر آ رہا ہے اس کا ہر منظر آپ کی یاد دلوں میں تازہ کر دیتا ہے۔ ایک پسماندہ ملک کے ایک پسماندہ علاقہ کے عوام کی تربیت کا کام آپ کو سونپا گیا اور وہ علاقہ دنیا کے کسی معیار کے اعتبار سے بھی مہذّب اور متمدّن کہلانے کا مستحق نہیں تھا۔ بالخصوص پنجاب کی سرزمین تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے خود ہندوستان کے ہی دوسرے علاقوں میں پسماندہ مشہور تھی۔ پس حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا کام ایک انتہائی مشکل کام تھا کیونکہ نہ صرف یہ کہ ایک پسماندہ غیر مہذّب اور غیر متمدّن اور غیر تعلیم یافتہ قوم کو آپ نے تہذیب و تمدّن کے اعلیٰ اصول سکھانے اور ان پر کاربند کروانا تھا۔ بلکہ اسلامی نظامِ مشاورت کی ایک ایسی حسین تصویر عمل کے سانچے میں ڈھالنی تھی۔ جو دنیا کی تمام متمدّن قوموں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ بن جائے۔ اور عمل کے اس میدان میں بھی اسلام کی تعلیم کی برتری دیگر ادیان اور نظریات پر ثابت ہو جائے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ بسا اوقات بار بار کی انتہائی مؤثر تقاریر اور نصائح کے بعد بھی یہ بات مشاہدہ میں آتی کہ سامعین میں سے بعض یا تو بات سمجھتے ہی نہیں یا عادت سے مجبور ہو کر پھر اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بار بار وہی غلطیاں کرتے اور ان کو سمجھانا پڑتا۔ بار بار

وہی ٹھوکریں کھاتے اور ان کو اُٹھانا پڑتا۔ ایک ماں جیسے بچے کو چلنا پھرنا کھانا پینا سکھاتی ہے ایک استاد جیسے بار بار غلطی کرنے والے بچے کو بالآخر صحیح تلفظ سکھا دیتا ہے اسی طرح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جماعت احمدیہ کو مجلس مشاورت کے آداب و اخلاق اور حکمت و فلسفہ سکھانے میں محنت کی۔ اور آخری سانس نہ لیا جب تک اپنے پیچھے ایک ایسا مہذب و متمدن ادارہ مشاورت نہ چھوڑ گئے جو بلاشبہ دنیا کے تمام مشاورتی اداروں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابھی چند صفحات پیشتر ہی قارئین حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ۱۹۲۲ء کی مجلسِ شوریٰ کے افتتاحی خطاب میں سے بعض اقتباسات پڑھ چکے ہیں لیکن تربیت کی کمی کی وجہ سے دوسرے ہی روز جب بعض حاضرین نے بولنے میں عجلت سے کام لیا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

> "کل میں نے سمجھایا تھا۔ کہ صرف بولنے کی خواہش سے نہیں بولنا چاہئیے بلکہ یہ دیکھنا چاہئیے کہ بولنا مفید ہے یا نہیں اور پھر بولنا چاہئیے لیکن بوجہ عجلت کے جو حکمت کا حصہ نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے یونہی بول پڑتے ہیں۔ شائد کہ اپنے ہی خیالات میں محو ہوتے ہیں دوسرے کی سنتے ہی نہیں۔ اس لئے ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو پہلے بیان کر چکے ہیں۔" [۱]

اسی طرح ہر مجلس مشاورت پر ایسے مواقع پیدا ہوتے رہتے کہ حضور کو نہایت حکیمانہ انداز میں احباب کو نصائح کرنی پڑتیں۔ مثلاً ۱۹۲۳ء کی مجلس مشاورت کے موقع پر حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کا لہجہ قابلِ اعتراض پایا تو آپ نے فرمایا۔

> "شیخ یعقوب علی صاحب کا لہجہ اطلاع حاصل کرنے کا نہ تھا۔ یہ پارلیمنٹ نہیں ہے کہ اس میں ایک فریق کو دوسرے کے خلاف اُبھارنا ہے۔ بلکہ یہ مجلس مشاورت ہے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس کے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے اعتراض نہیں کیا جا سکتا بعض لہجوں کا بھی اثر ہوتا ہے۔ گو ان لوگوں کی نیت نہ ہو جو ان کے لہجے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مگر عادت کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے"

---

[۱] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۲

مثلاً جب یہ آیت نازل ہوئی کہ رسول کے سامنے بلند آواز سے نہ
بولو تو ایک صحابی جن کی آواز بڑی تھی چُپ ہو گئے اور مجلس میں آنا
بند کر دیا۔ کہ مَیں منافق ہوں میری آواز اونچی ہے۔ مگر پھر ان کو
سمجھایا گیا۔ پس اگر بلند آواز سے ایسے لہجہ میں بولنے کی عادت ہو
تو اپنے لہجہ اور آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے‘‘ [۱]

ایک طرف سوال کرنے والوں کی نگرانی کی جاتی تھی تو دوسری طرف ناظروں کے جوابات کا محاسبہ بھی جاری رہتا تھا۔ کہ قولِ سدید اور واقعات کے عین مطابق ہیں یا نہیں۔ اگر کہیں کوئی ناظر غلطی کرتا تو اسے ایسے رنگ میں سمجھاتے کہ حاضرینِ مجلس کے لئے کسی مزید سوال یا اعتراض کی گنجائش نہ رہتی۔ مثلاً مجلس مشاورت ۱۹۲۳ء کے دوسرے روز سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب کے ایک جواب کو غیر تسلّی بخش پا کر آپ نے فرمایا:۔

’’افسوس ہے کہ شاہ صاحب نے بجائے یہ کہنے کے کہ مَیں اس قلیل
عرصہ میں رپورٹ تیار نہیں کر سکا۔ انہوں نے کام کی ہی نفی کر دی۔
حالانکہ یہ اس دفتر کے نائب ناظر ہیں۔ ان کے دفتر نے رپورٹ شائع
کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ کوئی ریکارڈ نہیں اگر یہ صاف لفظوں میں
کہتے کہ مَیں اس قلیل عرصہ میں یہ نہیں کر سکا تو بات کا یہ نیا پہلو نہ
نکلتا‘‘ [۲]

ناظر صاحبان کی رپورٹوں پر بھی حضور ہمیشہ کڑی نظر رکھتے کہ کہیں رپورٹوں کا کوئی پہلو اسلام کے نہایت بلند اخلاقی معیار سے گرا ہوا تو نہیں۔ خانصاحب مولوی فرزند علی خانصاحب کی ایک رپورٹ میں ایک جیّد عالم کا ذکر کچھ اس رنگ میں ہوا کہ ہلکا سا طنز کا پہلو پایا جاتا تھا حضور نے اس بات کو قابلِ اصلاح سمجھا اور فرمایا:۔

’’انسان روحانی امراض خود محسوس نہیں کر سکتا مگر تندرست سمجھتا
ہے کہ بیمار میں یہ بیماری ہے۔ رپورٹ کے متعلق مجھے یہ بھی کہنا ہے
کہ خانصاحب نے اپنی رپورٹ میں فقہ کی کتاب جو حافظ روشن علی
صاحب نے تالیف کی ہے اس کا ذکر ایسے رنگ میں کیا ہے جس سے

---

[۱] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۶
[۲] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۹-۳۰

طنز ہوتی ہے۔ مثلاً خانصاحب کا یہ کہنا کہ خدا کا شکر ہے ۹ مہینہ کے
بعد چند روز ہوئے ہیں حافظ صاحب نے تیار کر کے دی ہے یہ ایک
طنز کا پہلو ہے۔ خواہ خانصاحب کا یہ منشاء نہ ہو۔ اس میں کیا شک
ہے کہ اگر حافظ صاحب نے نو مہینہ میں بھی تیار کر دی تو بڑا کام
کیا یہ ایک علمی کام ہے۔ اس میں تحقیقات کرنی ہوتی ہے۔ اگر حافظ
صاحب ایک دن میں تیار کرلاتے تو مجھے ان کے علم پر شک پڑجاتا۔"[1]

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں لیکن وہ دوست جنہیں سالہا سال مجلس مشاورت میں شامل ہونے کی توفیق ملی ہے وہ جانتے ہیں کہ کس طرح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس ادارہ میں اسلامی رُوح اور اسلامی طرزِ فکر و تدبّر پیدا کرنے کی مسلسل جدّوجہد کی ہے۔

حضور جب بعض ایسی غلطیوں کو دیکھتے جو کام کے اصول اور بنیادی امور سے تعلق رکھتی ہوں تو بعض دفعہ بحث کے دَوران ہی جماعت کو مختلف رنگ میں نصیحت فرماتے۔ جن میں قرآن وحدیث سے استنباط کے علاوہ تاریخِ اسلام سے دل پر اثر کرنے والے واقعات بھی بیان کرتے اور کبھی معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنے آخری خطاب میں مزید تفصیل کے ساتھ اس معاملہ پر روشنی ڈالتے۔ چھوٹی موٹی یا روزمرّہ کی معمولی غلطیوں اور کوتاہیوں کے موقعہ پر بسا اوقات آپ کبھی نرمی سے ایک آدھ فقرہ میں غلطی کرنے والوں کو سمجھا دیتے۔ کبھی کوئی لطیفہ سُنا کر فضاء کو خوشگوار بناتے ہوئے آگے گزر جاتے۔ عموماً یہ طریق اس وقت اختیار فرماتے جب کوئی مقرر بلاوجہ وقت کو ضائع کرنے کی کوشش کرتا یا غیر مناسب تکرار کے ذریعہ حاضرینِ مجلس کو ملول کر رہا ہوتا۔ اس وقت آپ جس لطیف انداز میں اس کی غلطی کی نشاندہی کرتے اس سے سامعین کی ساری کوفت دُور ہو جاتی۔ تھکے ہوئے اعصاب تازہ دم ہو جاتے، اور سوتے ہوئے دماغ اچانک بیدار ہو کر ہمہ تن گوش ہو جاتے۔

اس طریق سے نہ صرف غلط عادتوں کی اصلاح ہوتی بلکہ وقتاً فوقتاً تکان بھی دُور ہوتی رہتی اور معاملات میں دلچسپی قائم رہتی۔ کبھی کبھی بعض دوستوں کے نامناسب انداز اختیار کرنے پر آپ ناراض بھی ہوتے اور بعض اشخاص کو تنبیہہ بھی فرماتے۔ ایسے مواقع عموماً اس وقت پیدا ہوتے جب کسی شخص میں انانیت کی بُو دیکھتے یا کسی کی گفتگو میں تکبّر اور تمسخر کا رنگ پایا جاتا

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۳ء صہ ۳۳

یا کوئی اپنے کسی بھائی کی دل شکنی کا موجب بنتا۔ یا ذاتیات میں اُلجھ کر اصل مقصد کو بھلا دیتا اسی طرح اگر کسی کی باتوں سے سچے احمدی کی بجائے ریا اور منافقت کی بُو آتی تو ایسے تمام مواقع پر آپ علی العموم سخت ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار فرماتے۔ ہاں اگر محض برادرانہ محبت کے انداز میں کوئی کسی مقرر کی بات کی طرف لطیف مزاحیہ رنگ میں اشارہ کرتا تو اُسے آپ ہرگز ناپسند نہ کرتے بلکہ بعض دفعہ اس مومنانہ اخوت کی نوک جھونک میں خود بھی شامل ہو جاتے۔ اور جس شخص کو نشانہ بنایا گیا ہوتا۔ اس کی طرف سے ایسا پُر لطف جواب دیتے کہ حاضرین آپ کی حاضر جوابی پر عش عش کر اُٹھتے۔ اور محفل کشتِ زعفران بن جاتی۔

سلسلہ کے پُرانے کارکنوں اور حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے خدّام کی آپ کے دل میں بڑی عزّت اور قدر تھی۔ چنانچہ مشاورت کے موقعہ پر بھی ان کے ساتھ احترام اور اعزاز کا غیر معمولی سلوک فرماتے ان کی باتوں کو بڑی توجّہ اور انہماک کے ساتھ سُنتے ان کی غلطیوں سے درگزر فرماتے اور وقت کی بھی کوئی خاص قید عائد نہ کرتے۔ پنجاب کی اکثریّت چونکہ زمیندار دیہاتی جماعتوں پر مشتمل تھی اور مجلس شوریٰ میں بھی عموماً پنجاب ہی کے نمائندگان کی کثرت ہُوا کرتی تھی اس لئے جہاں ایک طرف آپ دیہاتی نمائندوں کی رائے سُننے کا خصوصیّت سے اہتمام فرمایا کرتے۔ وہاں اس طرف بھی خاص توجّہ دیتے کہ دُور سے آنے والے نمائندگان خواہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں ان کو ضرور اظہارِ رائے کا موقعہ ملے۔ چنانچہ صوبہ سرحد۔ سندھ۔ بنگال۔ مدراس بمبئی اور یوپی کے نمائندگان کے نام آپ عموماً خود کہہ کر اہم سب کمیٹیوں میں رکھواتے اور اگر وہ مجلس میں اظہار رائے کے لئے اپنا نام نہ بھی پیش کرتے تو بھی خود ارشاد فرما کر اظہارِ رائے کے لئے انہیں تاکید فرماتے۔

یہ مجلس ہر قسم کے مشیروں پر مشتمل ہوتی۔ کہیں علوم سے آراستہ بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم اور حکومت کے اعلیٰ افسران، کہیں انجینئر، وکلاء اور ڈاکٹر صاحبان اور کہیں پیشہ ور حضرات حتّٰی کہ بڑھئی اور لوہار جو مجلسِ شوریٰ میں اپنے علم اور استطاعت کے مطابق مشورہ کے لئے حاضر ہو جاتے۔ معمولی دکاندار اور آڑھتی سادہ لوح اَن پڑھ زمیندار چوہدری اور غیر چوہدری پنجابی۔ سندھی۔ بنگالی۔ مدراسی۔ مالاباری اور یُوپی کے منجھی ہوئی زبان بولنے والے سبھی اس مجلس میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر محمود و ایاز کا منظر پیش کر رہے ہوتے۔ زبان اور بیان کی مشکلات ان کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوتیں۔ ایسے احباب جن کو اپنے اظہارِ خیال میں

مشکل پیش آتی وہ کبھی انگریزی کے الفاظ بکثرت استعمال کرکے کبھی اپنی علاقائی زبان کے الفاظ بول کر کبھی اُردو میں پنجابی کا پیوند لگا کر اپنا مقصد بیان کر ہی لیتے۔ بایں ہمہ ایسے لوگوں کو استخفاف کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کبھی تو محبت اور پیار کی مسکراہٹیں چہروں پر بکھر جاتیں اور کبھی آنکھیں اس تصوّر سے نم آلود ہو جاتیں اور زبانوں پر درود جاری ہو جاتے۔ کہ اللہ اللہ! اسلام کے احیائے نو کی خاطر مسیح موعود کو کہاں کہاں سے کیسی کیسی پاک اور سعید رُوحیں ملی ہیں جو محض للہ اسلام کے غلبۂ نو کے لئے تدبیریں سوچنے کے لئے قادیان کی دُور افتادہ بستی میں حاضر ہو گئیں۔ ایسے رائے دہندگان کو ایک سہولت یہ بھی تھی کہ ایک نہایت زیرک اور صاحب بصیرت امام ان کے سامنے بیٹھا ہوُا بڑی توجّہ سے ان کے مافی الضمیر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوتا اور جہاں کبھی سامعین ان کو سمجھنے میں غلطی کرتے نہایت فصاحت اور بلاغت اور روانی کے ساتھ اپنے الفاظ میں ان کے منشاء کو اس طرح ظاہر کر دیتا کہ ایک طرف تو سننے والے خوب اچھی طرح اس بات کو سمجھ جاتے دوسری طرف کہنے والے کے چہرے پر امتنان اور مسرّت کے جذبات اُمڈ آتے کہ ہاں مَیں جو کچھ بیان کرنا چاہتا تھا وہ یہی کچھ تھا۔ مختلف اہم مسائل پر بحث کے دوران کبھی حضرت خلیفۃ المسیح اسلام کے مستقبل کے تصوّر میں منہمک ہو جاتے اور دل اس فکر سے بے چین ہو جاتا کہ آنے والی نسلوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہیں وہ انہیں کما حقہٗ نبھا بھی سکیں گی یا نہیں۔ مشاورت کے دَوران آپ کے متعدد خطبات ہمیں اسی فکر اور درد کے آئینہ دار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر آپ کے خطابات کا رنگ ایک خاص شان اپنے اندر رکھتا تھا۔ دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز نوائے آسمانی معلوم ہوتی تھی اور فضا برقی لہروں سے بھر جاتی تھی۔ دل خدمتِ اسلام کے لئے نئی امنگوں اور نئے ولولوں سے معمور ہو کر مچلنے لگتے اور بے اختیار تمام حاضرین کبھی زبانِ حال اور کبھی زبانِ قال سے پُکار اُٹھتے کہ ہاں! ہمارے آقا! ہم حاضر ہیں۔ ہم حاضر ہماری نسلیں حاضر ہیں۔ ہماری جانیں ہمارے اموال ہماری عزتیں سب کچھ جو ہم رکھتے ہیں ہمارا نہیں آپ کا ہے۔ جس طرح آپ چاہیں دینِ اسلام کی قربان گاہوں کی نذر کر دیں۔ اسلام کی زندگی اگر ہم سے ہماری جان اور مال اور عزّتوں کا فدیہ مانگتی ہے تو جان اور مال اور عزّتیں پیش ہیں۔ اگر نسلاً بعد نسلٍ مسلسل قربانی کا مطالبہ ہے تو خدا گواہ ہم قیامت تک اپنی نسلیں اسلام کی زندگی کی خاطر مرنے کے لئے پیش کرتے چلے جائیں گے۔

ایسے خاص مواقع کی صحیح عکاسی تو میرے بس میں نہیں۔ ہاں ان خطابات میں سے چند فقرات پیش کرتا ہوں جو دلوں میں تلاطم برپا کر دیا کرتے تھے:۔

"اس وقت ہم جنگ کے میدان میں کھڑے ہیں اور جنگ کے میدان میں آکر سپاہی لڑتے لڑتے سو جائے تو مرجاتا ہے۔ ہمارے سامنے نہایت شاندار مثال ان صحابہ کی ہے جن کے مثیل ہونے کے ہم مدعی ہیں......
دشمن پوری طرح کوشش کر رہا ہے اور سارا زور لگا رہا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام ہمیں جو جھنڈا دے گئے ہیں اُسے گرا دے اب ہمارا فرض ہے کہ اُسے اپنے ہاتھوں میں پکڑے رہیں۔ اور اگر ہاتھ کٹ جائیں تو پاؤں میں پکڑ لیں اور اگر اس فرض کی ادائیگی میں ایک کی جان چلی جائے تو دوسرا کھڑا ہو جائے اور اس جھنڈے کو پکڑ لے۔ مَیں ان نمائندوں کو چھوڑ کر ان بچوں اور نوجوانوں سے جو اُوپر بیٹھے سُن رہے ہیں کہتا ہوں۔ ممکن ہے یہ جنگ ہماری زندگی میں ختم نہ ہو گو اس وقت لوہے کی تلوار نہیں چل رہی لیکن واقعات کی۔ زمانہ کی اور موت کی تلوار تو کھڑی ہے ممکن ہے یہ چل جائے تو کیا تم اس بات کے لئے تیار ہو کہ اس جھنڈے کو گرنے نہ دو گے (اس پر سب نے بیک آواز لبّیک کہا) ہمارے زمانہ کو خدا اور اس کے رسولوں نے آخری زمانہ قرار دیا ہے۔ اس لئے ہماری قربانیاں بھی آخری ہونی چاہئیں"۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا یہ بھی طریق تھا کہ بار بار مختلف رنگ میں حاضرین کی توجہ دعاؤں اور استغفار اور تقوی اللہ کی طرف مبذول کرواتے رہتے۔ جس کی وجہ سے فضا تقدس سے اس طرح بھر جاتی جیسے برساتی ہوائیں نمی سے۔ ایسے مواقع پر بسا اوقات وفورِ جذبات سے آنکھیں بھی اُمنڈ آتیں۔ بالخصوص الوداعی تقریر کے بعد کی دُعا، خدا تعالیٰ کے حضور الحاح اور عاجزی اور انابت کا ایک ایسا عجیب منظر پیش کرتی۔ جس کی کوئی نظیر دنیا میں کہیں نظر نہیں آسکتی۔ آپ کا عظیم اعجاز یہ نہیں کہ آپ نے اپنی زندگی

۱؎ رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۵ء صفہ ۹۱-۹۲

میں یہ پاکیزہ ماحول پیدا کر دیا۔ بلکہ عظیم اعجاز یہ ہے کہ اس ماحول کو دوام بخشا اور جماعت احمدیہ سے اس کو اس طرح پیوست کر دیا کہ آج بھی یہ پاکیزگی اور تقدس کی رُوح مجلس مشاورت میں اُسی طرح زندہ نظر آتی ہے۔ آج بھی وہی پاکیزہ فضا ہے آج بھی وہی قدوسیوں کا اجتماع انابت الی اللہ کا منظر پیش کرتا ہے۔ آج بھی محض لِلّٰہ مشورے دیئے جاتے اور محض لِلّٰہ قبول کئے جاتے ہیں۔ آج بھی دُعاؤں کا وہی رنگ ہے اور خلافت کی وہی عظمت اور وہی احترام دلوں میں قائم ہے۔ دُعائیں آج بھی اسی طرح آنسوؤں ہی کی زبان سے کی جاتی ہیں دنیا میں ایسے بھی رہنما ہوئے ہیں۔ جن کے قائم کردہ نقوش ان کے مرنے کے ساتھ مٹ جاتے ہیں اور بے ساختہ قومیں یہ کہہ کر ان کو یاد کرتی ہیں ؎

اب نظر کاہے کو آئیں گی وہ تصویریں کہیں

لیکن عظیم تر رہنما وہ ہوتے ہیں جن کے مرنے کے بعد بھی ان کی بنائی ہوئی تصویریں زندہ رہتی ہیں۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ ایک ایسے ہی عظیم رہنما تھے۔ جن کی بنائی ہوئی تصویریں نقشِ دوام کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ زمانے کا ہاتھ انہیں دھندلا تو سکتا ہے لیکن مٹانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

بعض اہم تقاریر اور تصانیف

۱۹۱۷ء ۔ ۱۹۲۰ء

۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جو خطبات اہم تقاریر اور تصانیف فرمائیں ان میں سے چند کا ذکر یہاں کسی قدر اختصار سے کیا جاتا ہے۔

حقیقۃ الرؤیاء

۱۹۱۷ء کے جلسہ سالانہ کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے زیرِ عنوان حقیقۃ الرؤیاء ایک بلند پایہ علمی تقریر فرمائی۔ اس میں سب سے پہلے تو آپ نے الہام، کشف اور رؤیاء کی ایک عام فہم تعریف بیان کی۔ اور اس کے بعد ایسے جدید محققین کی علمی تحقیق کا خلاصہ پیش کیا جنہوں نے انسانی خوابوں کے نظام پر غور و فکر کے علاوہ سائنسی طور پر تجربے کرنے کے بعد کئی قسم کے نئے انکشافات کئے تھے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ بنتا تھا کہ چونکہ رؤیاء وکشوف وغیرہ کے محرکات انسانی جسم میں موجود ہیں جن کا تجربہ سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اس لئے کسی غیر جسمانی محرک کا تصور لغو اور جاہلانہ ہے۔ حضور جب بھی گفتگو فرمایا کرتے تو یہ طرز اختیار کرتے کہ پہلے مخالف کے سخت ترین اعتراضات کو ایسے عمدہ رنگ میں پیش فرماتے کہ اس سے بہتر شاید وہ خود بھی بیان نہ کر سکتا ہو۔ یہی طرزِ کلام حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی بھی تھی۔ اس لئے بسا اوقات صحابہ کرامؓ کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی تقریر کے دَوران حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی یاد بہت ستاتی اور وہ بے کل ہو کر بے اختیار چشم پُر آب ہو جاتے۔ چنانچہ آپ نے جدید لامذہب مفکرین اور محققین کے خیالات اور تجارب کے ماحصل کو ایسے عمدہ رنگ میں پیش فرمایا کہ گویا وہ اعتراضات فی ذاتہٖ اتنے ٹھوس اور مضبوط ہیں کہ ان کا کوئی عقلی جواب ممکن نہیں۔ اس کے بعد آپ نے اُن تجارب کی صحت کو تسلیم کرنے کے باوجود اسلامی نظریۂ رؤیاء وکشوف کی حقیّت کو اس عمدگی سے پیش کیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے تجارب کے ماحصل کو اسلام کی مخالفت کی

بجائے اسلام کی تائید میں ایک نئے ظاہر ہونے والے نشان کے طور پر پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر نئی تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ انسانی دماغ کے بعض حصے ہوتے ہیں جو بعض تصوّرات کو واقعات کے رنگ میں دیکھ لیتے ہیں اور سوئے ہوئے آدمی پر بعض بیرونی محرکات مثلاً چھاتی پر بوجھ پڑنا۔ پاؤں کا بے حس ہو جانا۔ سردیوں میں کپڑے کا اُوپر سے اُتر جانا وغیرہ بعض مخصوص خوابیں دکھانے کا موجب بن جاتے ہیں تو یہ تحقیق نہ صرف یہ کہ قرآنی دعوئی کے خلاف نہیں بلکہ قرآن کی تائید میں ایک سائنسی انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن کا تو پہلے ہی یہ دعویٰ ہے کہ بعض خوابیں اضغاث احلام ہوتی ہیں یعنی لغو احادیثِ نفس ہوتی ہیں جن کا خدا تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر ان کے وجود سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ بعض دوسری قسم کی خوابیں آہی نہیں سکتیں۔

اس مضمون کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ زید بول سکتا ہے تو کیا یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ عمرو نہیں بول سکتا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اس بات کے ثابت ہو جانے سے کہ خوابیں مادی اسباب کی بناء پر بھی ہوتی ہیں یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ خدا کی طرف سے کلیتہً ہوتی ہی نہیں۔ اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ کا ذہن بعض ایسے خطرات کی طرف منتقل ہو گیا جو اس ضمن میں آئندہ جماعت کو پیش آسکتے تھے اور آپ کا یہ ذہنی انتقال آپ کے عظیم تدبّر اور فکر کو ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح آپ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرتے ہوئے مستقبل میں رُونما ہونے والے عظیم خطرات کو بھانپ لیا کرتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

> ’قرآن کریم کہتا ہے کہ کبھی خوابیں ہوتی ہیں اور وہ شیطانی ہوتی ہیں کوئی انسان جب یہ خواہش کرتا ہے کہ مَیں بھی نبیوں کی طرح خوابیں دیکھوں تو شیطان اس کی اس خواہش کو دیکھکر اس سے تعلق پیدا کر لیتا ہے اور اُسے شیطانی خوابیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔
>
> مَیں نے اس جماعت کے متعلق بڑا مطالعہ کیا ہے جس سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہماری جماعت کے راستہ میں ہندوستان اور یورپ میں اگر کوئی روک پیدا ہوگی تو اسی قسم کے لوگ ہوں گے اور اُن کا مقابلہ بہت مشکل کام ہوگا کیونکہ وہ بھی اسی بات کے مدّعی ہوں گے

جس کے ہم ہیں۔ لیکن جو کچھ وہ پیش کریں گے وہ وہ نہیں ہوگا جو ہم پیش کرتے ہیں بلکہ اس کے بالکل خلاف ہوگا اس لئے یہی خطرناک دشمن ہوں گے۔ ابھی تک ہماری جماعت نے اس خطرہ کو محسوس نہیں کیا مگر میرے دل میں خدا نے آج سے دو سال پہلے یہ بات ڈالی تھی۔ کہ ہماری ترقی کے راستے میں یہی جماعت روک بنے گی اس لئے مَیں نے ان کی باتوں کا خوب مطالعہ کیا ہے اور خدا کے فضل سے ان کے شر سے محفوظ رہنے کا توڑ بھی نکالا ہے جس کے متعلق ارادہ ہے کہ رسالہ ریویو آف ریلیجنز میں مضمون لکھوں اور اس کا انگریزی ترجمہ یورپ میں بھی تقسیم کیا جائے۔"[1]

اس اقتباس میں جماعت کو جو تنبیہہ کی گئی تھی اس کو بعد میں جماعت نے مختلف رنگ میں ہندوستان اور پاکستان میں بھی اور بیرونی ملکوں میں بھی پورے ہوتے دیکھا۔ امریکہ میں اس کی مثال علی جاہ محمد کی تحریک ہے جو ابتداء میں احمدی مسلمان تھا لیکن بہک کر ایسے دعوے شروع کر دیئے کہ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور اس کی اس تحریک سے یقیناً جماعت احمدیہ کی راہ میں بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں۔

اس کے بعد آپ نے بڑی تفصیل سے رحمانی، شیطانی اور نفسانی خوابوں کے مابین تمیز کرنے کے اصول بیان فرمائے جن میں سے ایک آپ ہی کے الفاظ میں بطورِ نمونہ پیش ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب شیطان کی بتائی ہوئی بعض باتیں پوری ہو جاتی ہیں تو پھر کیونکر یہ مانا جائے کہ مومنوں کی خوابیں قیاسی نہیں ہوتیں۔ وہ بھی قیاسی ہی ہوتی ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ جو شیطانی خوابیں ہوتی ہیں ان کے دو ایسے نشان ہیں۔ جن سے قطعی طور پر اُن کا شیطانی ہونا ثابت ہو جاتا ہے ایک تو یہ کہ ایسے لوگوں کو ہمیشہ خوابیں اور کشوف انہی امور کے متعلق ہوتے ہیں جن کے کچھ نہ کچھ آثار ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں لیکن جو رحمانی خوابیں اور کشوف ہوتے ہیں وہ اس وقت دکھائے جاتے ہیں جبکہ آثار و علامات کا کہیں

---

[1] حقیقۃ الرؤیاء صفحہ ۳۰ تا ۳۱

نام ونشان نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق یہی مثال دیکھ لو کہ اس علم کے مدّعیوں نے قیصر کے معزول ہونے کی خواب اس وقت دیکھ کر پیشگوئی کی جب لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ مگر حضرت مرزا صاحب نے ؎

زار بھی ہوگا تو ہوگا اُس گھڑی باحالِ زار

کی پیشگوئی اس وقت کی جبکہ لڑائی کا کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ تو یہ ایک بہت بڑا فرق ہوتا ہے رحمانی اور شیطانی خواب میں۔ رحمانی خوابیں ان امور کے متعلق ہوتی ہیں جن کے اُن کے دکھانے کے وقت کوئی آثار نہیں ہوتے بلکہ اُن کے خلاف لوگوں کے خیالات ہوتے ہیں مثلاً قرآنِ کریم میں بتایا گیا تھا کہ نہر سویز نکالی جائے گی۔ چنانچہ سُورۂ رحمٰن میں خدا تعالےٰ فرماتا ہے:۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ٥ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ٥ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ٥

(۵۵ : ۲۰ تا ۲۳)

کہ اے انسانو اور جنّو۔ یعنی بڑے اور چھوٹے لوگو سنو! خدا نے اس وقت دو سمندر ایسے چھوڑے ہوئے ہیں جو ایک وقت آئے گا کہ آپس میں مِل جائیں گے یعنی اُن کے درمیان کی خشکی دُور ہو جائے گی اور دونوں سمندروں کے پانی اکٹھے ہو جائیں گے اور ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک سمندر ہی کے ذریعے جا سکیں گے۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ کون سے سمندر ہیں جن کے ملنے کی خبر دی گئی ہے تو اس کا جواب یہ دیا کہ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ کہ دونوں سے موتی اور مُونگا نکلتا ہے۔ اب جغرافیہ میں دیکھ لو کہ وہ کون سے دو سمندر ہیں کہ جن میں سے ایک میں موتی اور دوسرے میں سے مُونگا نکلتا ہے اور جن دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی خشکی واقع تھی کہ جس کی وجہ سے ایک کا پانی دوسرے کے پانی سے نہیں مِل سکتا۔ جغرافیہ بالاتفاق کہے گا کہ یہ دونوں سمندر بحیرۂ احمر اور بحیرۂ قلزم ہیں۔ کہ

اوّل الذکر اپنے قیمتی موتیوں کی وجہ سے مشہور ہے اور ثانی الذکر مونگے کی وجہ سے۔ پس اس علامت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ اس آیت میں بحیرۂ احمر اور بحیرۂ قلزم مراد ہیں۔ اور قرآنِ کریم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے ان دونوں کے ملنے کی خبر دی ہے اور گو ان کا نام نہیں لیا مگر ایسی علامتیں بتا دی ہیں جن کے ذریعہ سے ان کے معلوم کرنے میں کوئی روک نہیں رہتی۔ چنانچہ ایک علامت تو مَیں ابھی بتا چکا ہوں۔ دوسری یہ ہے۔ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ[1]۔ کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ان سمندروں میں بڑے بڑے جہاز کھڑے کئے جائیں گے۔ اب دیکھ لو دنیا میں سب سے زیادہ جہازات نہر سویز ہی سے گزرتے ہیں۔ غرض یہ باتیں بہت ہی قبل از وقت بتا دی گئیں۔ کیا کوئی انسانی عقل اور قیاس ہے جو ایسا کر سکے۔ ہرگز نہیں۔" (حقیقۃ الرؤیا صفحہ ۳۴ تا ۳۵)

ایک اَور علامت پیش کرتے ہُوئے فرماتے ہیں:۔

"ان کے امتیاز کی ایک اَور بھی علامت ہے اور وہ یہ کہ شیطانی خوابیں کئی باتوں سے مرکب نہیں ہوتیں بلکہ مفرد ہوتی ہیں اور مرکّب بات کا بھی قبل از وقت بتانا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً قیاس کرکے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ زید آئے گا اور ممکن ہے کہ وہ آ بھی جائے لیکن اگر کہا جائے کہ زید آئے گا اس کے سر پر فلاں قسم کی پگڑی ہوگی۔ پاجامہ ایسا پہنے ہوگا تو یہ قیاس نہیں ہو سکتا۔ تو ان لوگوں کی خوابیں بسیط ہوتی ہیں اور قیاسِ بسیط کبھی پورا بھی ہو جاتا ہے اور مُرکّب ہوں اور کبھی پُوری ہو جائیں تو پھر ان کا صرف ایک جُزو ہی پورا ہوتا ہے اور باقی غلط ہو جاتے ہیں۔ مگر رحمانی خوابیں مُرکّب ہوتی ہیں اور اُن میں بتائی ہوئی ساری کی ساری باتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالحی مرحوم کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی پیشگوئی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے خبر دی کہ مولوی صاحب کے

---

[1] سورۂ رحمٰن آیت ۲۵

ہاں لڑکا ہوگا یہ خبر اس وقت دی گئی جب مولوی صاحب بڑھاپے کی عمر میں تھے۔ ان کی بی بی کو ایسی مرض تھی کہ اس کی وجہ سے پہلے سب بچے چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو جاتے تھے۔ دو تین سال سے زیادہ کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا۔ خود حضرت مولوی صاحب کی اولاد دوسری بیوی سے بھی سوائے لڑکیوں کے چھوٹی ہی عمر میں فوت ہو جاتی تھی ان حالاتِ مخالف کی موجودگی میں حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے اپنا خواب بیان فرمایا کہ آپ کے ہاں بیٹا ہوگا اور اس دوسری بیوی سے ہوگا جس کی اولاد کے فوت ہونے پر دشمنوں نے ہنسی بھی کی تھی۔ اب گو اس عمر میں ہو سکتا ہے کہ اولاد بند ہی ہو جائے۔ لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ خیال ہو سکتا تھا کہ آپ کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو مگر اس کے ساتھ رؤیا میں یہ شرط بھی لگی ہوئی تھی کہ وہ لڑکا ہوگا مگر اسے بھی سمجھ لیتے ہیں کہ قیاس سے ایسا ہو سکتا تھا مگر آگے جو علامات بتائی گئی ہیں وہ کسی قیاس سے نہیں بتلائی جا سکتیں چنانچہ آپ کو دکھلایا گیا کہ (۱) وہ لڑکا خوش رنگ اور سانولا ہوگا۔ (۲) خوبصورت ہوگا (۳) اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہوں گی (۴) اس عمر سے بڑھ جائے گا جس میں پہلے بچے فوت ہوتے رہے ہیں (۵) اس کے جسم پر اور خاصکر پنڈلیوں پر پھوڑے ہوں گے (۶) وہ پھوڑے اتنی دیر تک رہیں گے کہ اُن کے نشان قائم ہو جائیں گے (۷) اُن پھوڑوں کا علاج بتایا گیا۔ یہ اتنی باتیں ہیں جو قیاس سے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتیں.......

"تیسری علامت شیطانی خواب کی پہچان کی ایک یہ بھی ہے کہ اس خواب کی تائید کسی دوسرے شخص کی خواب سے نہیں ہوتی لیکن رحمانی خواب کی تائید خدا تعالےٰ دوسری جگہوں میں بکثرت پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنے ماموروں کی تائید میں (۱) ان کے ظاہر ہونے سے پہلے لوگوں کو خبر دیتا ہے (۲) ان کے وقت میں ایسے لوگوں کو خبر دیتا

ہے جنہوں نے اس وقت تک اُس کا نام بھی نہیں سُنا ہوتا (۳) ایسے لوگوں کو خبر دیتا ہے جن کا مذہب اُن کے مذہب سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اسی طرح ایسے بعض اور بندوں کے لئے جن کو وُہ چُن لیتا ہے کرتا ہے۔ مگر شیطان ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ بات اقتدار کو چاہتی ہے اور شیطان کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔" ؎

حدیثِ نفس اور اس کی پہچان کے متعلق بعض دلچسپ امور بیان فرمانے کے بعد یہ بحث فرمائی کہ شیطانی خوابوں کی پہچان کے کیا طریق ہیں اور رحمانی خوابوں کے کیا طریق ہیں۔ رحمانی خوابوں پر گفتگو کرتے ہوئے اس خطرہ کی بھی نشاندہی فرمائی کہ بعض دفعہ رحمانی خوابیں بھی ایک انسان کے لئے سخت ابتلاء اور ٹھوکر کا موجب بن جاتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"دوسرے وہ خوابیں جو ابتلاء کے لئے آتی ہیں یہ بہت خطرناک ہوتی ہیں اور ان کی حقیقت نہ سمجھنے سے اکثر لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں۔
اس لئے اس کو خوب غور سے سنو اور سمجھو۔

یہ ایسی خوابیں ہوتی ہیں کہ ایک انسان بظاہر متقی اور نیک ہوتا ہے۔ عبادتیں کرتا ہے۔ احکامِ شریعت پر چلتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں پوشیدہ طور پہ اپنی بڑائی کا خیال بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ خیال ایسا پوشیدہ اور نہاں در نہاں ہوتا ہے کہ وہ خود بھی نہیں جانتا۔ تو ایسا انسان بظاہر انکسار کا پتلا، نہایت عبادت گذار اور متقی نظر آتا ہے۔ مگر اس کے دل کے کسی کونے میں عُجب اور تکبّر کی آلائش ہوتی ہے جو بڑھتی رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ کسی وقت خیال کرنے لگ جاتا ہے کہ مَیں بھی کچھ ہوں میرا بھی کوئی حق ہے۔ ایسا انسان جب اپنی ظاہرہ نیکی پر پھُولتا اور تکبّر میں آتا ہے تو ابتلاء میں ڈالا جاتا ہے۔ اس وقت کبھی اُسے آواز آتی ہے کہ تُو عیسٰے ہے کبھی یہ سُنائی دیتا ہے کہ تو موسیٰ ہے۔ کبھی یہ کہ تُو ابراہیم ہے اور کبھی یہ کہ تُو محمد ہے اور آجکل کبھی یہ آواز آجاتی ہے کہ تُو مسیح موعود ہے، اس کا بروز ہے اس کا موعود ہے۔ غرض

؎ حقیقۃ الرؤیا صفحہ ۳۰ تا صفحہ ۳۱

اس قسم کی آوازیں اُسے آنے لگ جاتی ہیں اور وُہ خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہیں نہ کہ شیطان کی طرف سے۔ اور اس وجہ سے بالکل درست ہوتی ہیں۔ مگر باوجود اس کے ان رؤیاء کا آنا یا الہامات کا ہونا ابتلاء کے طور پر ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب جو کچھ صوفیاء نے دیا ہے اور جو نہایت سچا جواب ہے۔ مَیں آپ کو سُناتا ہوں۔ فتوحاتِ مکیّہ میں محی الدین ابنِ عربی لکھتے ہیں کہ ایک وقت انسان پر ایسا آتا ہے جبکہ اس کے لئے ترقیات کے دروازے کھلنے والے ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کی سخت خطرناک طور پر آزمائش کی جاتی ہے اور بہت کم ہوتے ہیں جو اس میں پورے اُترتے ہیں اور وہ یہ کہ ایسے انسان کو ایسے مقام پر کھڑا کیا جاتا ہے جہاں سے وہ محمد۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ جو کچھ خدا تعالیٰ کلام کرتا ہے وہ بھی سُنتا ہے اور بعض دفعہ اس سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو مخاطب سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو ان ناموں کا مصداق سمجھ لیتا ہے اور اپنی ذات کو مخاطب قرار دے لیتا ہے حالانکہ اگر وہ اپنی ذات پر غور کرے تو اُسے معلوم ہو جائے کہ مَیں کہاں اور یہ نام کہاں۔ پنجابی میں کہتے ہیں:۔ "ایہہ مُنہ تے مسراں دی دال" یعنی یہ مُنہ اور مسُور کی دال۔ تو وہ اگر اپنے آپ کو دیکھے اور اپنی حالت پر نظر کرے، تو اُسے صاف پتہ لگ جائے کہ مجھے مخاطب نہیں کیا جا رہا بلکہ ان ناموں کے مخاطب کوئی اور ہی ہیں۔ کیونکہ وہ صفات جو ان ناموں کے انبیاء میں پائی جاتی ہیں وہ اس میں نہیں ہوتیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مَیں خدا تعالےٰ کا مخاطب نہیں۔ ورنہ خدا تعالیٰ ان ناموں کے ساتھ ان ناموں والے کے علوم اور ان کی صفات مجھے کیوں نہ دیتا۔" ؎

اس مضمون کے آخر پر آپ نے الہامات اور رؤیاء و کشوف کی صداقت معلوم کرنے کے کچھ طریق بیان فرمائے اور اس ذکر میں اپنی ایک رؤیاء بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ

؎ حقیقۃ الرؤیاء صفحہ ۴۷ تا ۵۰

کی طرف سے دکھائی جانے والی خوابیں انسانی دماغ کی دسترس سے بالا ہوتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"اسی سال ایک معاملہ کے متعلق جو گورنمنٹ کے ساتھ تھا ایسا واقعہ ہُوا کہ کمشنر صاحب کی چٹھی میرے نام آئی کہ فلاں امر کے متعلق مَیں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے آجکل اتنا کام ہے کہ مَیں گورداسپور نہیں آسکتا اور قادیان سے قریب تر جو میرا مقام ہے وہ امرتسر ہے یہاں اگر آپ آسکیں تو لکھوں۔ اس چٹھی میں معذرت بھی کی گئی کہ اگر مجھے فرصت ہوتی تو مَیں گورداسپور ہی آتا لیکن مجبور ہوں۔ اس چٹھی کے آنے سے تین دن بعد مجھے رؤیا ہوئی کہ مَیں کمشنر صاحب کو ملنے کے لئے گورداسپور جارہا ہوں اور یکّوں وغیرہ کا انتظام ڈاکٹر رشید الدین صاحب کر رہے ہیں۔ لیکن جس دن مَیں نے رؤیا دیکھی اس دن ڈاکٹر صاحب قادیان میں موجود نہیں تھے بلکہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے اور اسی رات کی صبح کو کمشنر صاحب کی چٹھی آگئی۔ جو بلا کسی ہماری تحریک کے تھی کہ مجھے کچھ کام گورداسپور کا نکل آیا ہے اگر آپ کو امرتسر آنے میں تکلیف ہو تو مَیں فلاں تاریخ گورداسپور آرہا ہوں آپ وہاں آجائیں۔ اس چٹھی سے ایک حصّہ تو پورا ہو گیا مگر دوسرا حصّہ باقی تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک مہینہ کے ارادہ سے علی گڑھ اپنی چھوٹی بیٹی کی لات پر آپریشن کرانے کے لئے گئے تھے اور ابھی اُن کے آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ مگر دوسرے دن ہمیں گورداسپور جانا تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آگئے اور بیان کیا کہ جس ڈاکٹر نے آپریشن کرنا تھا اس نے ابھی ٹانگ کاٹنے سے انکار کر دیا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا کرنا سرجری کی شکست ہے۔ مَیں پہلے یونہی علاج کروں گا۔ اس لئے مَیں نے سرِدست ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آگیا ہوں (گو چند ماہ بعد اس ڈاکٹر کو مجبورًا ٹانگ کاٹنی پڑی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلی تحریک محض اللہ تعالےٰ کی طرف سے تھی) غرض اس طرح

دوسرا حصّہ بھی پُورا ہو گیا۔ اب دیکھو یہ ایک مرکّب خواب تھی اور اس وقت آئی تھی جب حالات بالکل خلاف تھے۔ کیونکہ کمشنر صاحب کی چِٹھی آچکی تھی کہ میں اس ضلع میں اس وقت نہیں آسکتا اور کوئی انسانی دماغ اس بات کو تجویز نہیں کر سکتا تھا کہ فوراً وہاں اُن کو کام پیدا ہو گا اور پھر وہ اس کی اطلاع دے کر امرتسر آنے سے روک دیں گے اور اُدھر ڈاکٹر صاحب بھی غیر متوقع طور پر واپس آجائیں گے۔ اس خواب کے جس قدر جزو ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ایسے وقت میں بتائے گئے ہیں کہ جب ان کی تائید میں کوئی سامان موجود نہ تھا۔ بلکہ ایسے وقت میں بتائے گئے جبکہ اُن کے خلاف سامان موجود تھے"۔[1]

ایک اَور علامت پر بحث کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:۔

"چوتھی علامت یہ ہے کہ خواب کے ذریعہ نئے نئے علوم سکھلائے جاتے ہیں۔ شیطان میں نئے علوم سکھلانے کی طاقت نہیں اور نہ ہی نفس کو یہ طاقت ہے کہ جو باتیں اسے معلوم ہی نہیں وہ بتادے۔ تو جس خواب کے ذریعہ سے نئے علوم معلوم ہوں سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہے۔ نئے علوم کی تازہ مثال حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا واقعہ ہے۔ آپ کو اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ آپ عربی میں عید کا خطبہ پڑھیں۔ آپ کو خدا تعالےٰ کی طرف سے علم دیا جائے گا۔ آپ نے اس سے پہلے کبھی عربی میں تقریر نہ کی تھی۔ لیکن جب تقریر کرنے کے لئے آئے اور تقریر شروع کی تو مجھے خوب یاد ہے۔ گو میں چھوٹی عمر میں ہونے کی وجہ سے عربی نہ سمجھ سکتا تھا مگر آپ کی ایسی خوبصورت اور نورانی حالت بنی ہوئی تھی کہ میں اوّل سے آخر تک برابر تقریر سُنتا رہا حالانکہ ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ تو ایسی خواب جس میں زائد علم دیا جائے وہ ضرور رحمانی ہوتی ہے اور میں نے خود اس کا کئی بار تجربہ کیا ہے کہ رؤیا میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے نیا علم دیا جاتا ہے چنانچہ جب خواجہ صاحب نے ہندوستان میں ایسی طرز پر تبلیغ شروع

---

[1] حقیقۃ الرؤیا صفحہ ۶۱-۶۲

> کی جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا نام نہ لیتے تھے تو مجھے بہت بُرا معلوم ہؤا یہ لوگ تو کہتے ہیں کہ ہماری یونہی مخالفت شروع کر دی گئی نہ کچھ سوچا نہ سمجھا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ اس وقت پہلے مَیں نے استخارہ کیا کہ الٰہی اگر یہی طریقِ تبلیغ اچھا ہے تو مجھے بھی اس پر انشراح کر دے۔ بار بار دعا کرنے پر رؤیا میں میری زبان پر ایک اُردو شعر جاری ہؤا جو شعر تو یاد نہیں رہا مگر اس کا مطلب یاد ہے جو یہ ہے کہ جن کے پاس قاق نہیں ہوتا وہ نان ہی کو قاق سمجھ لیتے ہیں۔ اس لفظ قاق کے متعلق مَیں نے کئی لوگوں سے دریافت کیا۔ کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ لیکن وہ کچھ نہ بتا سکے۔ پھر کئی لُغت کی کتابوں کو دیکھا وہاں سے بھی نہ ملا۔ آخر بڑی تلاش کے بعد ایک لُغت کی کتاب سے معلوم ہؤا کہ قاق کیک کو کہتے ہیں اور یہ عربی لفظ ہے تو اس قسم کے نئے الفاظ کا بتایا جانا ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ یہ خواب خدا کی طرف سے ہے۔“ [1]

آپ کی یہ تقریر محض ایک علمی کارنامہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسے صاحبِ تجربہ بزرگ کی شہادت کا درجہ رکھتی ہے جو رؤیا و کشوف کے کوچے سے خوب آشنا ہو۔ آج بھی اس کے پڑھنے سے دل پر آپ کے اعلیٰ روحانی مقام کا نقش ثبت ہو جاتا ہے۔ اس تقریر میں آپ نے علمِ تعبیر کا بھی مختصرًا ذکر فرمایا۔ اس ضمن میں مَیں یہ ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ خود آپ کو خوابوں اور رؤیا کی تعبیر کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا جو انسان کو اکثر ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ بلاشبہ ہزارہا مَردوں اور عورتوں نے جن میں احمدی بھی شامل تھے اور غیر احمدی بھی، آپ سے اپنی خوابیں بیان کیں یا لکھ کر اُن کی تعبیر پوچھی اور آپ کی تعبیر ہمیشہ نہایت حکیمانہ اور عارفانہ ہوتی اور ایسے نکات نکالتے جن کی طرف عام حالات میں انسانی ذہن منتقل نہیں ہو سکتا۔

ایک مرتبہ ربوہ کے ابتدائی ایّام میں جبکہ یہ شہر ابھی نیا نیا آباد ہؤا تھا اور حضرت صاحب اپنے اہل خانہ سمیت عارضی طور پر بنے ہوئے کچے مکانوں میں رہائش پذیر تھے دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے سیّد نعیم احمد شاہ صاحب نے جو سیّدہ مہر آپا صاحبہ کے چھوٹے بھائی ہیں حضرت صاحب سے عرض کیا کہ رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کنڈی سے مچھلی پکڑ رہے ہیں۔ غالبًا یہ بھی

---

[1] حقیقۃ الرؤیا، ص ۶۳-۶۴

بتایا کہ ایک مچھلی پکڑی جاتی ہے ۔ بہر حال حضرت صاحب نے فوراً پوچھا کہ چھوٹی تھی یا بڑی ۔ نعیم احمد شاہ صاحب نے جواب دیا چھوٹی تھی ۔ آپ نے پوچھا ۔ تم نے کوئی امتحان دیا ہُوا ہے تو انہوں نے جواب دیا ۔ جی مَیں ابھی امتحان دے کر آ رہا ہوں ۔ آپ نے فرمایا تم فیل ہو جاؤ گے حضور کا یہ جواب سُنکر نعیم احمد شاہ صاحب کا رنگ فق ہو گیا لیکن ہُوا یہی ۔ کہ وہ اس امتحان میں فیل ہو گئے ۔ بعد ازاں مَیں نے حضور سے سوال کیا کہ آپ کو اس خواب سے کس طرح پتہ لگا، کہ نعیم فیل ہو جائے گا تو آپ نے فرمایا ۔ خوابوں کی تعبیر اس کے موقع اور محل کے مطابق کی جاتی ہے، بڑی مچھلی نے حضرت یونس علیہ السّلام کو نگلا تھا لیکن زندہ اُگل دیا جس کا مطلب ہے کہ ایسا غم آیا جو گذر گیا لیکن چھوٹی مچھلی جو چیز نگل جائے اس کو اُگلا نہیں کرتی ۔ ایک طالب علم کی زندگی میں خوشی و غم کا ایک خاص موقع امتحان میں کامیابی یا ناکامی کے وقت پیدا ہوتا ہے اس لئے مجھے خیال آیا کہ شاید یہ کوئی امتحان دے کر آیا ہے جس میں یہ کامیاب نہیں ہو گا ۔

جہاں تک مَیں نے دیکھا ہے مچھلی کی تعبیر غم کے طور پر مجھے کسی اور جگہ نہیں ملی ۔ عام طور پر تعبیر الرؤیا، کی کتابوں میں نعمت ۔ مال ۔ دولت اور فائدے کی چیز وغیرہ بیان کی جاتی ہے ۔ حضرت صاحب کی یہ نئی تعبیر کرنا کسی ظاہری علم کے نتیجہ میں ممکن نہیں تھا بلکہ یقیناً یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی خاص رُوحانی ملکہ تھا جس کے نتیجہ میں آپ ملائک کی رہنمائی میں تعبیر فرمایا کرتے تھے ۔

تعبیر الرؤیاء کے سلسلہ میں چند اور واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ حضور کو علمِ تعبیر پر کیسی زبردست دسترس حاصل تھی ۔

ماسٹر عبد الکریم نو مسلم جو گذشتہ سال فوت ہُوئے ہیں انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی یادوں سے متعلق جو تحریری بیان داخل کیا اس میں دو خوابوں اور ان کی تعبیر کا بھی ذکر ملتا ہے یہ دونوں خوابیں اس زمانہ کی ہیں جب ابھی یہ ہندو ہی تھے اور اسلام قبول کرنے کی توفیق نہیں ملی تھی ۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> "مجھے خواب آئی کہ دو شخص مجھے ملے ہیں ایک جُبّہ والا بڑا بزرگ جنہوں نے شرعی پاجامہ پہنا ہُوا تھا سر پر پگڑی تھی ۔ دوسرے بزرگ اُن سے قد میں چھوٹے تھے ۔ بڑے قد والے بزرگ نے مجھ سے کہا کہ اگر تم ان کو مان لو گے تو تمہارے لئے اچھا ہے ۔"

ان کی یہ خواب حضرت مولوی عبد اللہ صاحب سنوری رضی اللہ عنہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی

رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھی (ان کا بڑا بھائی بھی جو ہندو تھا مولوی صاحب کے پاس ملازم تھا) تو حضور نے جواباً لکھا۔

"بڑے قد والے بزرگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور چھوٹے بزرگ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام ہیں۔ یہ جو لڑکا ہے یہ مسلمان ہو جائے گا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بڑا بھائی جو بہت عرصہ تک مولوی عبد اللہ صاحب سنوریؓ کی صحبت میں رہا اُسے تو توفیق نہ ملی لیکن ان کو جلد ہی اسلام قبول کرنے کی توفیق مل گئی۔

ایک دوسرا خواب اسی زمانہ میں مسلمان ہونے سے قبل انہوں نے یہ دیکھا کہ آسمان سے دو بندر اُترے ہیں وہ آدمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر پٹخ رہے ہیں۔ ان کے پاؤں کو بھی ایک بندر نے کاٹا ہے لیکن انہوں نے چھڑا لیا۔ یہ خواب بھی حضرت مولوی عبد اللہ صاحب سنوریؓ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ بھیجی۔ تو حضور کا جواب آیا کہ بالکل ایسی ہی خواب مَیں نے خود بھی دیکھی ہے۔ دنیا میں کوئی سخت بیماری آنے والی ہے جس کا اس لڑکے پر بھی حملہ ہوگا اس کا خاص طور پر خیال رکھنا۔

ماسٹر عبد الکریم صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد ۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم اوّل و. . . ا ئی انفلوئنزا پھُوٹا جس میں مَیں اس بُری طرح جکڑا گیا کہ کچھ دن تک میرے دماغ پر بھی اثر رہا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ بھی انفلوئنزا سے بیمار ہو گئے جس کا علیحدہ ذکر آگے آئے گا اور اس طرح یہ تعبیر دونوں صورتوں میں بعینہٖ پُوری ہو گئی۔

شیخ فضل احمد صاحب کی روایت ہے کہ انہوں نے ایک رویاء دیکھی کہ قرآن شریف کی اصل عبارت تو حاشیہ میں لکھی ہوئی ہے لیکن متن کی جگہ تصویر بنی ہوئی ہے جس کا اس عبارت سے تعلق ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السّلام کے واقعہ کا حاشیہ میں جہاں ذکر ہے وہاں متن کی جگہ پر حضرت یوسف علیہ السّلام کے بھائیوں کی تصویر بنی ہوئی ہے کہ وہ کس طرح انہیں کنوئیں میں ڈال رہے ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ قرآن کریم کے عملی ظہور کا زمانہ آگیا ہے۔

ایک دوست نے خواب دیکھا کہ میرا دایاں بازو کہنی سے کاٹ دیا گیا ہے، خون جاری ہے اور اُسے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت صاحب نے یہ تعبیر فرمائی کہ بازو خواب میں بیٹا ہوتا ہے۔ صدقہ دیں اور دُعائیں اور استغفار کریں۔

ایک شخص نے دیکھا کہ اُن کے والد فوت ہو گئے ہیں اور وصیّت کر گئے ہیں کہ انہیں قائداعظم کے مزار میں دفن کرنا۔ بعد ازاں پولیس کی اجازت سے دفن کرنے لگتے ہیں تو وہ زندہ ہیں مگر کہتے ہیں جلدی دفن کرو۔ حضور نے اس خواب کی یہ تعبیر فرمائی کہ ان کے والد کی عمر لمبی ہو گی اور ان کو قومی خدمت کرنے کا موقع ملے گا۔

ایک احمدی نوجوان نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو حاملہ عورت کی صورت میں پاتا ہے اور اس کی والدہ اس کے ساتھ ایک کمرہ میں جاتی ہے جہاں اس کے ہاں ایک بچی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی تعبیر آپ نے یہ فرمائی کہ بظاہر ناممکن کام ممکن ہو جائے گا۔

ایک دوست نے خواب میں دیکھا کہ ان کے مرحوم والد نے انگوروں کی پیٹی بھیجی ہے جس میں سوراخ کر کے ایک چوہا داخل ہو جاتا ہے۔ حضور نے یہ تعبیر فرمائی کہ چوہے سے مراد منافق ہے دُعا، استغفار کریں۔ صدقہ بھی بھیج دیں۔

سلسلہ کے ایک بزرگ نے خواب دیکھا کہ اُن کے اُوپر کا دانت ٹوٹتا ہے اور ہلانے سے اُکھڑ جاتا ہے۔ حضرت صاحب نے تعبیر فرمائی کہ اگر دانت زمین پر نہیں گر گیا اور صاف تھا ٹرا ہُوا نہ تھا تو خواب بُری نہیں۔

کئی مرتبہ حضور کے سامنے کوئی خواب زبانی بیان کی جاتی تو آپ اسے بڑی توجہ سے سُنتے اور یہ ضروری نہ ہوتا کہ ہر خواب کی تعبیر کریں۔ بعض اوقات خاموش رہتے اور کوئی جواب نہ دیتے بعض اوقات فرماتے کہ یہ نفسانی خیالات یا پیٹ کی خرابی سے ہُوا ہے۔ لیکن زیادہ تر یا تو خواب کی تعبیر فرما دیتے یا دعا، استغفار اور درود پڑھنے اور صدقات دینے کی نصیحت پر اکتفا فرماتے بہر حال یہ طریق نہیں تھا کہ ہر خواب کی خواہ وہ کیسی ہی ہو فوراً تعبیر بتا دی جائے۔

صرف احمدی احباب ہی آپ کو خوابوں کی تعبیر کے لئے نہیں لکھا کرتے تھے بلکہ متعدد غیر احمدی شرفاء بھی جو حضور کی روحانیت اور علم و فضل سے متأثر تھے بسا اوقات حضور کی خدمت میں اپنی بعض غیر معمولی خوابیں لکھ کر تعبیر اور دعا کی درخواست کیا کرتے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال جو ذاتی طور پر میرے علم میں ہے ہدیۂ قارئین کرتا ہوں:۔

میجر جنرل شیر خاں صاحب مرحوم اگرچہ احمدی نہیں تھے مگر حضرت صاحب کی رُوحانیت سے بڑے متأثر تھے اور دعا کے لئے کبھی کبھی خط لکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ تعبیر کروانے کی غرض سے اپنی ایک خواب حضور کو لکھی جس کو پڑھتے ہی حضور نے فوراً پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت کی

کہ جنرل صاحب کی طرف سے فوری طور پر صدقہ کرو اور ان کو بھی خط لکھو کہ فوراً صدقہ کر دیں کیونکہ آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔ افسوس یہ خط ابھی ان تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں ان کی ناگہانی وفات کی خبر اخباروں میں چھپ گئی۔ مَیں ان دنوں جامعہ احمدیہ میں طالبعلم تھا خبر پڑھی تو فوراً پرائیویٹ سیکرٹری کے دفتر میں جا کر خود اس امر کی تصدیق کروائی اور تعجب کیا کہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر کا کیا غیر معمولی ملکہ عطا فرمایا ہے۔

گنڈے تعویذ سے حضور کو سخت نفرت تھی لیکن بعض اوقات مسنون دُعائیں یا قرآن کریم کی سُورتیں پڑھ کر جسم پر پھونکنے کا ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انگلستان سے ایک عورت نے لکھا کہ اس کے خاوند کو بُرے بُرے خواب آتے ہیں تو حضور رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ رات کو سوتے وقت آیۃ الکرسی اور تینوں قُل پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک کر سویا کریں۔

آپ کا خوابوں کی تعبیر بتانا یا دعائیں کر کے پھونکنے کی نصیحت کرنا کسی واہمے یا خوش اعتقادی کے نتیجہ میں نہیں تھا بلکہ سنّت کی پیروی اور خدا داد علم کی بناء پر تھا۔ توہمات وغیرہ سے سخت بیزار تھے۔ جنّوں بھوتوں کے عامیانہ تصوّر کو ہمیشہ لغو اور بے بنیاد قرار دیا کرتے۔ اور چیلنج کیا کرتے کہ مجھے بھی کسی جنّ یا بھُوت کا سامنا کرایا جائے۔ تاکہ مَیں دیکھوں کہ یہ کس بَلا کا نام ہے۔ اس ضمن میں مکرم میاں روشن دین صاحب زرگر بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ایک موقعہ پر جنّوں کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ کسی نے جنّوں کو کچھ دیتے دیکھا۔ اس پر مَیں نے اپنی ایک پھوپھی کا واقعہ لکھ کر دیا کہ اس طرح بے موسم موتیا کی کلیاں اور آم آ گئے۔ آپ نے فرمایا۔ میرے سامنے یا میرے نمائندہ کے سامنے وہ کچھ نہیں لاتے۔ لیکن اس کے باوجود مشاہدات خواہ کتنے ہی عجیب کیوں نہ ہوں، ان کو تسلیم کرنے میں کبھی کوئی انقباض نہیں ہوُا۔ چنانچہ جنّوں کے ذکر پر ایک دفعہ خود مجھ سے یہ ذکر فرمایا کہ مَیں جنّوں کے عام تصوّر کا قائل نہیں ہوں۔ یعنی ایسی مخلوق جسے اشرف المخلوقات پر کسی قسم کا غلبہ حاصل ہو اور اس کے شر اور خیر میں دخل رکھتی ہو (یہ الفاظ حضرت صاحب کے نہیں لیکن مفہوم یہی تھا) لیکن ایک دفعہ خود میرے ساتھ ایسا گذرا ہے کہ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پس پردہ کون سی قوّت کام کر رہی تھی۔ ایک دفعہ مَیں اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھا اور پڑھتے پڑھتے رُومال کی ضرورت محسوس کر کے بغیر دیکھے اس طرف ہاتھ بڑھایا جس طرف مَیں نے خود رومال رکھا تھا تو تعجب ہوُا کہ رُومال وہاں نہیں تھا اس پر مَیں نے کتاب سے نظر اُٹھا کر جو دیکھا تو مجھ سے کچھ فاصلے پر رومال زمین سے تقریبًا

دو فٹ اونچا ہوا میں معلّق تھا۔ میرے دیکھنے پر وہ میرے قریب آیا۔ جب مَیں نے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ اس طرح پیچھے ہٹا جس طرح بعض دفعہ بڑی عمر والے بچّوں سے کھیلتے ہیں اور چیز بظاہر دیتے ہیں لیکن ہاتھ بڑھانے پر کھینچ لیتے ہیں۔ دو تین مرتبہ اسی طرح ہؤا لیکن اس سے میری طبیعت پر یہ اثر نہیں ہؤا کہ گویا کوئی چڑا رہا ہو بلکہ پیار کے ساتھ کھیلنے کا سا احساس تھا۔ آخر مَیں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تو وہ رُومال قریب آکر دو تین دفعہ ہوا میں جھُولنے کے بعد خود ہی میری گود میں آن گرا۔ یہ واقعہ کم وبیش اسی طرح حضور نے خود میرے سامنے بیان فرمایا۔

خوابوں کی تعبیر کا ذکر چل رہا تھا اور بات یہ ہو رہی تھی کہ لغو خوابوں کو آپ لغو ہی قرار دیتے اور یونہی ہر خواب کی تعبیر کرنا آپ کی عادت نہ تھی۔ ایک دفعہ ایک خاتون کی بظاہر متوحش خواب کی تعبیر کرتے ہوئے آپ نے لکھا۔

عزیزہ ہمشیرہ۔ بسمک اللہ تعالےٰ!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ آپ کا خط ملا۔ خواب بعض بے شک متوحش ہیں مگر بعض نہیں .... بجائے الٰہی ہونے کے بیمار اور تھکے ہوئے دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مبشر رویاء خدا تعالےٰ کی طرف سے اور منذر رویا شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اس کا مطلب لوگ نہیں سمجھتے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر زیادہ منذر رؤیا آئیں تو وہ دماغی کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں نہ کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے۔ لیکن عمدہ رویاء اگر زیادہ آویں۔ تو وہ بالعموم اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔'' [1]

فی الحال اس دلچسپ مضمون کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے اپنے رویاء اور کشوف کا ذکر ایک علیحدہ باب کا متقاضی ہے اور انشاء اللہ علیحدہ باب کی صورت میں ان کا ذکر کیا جائے گا۔

○

---

[1] الفضل ۲۴ فروری ۱۹۲۵ء صفحہ ۶

اِنفلوئنزا کی عالمی وَباء

اور حضورؓ پر اس کا اثر

۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم کے خاتمہ پر جو انفلوئنزا کی ہولناک وبار پھوٹی اُس کا رُخ مشرق سے مغرب کی جانب تھا گویا کہ جنگ کی زہرہ گداز تباہی تو مغرب سے مشرق کی سمت چلی تھی۔ انفلوئنزا کی وباء مشرق سے مغرب کی طرف بڑھی اور برِصغیر کے مشرقی کنارے سے داخل ہوتے ہوئے رفتہ رفتہ تمام ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی ہولناک تباہی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف ہندوستان ہی میں اس کے نتیجہ میں ۶۰ لاکھ اموات ہوئیں۔
اس خوفناک وباء کا جو ردِّ عمل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ پر ہوُا وہ یہ نہیں تھا کہ جماعت کو ایسی جگہوں پر جانے سے روکتے جہاں وباء کا شدید حملہ تھا بلکہ اس کے برعکس حضرت صاحب نے تمام جماعت کو تاکید فرمائی کہ ہر صحت مند آدمی بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے نکل کھڑا ہو اور جس حد تک بھی بیماروں کی خدمت کی توفیق ملے سرانجام دی جائے۔ چنانچہ انفرادی طور پر ہی نہیں جماعتی تنظیم کے ماتحت بھی جماعت احمدیہ کے طبیب اور دوسرے صحت مند نوجوان بیماروں کی خدمت پر کمربستہ ہو گئے خصوصًا قادیان کے ماحول میں جماعت کو بھاری خدمت کا موقع ملا۔ وباؤں کے ایام میں جبکہ دوسرے ڈاکٹر زر وجواہر سے اپنی جھولیاں بھر رہے تھے احمدی اطباء کو ان کے امام کا یہ حکم تھا کہ وہ خود بیماروں تک پہنچیں اور ان کا مفت علاج کریں چنانچہ احمدی اطباء نے اس آواز پر لبّیک کہتے ہوئے ایسا ہی کیا اور اطباء کے ساتھ مخلص نوجوانوں کی ایک جماعت معاون کے طور پر شامل ہو گئی۔ ہمارے چچا جان حضرت صاحب کے چھوٹے بھائی حضرت مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ کو اس وباء کے دَوران بیماروں کی خدمت کی بہت توفیق ملی۔ یہاں تک کہ بالآخر خود ان پر بھی اس بیماری کا حملہ ہوُا جس کے نتیجہ میں مجبورًا آپ کو علاج کے لئے قادیان واپس آنا پڑا۔

اسی طرح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ پر بھی اس بیماری کا شدید حملہ ہوُا۔ اور اس کے نتیجہ میں کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ بار بار دل ڈوبنے کی شکایت پیدا ہو گئی اس وقت اس

خیال ہے کہ شاید آپ کا آخری وقت آن پہنچا ہے آپ نے حضرت مولوی شیر علی صاحب کو بعض دوسرے خدّامِ سلسلہ کی موجودگی میں ایک وصیّت لکھوائی جس میں آئندہ انتخاب خلافت کے متعلق طریق کار بیان فرماتے ہوئے آنے والے خلیفہ سے بھی ایک عہد لینے کی تلقین فرمائی۔ چونکہ یہ واقعہ جماعت کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس سے حضرت صاحب کے کردار کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ جب آپ سمجھے کہ وقتِ آخر آن پہنچا ہے تو ایسے وقت میں سب سے زیادہ کون سی فکر آپ کو دامنگیر ہوئی۔ اس لئے اس عہد کے الفاظ کو جسے آپ نے آنے والے خلیفہ کے لئے تجویز کیا مِن وعَن پیش کیا جاتا ہے:۔

"مَیں خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ حضرت صاحب کی بتائی ہوئی تعلیمِ اسلام پر مَیں یقین رکھوں گا اور عمل کروں گا اور دانستہ اس سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہوں گا بلکہ پوری کوشش اس کے قیام کی کروں گا۔ رُوحانی امور سب سے زیادہ میرے مدِّ نظر رہیں گے اور مَیں خود بھی اپنی ساری توجّہ اسی طرف پھیروں گا۔ اور باقی سب کی توجّہ بھی اسی طرف پھیرا کروں گا اور سلسلہ کے متعلق تمام کاموں میں نفسانیت کا دخل نہیں ہونے دُوں گا اور جماعت کے متعلق جو پہلے دو خلفاء کی سنّت ہے اس کو ہمیشہ مدِّ نظر رکھوں گا۔"

آئندہ خلیفہ کے لئے جو عہد آپ نے تجویز فرمایا وہ دراصل آپ کی اپنی فطرت اور شخصیّت کا خلاصہ ہے جو اس وقت آپ کے ذہن میں اُبھرا جب آپ یہ سمجھتے تھے کہ گویا اس دُنیا سے کوچ کرنے کا وقت آگیا ہے چنانچہ آپ کی وصیّت کا پہلا فقرہ ہی اس قلبی کیفیّت کو ظاہر کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"مَیں مرزا محمود احمد ولد حضرت مسیح موعود علیہ السّلام خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر ایسی حالت میں کہ دنیا اپنی سب خوبصورتیوں سمیت میرے سامنے سے ہٹ گئی ہے بقائمی ہوش وحواس رُوبرو ان پانچ گواہوں کے جن کے نام اس تحریر کے آخر میں ہیں اور جن میں سے ایک خود اس تحریر کا کاتب ہے، جماعت احمدیّہ کی بہتری اور اس کی بہبودی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ وصیّت کرتا ہوں۔"

اس وصیت میں آپ نے آئندہ آنے والے خلیفہ کو یہ بھی نصیحت فرمائی:۔

”اُمّہات المؤمنین خدا کے حضور میں خاص رُتبہ رکھتی ہیں پس حضرت اُم المؤمنین کے احساسات کا اگر اس کے فرائض کے رستہ میں روک نہ ہوں احترام کرے۔ میری اپنی بیویوں اور بچوں کے متعلق اس شخص کو یہ وصیت ہے کہ وہ قرضہ حسنہ کے طور پر ان کے خرچ کا انتظام کرے جو میری نرینہ اولاد انشاء اللہ ادا کرے گی۔ بصورت عدم ادائیگی میری جائداد اس کی کفیل ہو۔“

اس وصیت میں دوسرے امور کے علاوہ یہ امر بھی عجیب محسوس ہوتا ہے۔ کہ ”میں مرزا محمود احمد ولد حضرت مرزا غلام احمد قادیانی لکھوانے کی بجائے آپ نے ”مَیں مرزا محمود احمد ولد حضرت مسیح موعود علیہ السلام“ لکھوایا۔ شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی روحانی اولاد یعنی خلیفہ کی حیثیت سے یہ وصیّت لکھوا رہے تھے اس لئے ولدیّت میں آپ کا نام لکھوانے کی بجائے مقام اور مرتبہ کو ملحوظ رکھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت امّ المؤمنین کے اعلیٰ اور ارفع مقام کی نشاندہی کرنے کے باوصف اور باوجود اس کے کہ آپ کو حضرت اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا سے شدید محبّت تھی آپ نے آنے والے خلیفہ کو جہاں یہ نصیحت فرمائی کہ آپ کے احساسات کا خیال رکھے وہاں ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ **اگر اس کے فرائض کے رستہ میں روک نہ ہوں۔** اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت صاحب کے نزدیک مقامِ خلافت کتنا بلند تھا اور خلیفۂ وقت کے فرائض کتنی اہمیت رکھتے تھے۔ یہ وصیّت تاریخِ احمدیّت جلد پنجم کے صفحہ ۲۳۳ تا صفحہ ۲۳۷ پر درج ہے اور اصل وصیّت جو حضرت مولانا شیر علی صاحب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے خلافت لائبریری میں محفوظ ہے۔

اگرچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے وصیت لکھوا کر اپنا فرض ادا فرما دیا اور دنیا سے مُنہ موڑ کر رفیقِ اعلیٰ کی لِقا کے لئے ہمہ تن تیار ہو گئے مگر اللہ تعالےٰ کی مشیّت ایک دوسرے رنگ میں ظاہر ہوئی اور وصیّت لکھوانے کے بعد سے ہی آپ کی طبیعت سنبھلنی شروع ہو گئی اور اس کے بعد ہر آنے والے دن میں آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس بیماری کا آپ کے جسم پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ اس سال یعنی دسمبر ۱۹۱۸ء میں آپ کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ جلسہ سالانہ کا اہتمام فرماتے اور جماعت کو حسب معمول نصیحتوں اور ملاقاتوں سے

نوازتے لہذا اس جلسہ کو مارچ ۱۹۱۹ء پر ملتوی کرنا پڑا۔

اس بیماری کے اثرات کئی ماہ تک جاری رہے یہاں تک کہ بعض ماہر اطبّاء سے مشورہ کے لئے حضرت صاحب نے ماہ فروری میں لاہور کا سفر اختیار فرمایا۔ اور ۱۲ ر فروری ۱۹۱۹ء کو حضور رضی اللہ عنہ لاہور پہنچے جہاں ۲۴ ر فروری تک قیام کا ارادہ تھا۔ لیکن کچھ تو جماعت لاہور کو حضور سے لمبی جدائی کے بعد ملنے کا اشتیاق۔ کچھ غیر از جماعت دوستوں کا ملاقات کے لئے ذوق وشوق۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کہاں کا علاج اور کیسے مشورے۔ صبح سے لے کر رات گئے تک متفرق جماعتی ذمہ داریوں میں تیزی سے وقت گذرنے لگا یہاں تک کہ جماعت احمدیہ لاہور کی درخواست پر آپ نے ۲۳ ر فروری کو بریڈلا ہال میں "اسلام اور تعلقات بین الاقوام" کے اہم موضوع پر ایک نہایت عالمانہ اور پُر حکمت خطاب فرمایا۔ جو مسلسل تین گھنٹے تک جاری رہا۔ ہال شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگوں کا کہنا تھا کہ اس ہال میں پہلے کبھی اس کثرت سے کسی دوسرے موقع پر اتنے سامعین اکٹھے نہیں ہوئے۔

اس تقریر میں آپ نے غیر مذاہب سے تعلقات کے موضوع پر اسلامی نظریات کو ایسے رنگ میں پیش فرمایا کہ غیر مذاہب سے تعلق رکھنے والے سامعین پر اسلام کا غیر معمولی حسن وکمال بخوبی ظاہر ہوگیا۔ یہ وہ دن تھے کہ جہاں ایک طرف پنجاب کا تعلیم یافتہ طبقہ حضرت صاحب کے غیر معمولی ظاہری اور باطنی علوم سے متأثر ہو کر روز بروز پہلے سے بڑھ کر آپ کی رہنمائی کی حاجت محسوس کر رہا تھا اور دقیق علمی مضامین کے بارہ میں روشنی حاصل کرنے کے لئے نظریں قادیان کے اس خلیفہ کی طرف اُٹھ رہی تھیں وہاں دوسری طرف مذہبی تعصبات بھی زوروں پر تھے اور عامۃ الناس میں علماء، پنڈتوں اور پادریوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے نتیجہ میں اخبارات اس بات سے ڈرتے تھے کہ حضور کے علم وفضل کا اعتراف جرأت کے ساتھ کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ گو پنجاب سے باہر کے بعض دور دراز اخبارات نے اس تقریر کو غیر معمولی وقعت کی نظر سے دیکھا۔ اور اپنے اخبارات میں اسے شاندار خراجِ تحسین پیش کیا۔ لیکن لاہور کے اخبارات میں سے سوائے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے جو ایک آزاد خیال انگریزی اخبار تھا کسی ہندو یا مسلم اخبار کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ حضور کی تقریر کا ذکر کرتا۔ بعض دوسرے شہروں کے اخبارات جنہوں نے اس تقریر کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ حسب ذیل تھے:۔

(۱) روزانہ "قومی رپورٹ"۔ مدراس (۲) روزنامہ "اخوت"۔ لکھنؤ

(۳) روزنامہ "ہمدم"۔ لکھنؤ (۴) "وکیل" امرت سر۔

اس تقریر کا جو فوری اثر حاضرین نے محسوس کیا۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سید عبدالقادر صاحب پروفیسر شعبۂ تاریخ اسلامیہ کالج لاہور جو پہلے بھی کئی مرتبہ حضور سے علمی مضامین پر گفتگو فرما چکے تھے اس تقریر کے معًا بعد حضور سے ملے اور سخت اصرار فرمانے لگے کہ حضور اپنا واپسی کا پروگرام ملتوی فرما دیں اور ۲۶ فروری کو اسلامی خلافت میں پیدا ہونے والے فتنوں کے بارہ میں اسلامیہ کالج کی مارٹن ہسٹاریکل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ سے خطاب فرما دیں۔ اس مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر باوجود وقت کی قلت کے حضور نے اس درخواست کو منظور فرما لیا اور ۲۶ تاریخ کو اسلامیہ کالج ہال میں وہ شہرۂ آفاق لیکچر دیا۔ جو بعد میں "اسلام میں اختلافات کا آغاز" کے نام سے شائع ہوا۔

سید صاحب موصوف آپ کی شخصیت سے جس درجہ متأثر ہوئے اس کا کچھ اندازہ ان کے اس تعارفی خطاب سے لگایا جا سکتا ہے جو تقریر سے پہلے بحیثیت صدر انہوں نے حاضرین سے فرمایا۔

> "آج کے لیکچرار اس عزت، اس شہرت اور اس پائے کے انسان ہیں کہ شاید ہی کوئی صاحب ناواقف ہوں۔ آپ اس عظیم الشان اور برگزیدہ انسان کے خلف ہیں جنہوں نے تمام مذہبی دنیا اور بالخصوص عیسائی عالم میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ گزشتہ صدی کی تاریخ کی جہاں تک مجھے ورق گردانی کرنی پڑی ہے اس کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس عرصہ میں تین نامور انسان پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی مسلمانوں کے لئے نہایت گئی گذری تھی تاہم اس نے مختلف رنگوں کے تین انسان پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا شخص تو وہ تھا جس نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے نہایت نازک زمانہ میں مسلمانوں کی راہ نمائی کی اور مسلمانوں کو بہت حد تک تباہی سے بچا لیا۔ اس وقت اگر وہ نہ ہوتا، تو آج حیدر آباد ایسی قابلِ ذکر ریاست کا نام و نشان نظر نہ آتا۔ دوسرا شخص سر سید تھا۔ جس نے تعلیمی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اور تیسرا انسان حضرت مرزا غلام احمد تھا جس نے مذہبی دنیا میں نہایت عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ایسے وقت

میں حضرت مرزا صاحب آئے جبکہ مسلمانوں کی مذہبی حالت نہایت
بری ہو چکی تھی۔ ایسی حالت سے حضرت مرزا صاحب نے مسلمانوں کو
ابھارا اور مذہب کی طرف لوٹنے کی ترغیب دی۔ اس مقصد میں انہیں
کس قدر کامیابی ہوئی۔ اس کے متعلق میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس
کا ثبوت آپ لوگوں کے سامنے موجود ہے۔ مَیں کسی لمبی تقریر کے لئے کھڑا
نہیں ہؤا بلکہ صرف یہ بتانے کے لئے کھڑا ہؤا ہوں کہ آج کے لیکچرار
اس برگزیدہ انسان کے خلف ہیں جس نے اس زمانہ میں مذہبی دُنیا میں
تہلکہ ڈال دیا تھا۔"[1]

اسلام میں اختلاف کا آغاز

"اسلام میں اختلاف کا آغاز" کے موضوع پر آپ نے جو شہرۂ آفاق تقریر فرمائی اس میں آپ کے مخاطب صرف عامۃ النّاس نہیں تھے بلکہ فنِ تاریخ سے خوب واقف اس مضمون کے قابل اساتذہ اور طلباء کے علاوہ لاہور کے دیگر اعلیٰ تعلیم یافتہ احباب بھی بکثرت حلقۂ سامعین میں موجود تھے۔ ایسے ہزاروں روشن خیال اور تعلیم یافتہ سامعین کے سامنے آپ نے جس عمدگی سے اس مضمون کو بیان کیا وہ آپ ہی کا حصّہ تھا۔ سینکڑوں سال کی اُلجھی ہوئی گتھیاں چند منٹوں میں سلجھا دیں۔ اور اس دَور کے ایسے واقعات جن پر پہلے ابہام اور شکوک کے پردے پڑے ہوئے تھے ایسے واضح اور مدلّل انداز میں پیش فرمائے کہ دل و دماغ کی ساری تشنگیاں دُور ہو گئیں۔ چنانچہ اس تقریر کے متعلق صدر صاحب جلسہ مکرم پروفیسر سیّد عبد القادر صاحب فاضل مؤرخ کے تأثرات بارہا جماعت کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں یہاں صرف اس تبصرہ میں سے چند فقرے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

"مجھے بھی اسلامی تاریخ سے کچھ شُدبُد ہے اور مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں
کہ کیا مسلمان اور کیا غیر مسلمان۔ بہت تھوڑے مؤرخ ہیں جو حضرت عثمان
رضی اللہ عنہ کے عہد کے اختلافات کی تہہ تک پہنچ سکے ہیں اور اس مہلک
فتنہ کی اصلی وجوہات کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ . . . . . میرا خیال
ہے کہ ایسا مدلّل مضمون اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی

---

[1] الفضل ۸ر مارچ ۱۹۱۹ء صفحہ ۳

نظر سے پہلے کبھی نہیں گزرا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ
کے عہد کی جس قدر اسلامی تاریخوں کا مطالعہ کیا جائے گا اسی قدر یہ مضمون
سبق آموز اور قابلِ قدر معلوم ہوگا۔"[1]

جیسا کہ اُوپر بتایا گیا ہے آپ کی تقریر کا موضوع "اسلام میں اختلافات کا آغاز" تھا اس انتہائی ادق، مشکل اور اُلجھے ہوئے مضمون پر آپ نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی اور بہت سے اُلجھے ہوئے تاریخی عقدوں کو ایسی عمدگی کے ساتھ حل فرما دیا کہ تاریخ کے بڑے بڑے اساتذہ بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اس کے مخفی در مخفی اسباب پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے آپ نے فتنہ کے اصل سرغنوں کو بے نقاب کیا اور ثابت فرمایا کہ دراصل اس فتنے کی طنابیں بعض شر انگیز یہود کے ہاتھ میں تھیں۔ صحابہ کرام ہرگز اس میں ملوّث نہ تھے بلکہ بعض غیر تربیت یافتہ نئی نسل کے نوجوانوں اور دور دراز علاقوں کے رہنے والے نومسلموں کو آلۂ کار بنایا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ اس مضمون کی وسعت اور ترتیب اجازت نہیں دیتی کہ نمونۃً چند اقتباسات پیش کئے جاسکیں یہ ایک مسلسل مضمون ہے جو بہت سی کڑیوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اور کسی ایک کو علیحدہ پیش کرنے سے مفہوم تشنہ رہ جاتا ہے اور حقیقتِ حال پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی لہٰذا دلچسپی رکھنے والے قارئین کو اس پورے مضمون کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو بارہا جماعت احمدیہ کی طرف سے کتابی صُورت میں شائع کیا جا چکا ہے۔

عرفانِ الٰہی

جماعت احمدیہ قادیان کا وہ جلسہ سالانہ جو ۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا کی عالمگیر وبا کے باعث منعقد نہیں ہو سکا تھا۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں منعقد ہُوا۔ اس جلسہ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی علمی تقریر عرفانِ الٰہی کے موضوع پر تھی۔ بیماری کے نتیجہ میں آپ بہت کمزور ہو چکے تھے اور تقریر بھی اس حال میں کرنے کے لئے آئے کہ سر میں شدید درد تھا اور بات کرنی مشکل تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا حسّاس دل عطا فرمایا تھا کہ دُور دُور سے آنے والے مہمانوں کو مایوس کرنا گوارا نہ کیا اور اسی حالت میں تقریر کے لئے چلے آئے۔ مضمون نہایت مشکل تھا اور سامعین میں ناخواندہ دیہاتیوں سے لے کر نہایت اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ احباب تک شامل تھے پھر احمدی ہی نہیں کثرت سے غیر از جماعت دوست بھی اس نوجوان خلیفہ کی علمی قابلیت کا شہرہ

---

[1] تمہید "اسلام میں اختلافات کا آغاز"

سُنکر اور مرکزِ احمدیت کی غیر معمولی رُوحانی فضا کے تذکروں سے متأثر ہو کر تشریف لائے ہوئے تھے آپ نے نہایت سادہ اور سلیس زبان میں عرفانِ الٰہی کے مضمون کو بیان کرنا شروع کیا۔ پہلے مضمون کا تعارف کرایا۔ عرفانِ الٰہی کے معانی سمجھائے۔ علم و عرفان کی اصطلاحوں میں فرق کر کے دکھایا۔ یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ علیم تو ہے عارف نہیں۔ بلکہ خدا کے متعلق عرفان کا لفظ اطلاق پا ہی نہیں سکتا۔ عرفان کے لئے ضروری ہے کہ ایسی چیز کی جستجو کی جائے جس کا پہلے علم نہ ہو۔ اور انسان حقیقت کی تلاش میں ظاہر سے باطن کی طرف حرکت کرے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے ظاہر اور باطن برابر ہے وہ عالم الغیب والشہادت ہے اس لئے عرفان کا لفظ صرف انسان کے تعلق میں بولا جا سکتا ہے۔

غرضیکہ مختلف رنگ میں اس مضمون کو پھیر پھیر کر بیان فرمایا اور حاضرین پر یہ حقیقت بڑے خوبصورت انداز میں واضح فرمائی کہ کسی قطب یا غوث یا ولی کی ایک نظر سے ایک ہی لمحہ میں کبھی عرفانِ الٰہی نصیب نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ نے یہ امر ذہن نشین کرایا کہ عرفانِ الٰہی مسلسل محنت، جستجو اور کوشش کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے جس کے ساتھ دُعا بھی انتہائی ضروری ہے۔ پھر مضمون کا رُخ بدلتے ہوئے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا۔ کہ جو لوگ عمل اور کوشش کے بغیر صرف منہ سے دُعا مانگ کر عرفانِ الٰہی حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو کبھی کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا دعا عمل کے بغیر کچھ نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

> "ہاں دو صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بغیر عمل کے دُعا فائدہ دیتی ہے ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو حکم دے دیا جائے کہ فلاں کام کے لئے دُعا کر عمل نہ کر یعنی ظاہری سامان کو اس کام کے لئے استعمال نہ کر جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو فرمایا گیا تھا کہ طاعون سے بچنے کے لئے وہ دعا پر زور دیں اور ٹیکا نہ لگائیں اور نہ آپ کی جماعت ٹیکا لگوائے . . . . . تو باوجود اس کے کہ یہ ٹیکا طاعون کا علاج تھا اور ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو اس کے لگانے سے منع کر دیا اور دُعا کا حکم دیا۔ اور خدا تعالیٰ کے فضل سے احمدی جماعت ان ٹیکا لگانے والوں کی نسبت بہت کم اس مرض کا شکار ہوئی۔
> دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایسا موقع ہو کہ انسان عمل کر ہی نہ سکے

مثلاً ایک ایسا شخص ہو جسے جنگل میں قید کر دیا گیا ہو اور اس کے ہاتھ
پاؤں باندھ دیئے گئے ہوں۔ اب چونکہ یہ شخص عمل کر ہی نہیں سکتا،
اس کے لئے محض دعا کرنا ہی کافی ہے لیکن جب اس قسم کی روکیں نہ
ہوں اس وقت دُعا کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہوتا ہے"۔ [۱]

پھر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ بعض اوقات دعا اور عمل کے باوجود خدا نہیں ملتا۔ آپ نے فرمایا:۔

"اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی ان دونوں باتوں سے کام لیتا ہے یعنی دعا بھی کرتا ہے اور کوشش بھی تو پھر کیوں خدا نہیں حاصل ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی کوشش صحیح کوشش نہیں ہوتی۔ وہ کوشش کرتا ہے لیکن صحیح کوشش نہیں کرتا اور کامیابی کے لئے شرط یہ ہے کہ کوشش کی جائے اور صحیح طریق سے کی جائے۔ مثلاً ایک طالب علم جو مدرسہ میں پڑھنے کے لئے جاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے، کتابیں خریدے اور انہیں پڑھے لیکن اگر وہ کتابیں تو نہ پڑھے اور سارا وقت دعائیں کرتا رہے کہ مجھے علم حاصل ہو جائے تو کیا اُسے علم حاصل ہو جائیگا ہرگز نہیں۔ یا کیا اگر وہ سارا دن اُلٹا لٹکا رہے یا اپنے جسم کو سوئیاں مارتا رہے اور سمجھے کہ مَیں بڑی مشقت کر رہا ہوں اس لئے پاس ہو جاؤنگا تو وہ پاس ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں"۔ [۲]

پھر بعض متفرق اعتراضات کے جوابات دیئے مثلاً یہ کہ:۔

"لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں تنگ ظرفی پائی جاتی ہے کیونکہ اسلام کہتا ہے کہ میرے سوا اور کوئی مذہب حق پر نہیں ہے حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ کہا جاتا کہ ہر مذہب پر چلنے والا انسان نجات پا سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ یہ اعتراض کرنے والے قانونِ قدرت کی طرف نہیں دیکھتے۔ کہ اس کے ہر ایک کام میں کیا نتیجہ نکل رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب ایک ہندو ایک عیسائی ایک آریہ کے دل میں خدا کی محبت ہے اور وہ خدا کو پانے کی کوشش بھی کرتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے وہ خدا کو نہ پائے مَیں

---

[۱] عرفانِ الٰہی صہ ۱۹ [۲] عرفانِ الٰہی صہ ۱۹-۲۰

کہتا ہوں اس کی وہی وجہ ہے .... سب لوگ جانتے ہیں کہ جب تک کسی کام کے لئے صحیح کوشش نہ کی جائے اس وقت تک وہ حاصل نہیں ہوسکتا پس جب دنیاوی امور میں یہ قانون چلتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ رُوحانی امور میں بھی یہی قانون نہ چلے "[1]

اس کے بعد عرفانِ الٰہی کے حصول کے ذرائع پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ عرفانِ الٰہی درحقیقت صفاتِ الٰہیہ کو اختیار کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ آپ نے فرمایا:۔

" دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مادی اعضاء جن چیزوں کو چھُوتے ہیں وہ مادی ہی ہوتی ہیں اور جتنا جتنا مادہ اشیاء میں کم ہوتا جاتا ہے وہ اتنی ہی کم محسوس ہوتی ہیں وجہ یہ ہے کہ جب تک دو چیزوں میں مشارکت نہ ہو اس وقت تک ان کا آپس میں تعلق نہیں پیدا ہوسکتا۔ مثلاً بھینس اور علوم میں کسی قسم کی مشارکت نہیں۔ اب اس کے سامنے فلسفہ بیان کیا جائے تو کبھی نہیں سمجھ سکے گی۔ اسی طرح طوطے میں گو زبان کی مشارکت ہے لیکن عقل کی مشارکت نہیں رکھتا اس لئے آواز کی نقل کو اُتار لیتا ہے لیکن کوئی بات سمجھ نہیں سکتا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ عرفانِ الٰہی کے لئے مشارکت اور مناسبت کا ہونا ضروری ہے اور خدا کا عرفان اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جبکہ خدا سے مشارکت پیدا ہوجائے اور خدا کی صفات انسان کے اندر آجائیں .... اس لئے رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے اور اللہ تعالےٰ کے اخلاق سے مراد اس کی صفات ہیں "

پھر یہ سوال اُٹھایا کہ :۔

" یہ نکتہ تو معلوم ہوگیا کہ عرفانِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے خدا کی صفات حاصل کرلینی چاہئیں لیکن یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کی صفات حاصل کس طرح ہوسکتی ہیں .... اس کے لئے سب سے پہلی ضروری بات یہ ہے کہ انسان کو خدا تعالےٰ کی صفات کا علم ہو یہ نہ سمجھو

---

[1] عرفانِ الٰہی صفحہ ۱۲

کہ یہ معمولی بات ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان سے خدا کی کسی صفت کے معنے پُوچھے جائیں تو بتا دیتے ہیں لیکن جب معنوں کا مطلب دریافت کیا جائے تو خاموش ہوجاتے ہیں اور ان کا وہی حال ہوتا ہے جو اس شخص کا ہُوا جس نے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

کے یہ معنے کئے تھے کہ ہم لوگ تم لوگ اور میر صاحب سب کو اس کے بالوں کی زنجیر کے ساتھ باندھ کر جیل خانہ بھیج دیا۔ غرض صرف لفظوں کے معنے جاننے کافی نہیں ہوتے جب تک ان الفاظ کے ساتھ وہ کیفیت پیدا نہ ہو جو ان الفاظ سے وابستہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی ہر ایک صفت کے معنے جانے اور پھر اس کی تفصیل کرے تا کہ اس صفت کی کیفیت اس کے دل میں بیٹھ جائے مثلاً رَبّ کے معنے کرے کہ پیدا کرنے والا اور پیدا کر کے ترقی دینے والا۔ آگے اس کی تفصیل کرے کہ ترقی دینے کے کیا معنے ہیں۔ اور کس طرح ترقی دیتا ہے اور کس کس رنگ میں دیتا ہے۔ جب تک اس صفت کی پُوری پُوری کیفیت دل میں پیدا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک تفصیل کرتا ہی رہے۔" [1]

اس کے بعد ایک اور اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی:-

"عرفانِ الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ اخلاقِ الٰہیہ اپنے اندر پیدا کرنا ہے اور صفاتِ الٰہیہ اس وقت تک انسان کے اندر پیدا نہیں ہو سکتیں۔ جب تک پہلے انسان کا قلب بدیوں سے صاف نہ ہو۔ پس سب سے اوّل روک عرفانِ الٰہی کے حاصل ہونے میں ارتکابِ گناہ ہے اور ارتکابِ گناہ تین طرح ہوتا ہے اوّل اس طرح ۔ ۔ ۔ ۔ کہ بعض لوگوں کو بعض بدیاں معلوم ہی نہیں ہوتیں اور لاعلمی سے وہ ان کے مرتکب ہوجاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس اگر کوئی شخص بعض بدیوں سے غافل ہوگا تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری وجہ ارتکابِ گناہ کی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو

---

[1] عرفان الٰہی صفحہ ۲۶-۲۷-۲۸

گناہوں کا تو علم ہوتا ہے مگر وقت پر اسے ایسا جوش آجاتا ہے کہ اُسے کچھ یاد نہیں رہتا اور وہ برائی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔" [1]

بدیوں کی بحث میں حضور رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے انقلابی نقطہ نگاہ سے بھی حاضرین کو آگاہ کیا جو عموماً معلّمینِ اخلاق کے زیر بحث نہیں آتا لیکن اس زمانے کے بڑے بڑے ڈاکٹر اس طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ آپ نے فرمایا۔

"دنیا میں آج تک اس بات کو بہت کم سمجھا گیا ہے بلکہ انبیاء اور اولیاء کو علیحدہ کر کے مَیں کہہ سکتا ہوں کہ اور کسی نے سمجھا ہی نہیں کہ گو بہت سی بدیاں ایسی ہیں جو شرعی بدیاں ہیں لیکن ان کا ارتکاب کرنے والا کسی شرعی گناہ کا مجرم نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی جسمانی بیماری کا مریض ہوتا ہے یہ ایک وسیع مضمون ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق مجھے خاص علم دیا ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اس پر مفصّل لکھوں اور جب یہ علم کامل ہو جاوے گا اس وقت بعض لوگ جو اب روحانی بیمار کہلاتے ہیں اپنے علاج کے لئے جسمانی ڈاکٹروں کے پاس جاویں گے اس وقت بعض بڑے بڑے ڈاکٹروں کی توجّہ اس طرف ہو رہی ہے لیکن تاحال ان کی تحقیقات عالمِ طفولیّت میں ہے مگر اس بارے میں مجھے جو علم دیا گیا ہے وہ ایسا وسیع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان لوگوں کی تحقیقات سے بہت وسیع ہے یہ کوئی ایسا نیا علم نہیں جو مجھ سے پہلے اَوروں کو نہیں دیا گیا۔ خدا کے برگزیدہ اور پیارے بندوں کو دیا جاتا رہا ہے۔ پھر قرآنِ کریم میں بیان کیا گیا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بتایا گیا اور آپ نے اس کا تذکرہ اصولاً اپنی کتب میں کیا بھی ہے۔ مگر افسوس عام لوگوں نے اسے سمجھا نہیں اور اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا اب خدا تعالیٰ نے وسیع طور پر مجھے یہ علم دیا ہے اور مَیں نے اس کے متعلق تحقیقات کی ہے۔ جس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شرعی گناہوں کی ایسے رنگ میں تقسیم ہو سکتی ہے کہ فلاں قسم کا گناہ گار ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیئے اور فلاں قسم کا بزرگ کے پاس۔ مَیں نے یہاں تک تو تحقیقات

---

[1] عرفانِ الٰہی صفحہ ۲۹-۳۰

کر لی ہے کہ بعض انسان شرعی گناہ جسمانی بیماری کی وجہ سے کرتے ہیں
مگر ابھی یہ بات باقی ہے کہ کس قسم کے لوگوں کو ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئیے
اور کس قسم کے لوگوں کو رُوحانی طبیب کے پاس۔ جب اس کے متعلق
بھی فیصلہ ہو جائے گا تو تحقیقات مکمل طور پر پیش کی جا سکے گی "۔[1]

بُرے خیالات کو دل سے نکالنے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے خیالات کے اثرات کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی:۔

"دراصل انسان جس قدر کام کرتا ہے وہ خیال ہی کے ذریعہ کرتا ہے۔ اگر کہو کہ اور چیزیں جب خیال کے ساتھ ملتی ہیں تب کام ہوتا ہے اکیلا خیال کچھ نہیں کر سکتا اس لئے خیال بے حقیقت چیز ہے تو میں کہتا ہوں کہ اس طرح تو اس بیج کو بھی بے حقیقت قرار دینا پڑے گا جس سے بڑ کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ .... اگر کوئی شخص بیج کو اس لئے بے حقیقت کہہ سکتا ہے کہ جب تک دوسری چیزیں اس کے ساتھ نہ ملیں اس وقت تک اس سے درخت نہیں بن سکتا۔ تو وہ خیال کو بھی بے حقیقت کہہ سکتا ہے لیکن جب بیج کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بے حقیقت ہے تو خیال کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بے حقیقت شے ہے۔ پس خوب یاد رکھو کہ خیال کوئی بے حقیقت چیز نہیں ہے بلکہ خیال مادہ ہے تمام چیزوں کا۔ کیونکہ اسی سے آگے نتائج نکلتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے
وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (۲-۲۸۵)
کہ اے لوگو! جو خیال تمہارے دل میں آئے اُسے فوراً تم عمل میں لاؤ یا پوشیدہ رکھو اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ یوں اگر کسی کے دل میں کوئی خیال پیدا ہوگا تو بھی اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا کیونکہ خدا تعالیٰ بھی فرماتا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں کہ جس بات پر انسان کا بس نہیں اس کا مواخذہ نہیں ہوگا ...... ہاں اگر یہ خیال آنے پر وہ سوچنا شروع کر دے کہ میں کس طرح اس مال کو اٹھاؤں کس وقت اٹھاؤں تو اس کا سوچنا اور تدبیریں کرنا قابلِ مؤاخذہ ہوگا۔"[2]

---

[1] عرفانِ الٰہی صفحہ ۳۱-۳۲ [2] عرفانِ الٰہی صفحہ ۴۱-۴۲

صفاتِ الٰہیہ کو اپنے نفس میں جاری کرنے کے ذرائع بیان کرتے ہوئے آپ نے گناہ اور بدی اور نیکی کے موضوعات پر بھی اظہارِ خیال فرمایا اور ان کی صحیح تعریف سے بھی حاضرین کو روشناس کرایا اور ان ٹھوکر کے مقامات سے بھی متنبہ کیا جو طالبِ حق کے راستہ میں عموماً آیا کرتے ہیں۔ اور غیر جانبدار اور منصفانہ محاسبہ کی عادت ڈالنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"ایک گُر بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان میں ایسا غیرت کا مادہ رکھا ہے کہ وہ ایک فعل خود تو کر لیتا ہے لیکن اسی فعل کو اگر کوئی اور اس کے سامنے کرتا ہے تو اسے غیرت آجاتی ہے اور وہ اسے سخت ناپسند کرتا ہے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مَیں نے ایک چور سے پوچھا تمہیں چوری کرنا بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ کہنے لگا بُرا کیونکر معلوم ہو۔ ہم محنت و مشقت سے کماتے ہیں اور بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں۔ یُونہی تھوڑا کہیں سے اُٹھا لاتے ہیں۔ فرماتے تھے یہ سُنکر مَیں نے اس سے کچھ اَور باتیں شروع کر دیں اور تھوڑی دیر کے بعد پوچھا تم مال آپس میں کس طرح تقسیم کیا کرتے ہو۔ اس نے کہا ایک سُنار ساتھ شامل ہوتا ہے اُسے سب زیورات دے دیتے ہیں۔ وہ گلا کر سونا بنا دیتا ہے یا چاندی یا جیسا زیور ہو۔ پھر مقرر شدہ حصّوں کے مطابق ہم تقسیم کر لیتے ہیں۔ مَیں نے کہا اگر اس میں سے کچھ رکھ لے تو پھر۔ وہ کہنے لگا اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس بدمعاش چور کا سر نہ اڑا دیں وہ اس کے باپ کا مال ہے کہ اس میں سے رکھ لے۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے اعمال کو اَور نظر سے دیکھتا ہے اور دوسرے کے اعمال اَور نظر سے۔ پس گناہ کی تعریف اپنے نفس کو مدِّنظر رکھ کر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ دوسروں کے اعمال کو مدِّنظر رکھ کر کرنی چاہیئے۔"[1]

آخر پر ہم صرف ایک اور اقتباس دے کر اس ذکر کو ختم کرتے ہیں یہ اقتباسات محض اس لئے دیئے جا رہے ہیں تا کہ اصل کتاب پڑھنے کی طرف توجّہ پیدا ہو اور علم و عرفان کے اس خزانے سے قارئین زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

---

[1] عرفانِ الٰہی صـ۸۵

"دسویں بات یہ ہے کہ ناامید نہ ہو اور اللہ پر توکل ہو۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محنت کرتے کرتے ایسے موقع پر ناامید ہو کر ہٹ جاتے ہیں جبکہ انہیں محنت کا ثمرہ ملنے والا ہوتا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ لکھتے ہیں کہ وہ ہر روز رات کو اُٹھ کر بعض امور کے متعلق دُعا مانگا کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک دفعہ ان کا ایک مُرید ان سے ملنے کے لئے آیا اور تین چار دن اُن کے پاس ٹھہرا۔ جس وقت وہ رات کو نماز کے لئے اُٹھے اس کی بھی آنکھ کھُل گئی اور وہ بھی اپنے طور پر عبادت میں مشغول رہا۔ جب پیر صاحب دُعا سے فارغ ہوئے تو ان کو ایک آواز آئی کہ تو خواہ کتنی ہی گریہ وزاری کر تیری دعا قبول نہ ہوگی۔ یہ آواز گو الہامی تھی مگر اس مرید کو بھی سُنائی دی۔ مرید نے دل میں اس پر تعجب تو کیا مگر پیر کے پاس ادب سے خاموش رہا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح وہ بزرگ اُٹھے اور دُعا میں مشغول ہوئے۔ اس دن بھی اُسی طرح آواز آئی اور مرید نے بھی سُنی مگر پھر بھی خاموش رہا۔ تیسرے دن پھر وہ بزرگ اُٹھے اور اسی طرح دُعا اور عبادت میں مشغول ہوئے اور پھر وہی آواز آئی جو مرید نے بھی سُنی تب اس سے نہ رہا گیا اور اس نے پیر صاحب سے کہا کہ ایک دن ہُوا دو دن ہُوا تین دن سے آپ کو یہ آواز آرہی ہے اور آپ بھی بس نہیں کرتے اس پر وہ بزرگ بولے کہ نادان تُو اتنی جلدی گھبرا گیا۔ مجھے تو یہ آواز بیس سال سے آرہی ہے مگر مَیں سُستی نہیں کرتا۔ کیونکہ دُعا عبادت ہے اور بندہ کا کام عبادت ہے۔ خدا تعالیٰ معبُود ہے اس کا کام دُعا کو قبُول کرنا یا ردّ کرنا ہے وہ اپنا کام کر رہا ہے مَیں اپنا کام کر رہا ہوں۔ تُو بیچ میں کون ہے جو گھبرا رہا ہے۔ اس پر وہ مرید خاموش ہو گیا۔ اگلے دن جو وہ دعا کے لئے اُٹھے تو ان کو الہام ہُوا کہ اس بیس سال کے اندر کی تیری سب دعائیں قبول کی گئیں کیونکہ تو امتحان میں کامیاب ہُوا اور آزمائش میں پورا اُترا۔ اس پر انہوں نے مرید سے کہا کہ دیکھ اگر مَیں تیری نصیحت پر عمل کرتا تو کس قدر گھاٹے میں رہتا۔ مجھے خدا پر توکل تھا آخر اس کا قرب

مجھے نصیب ہُوا ۔ اب دیکھو کہ اگر وہ بزرگ مرید کی بات مان لیتا تو ایسے
وقت میں جبکہ اس کی ساری دُعائیں قبول ہونے میں بہت ہی تھوڑا عرصہ
رہ گیا تھا اس کا دعا کو ترک کر دینا کیسا خطرناک ہوتا اور اس کی سب
محنت ضائع ہو جاتی ۔ پس مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے ۔ ہمّت سے
قدم آگے ہی بڑھاتا چلا جاوے اور اپنی ناکامی پر کام نہ چھوڑ بیٹھے ۔ ہاں
یہ بے شک غور کرے کہ میری ناکامی کے سبب کیا ہیں ۔ اور اگر کوئی سبب
معلوم ہو تو اس کو دُور کرنے کی کوشش کرے مگر خدا تعالیٰ کے فضل
سے ناامید کبھی نہ ہو۔"[1]

اس جلسہ پر آپ کی مختلف تقاریر کا جو اثر غیروں نے قبول کیا اس کے تفصیلی ذکر کا تو موقع نہیں ہاں معاصر اخبار الحکم کے ایک اقتباس پر اکتفاء کی جاتی ہے جو ایک سخت معاند آریہ سماجی اخبار کے اعتراف حق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

ایک قادر الکلام کا اعجاز

"آپ کی تقریر کے متعلق آریہ سماج کے معزز اور زبردست اخبار" پرکاش" کی رائے یقیناً دلچسپی سے پڑھی جائیگی اور مَیں اسے اس لئے یہاں دیتا ہوں کہ احمدی جماعت کو معلوم ہو جاوے کہ اس کی عقیدت اور ارادت کے متعلق مخالفینِ سلسلہ بھی ایک خاص عظمت محسوس کرتے ہیں ۔ چنانچہ پرکاش لکھتا ہے کہ :۔

"جلسہ میں خاص کشش کا باعث میرزا محمود احمد صاحب کے لیکچر تھے ہمیں احمدی دوستوں کی عقیدت اور بُردباری کی تعریف کرنی چاہیئے کہ میرزا صاحب کے لیکچر پانچ گھنٹے تک ہوتے رہے اور وہ سنتے رہے ۔ آریہ سماج کے اندر بڑے سے بڑا دیا کھتا (لیکچرار) بھی یہ ہمّت نہیں رکھتا کہ حاضرین کو پانچ گھنٹوں تک بٹھا سکے ۔ یہاں تو لوگ ایک گھنٹہ میں اُکتانے لگ جاتے ہیں ۔ ہم اپنے احمدی دوستوں کو اُن کے جلسہ کی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں"

معزز ہمعصر کی اس صاف اور بے لوث رائے پر مَیں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں احمدی جماعت کی عقیدت اور ارادت کے علاوہ ایک خاص چیز ہے جس کا اشارہ خود" پرکاش" نے کیا ہے ۔ وہ حضرت

---

[1] عرفانِ الٰہی صفحہ ۶۱-۶۲

خلیفۃ المسیح کی زبردست شخصیت ہے اور آپ کو اپنے کلام پر ایسی قدرت اور حکومت ہے کہ وہ اپنے سننے والوں کو جس قدر عرصہ تک چاہیں محویّت کی حالت میں رکھ سکتے ہیں۔

لاہور کے حال کے دونوں پبلک جلسے اس امر کی زبردست شہادت ہیں اور عجیب بات ہے کہ ایسی تمام تقریریں عموماً آپ نے حالتِ مرض میں کی ہیں" [1]

تقدیرِ الٰہی

جماعت احمدیہ کا جلسہ سالانہ جو دسمبر ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوا اس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی علمی تقریر تقدیرِ الٰہی کے موضوع پر تھی۔ یہ مضمون ہمیشہ سے اہلِ مذاہب ہی نہیں بلکہ فلسفیوں اور حکماء کے درمیان بھی کئی لحاظ سے مابہ النّزاع رہا ہے۔ جبر اور اختیار کی گتھیوں کو سلجھانے میں انسان ہزاروں سال سے اُلجھا ہوا ہے لیکن گذشتہ حکماء کی بحثوں کا مطالعہ کریں یا جدید فلاسفہ کی تحریرات کو پڑھیں ہنُوز روزِ اوّل کا سا معاملہ نظر آتا ہے۔ "مُرغی پہلے تھی کہ انڈا پہلے" جیسے یہ سوال فلسفیوں سے کبھی حل نہ ہو سکا۔ تقدیر کی کُنہ کو بھی وہ نہ پا سکے اور یہ سوال ہمیشہ انسانی ذہن کے لئے ایک چیلنج بنا رہا کہ تقدیر کیا چیز ہے؟ جُوں جُوں انسان اس مسئلہ پر غور کرتا ہے سوالات کی نئی نئی شاخیں پھوٹتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ خدا تعالیٰ قادر ہے تو کن معنوں میں۔ کیا وہ ہر چیز پر قادر ہے یا محض بعض چیزوں پر۔ تقدیر ٹل سکتی ہے یا نہیں۔ تدبیر سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ تدبیر غالب ہے یا تقدیر۔ اگر تقدیر غالب ہے تو تدبیر کی ضرورت کیا ہے۔ تدبیر ضروری ہے تو تقدیر کے معنے کیا ہیں۔ علمِ الٰہی اور تقدیر کا رشتہ کیا ہے۔ اگر خدا عالم الغیب ہے تو پھر کسی انسان کے بااختیار ہونے کی گنجائش کہاں تک ہے۔ انسان اپنے عمل اور ارادہ سے تقدیرِ الٰہی کو کیسے بدل سکتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوالات ذہنِ انسانی کو اَور اُلجھاتے چلے جاتے ہیں اور ذہنی کاوشوں کا نتیجہ مزید الجھنوں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا اس موضوع پر ایک ایسے جلسہ عام سے خطاب فرمانا جہاں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ذہین اور بلید ہر قسم کے لوگ جمع تھے یقیناً کوئی معمولی کام نہ تھا۔ آپ نے جس عمدگی سے اس مضمون کو بیان کیا بلاشبہ وہ آپ ہی کا حق تھا۔ یہ تقریر کیا تھی علمِ کلام کا ایک شاہکار تھا۔ حق تو یہ ہے، کہ

---

[1] الحکم ۲۸ اپریل ۱۹۱۹ء صفحہ ۲

ہر محقق کو اس تقریر کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیئے۔

مسئلہ قضاء وقدر کی اہمیّت اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بیان کرنے کے بعد آپ نے اس موضوع پر اظہارِ خیال فرمایا کہ مسئلہ تقدیر پر ایمان اور وجودِ باری تعالےٰ پر ایمان لانا دراصل لازم و ملزوم ہیں۔ اس کے بعد آپ نے قضاء و قدر کے متنازعہ فیہ نظریات پر بحث فرما کر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات میں تطبیق فرمائی۔ اور اس کے بعد مسئلہ تقدیر کے نہ سمجھنے کے نتیجہ میں انسان کو جو بڑی بڑی ٹھوکریں لگی ہیں اُن کا ذکر فرمایا۔ ہندوؤں نے کیا ٹھوکر کھائی اور کیا نقصان اٹھایا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا غلطیاں کیں اور دیگر فلاسفہ نے اس مسئلہ کو نہ سمجھ کر کیا کیا نقصانات اٹھائے ان تمام امور پر آپ نے نہایت مُدلّل اور دلنشین انداز میں بحث فرمائی۔

پھر وحدت الوجود کے عقیدے کی غلطیاں ظاہر کرتے ہوئے چھ قرآنی آیات سے نہایت لطیف اور ٹھوس دلائل پیش کر کے اس عقیدہ کا ردّ فرمایا۔ بعد ازاں اس کی دوسری انتہاء کو بھی غلط ثابت فرمایا اور اس خیال کی بدلائل تردید کی کہ خدا گویا کچھ نہیں کر سکتا۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ تدبیر ہی ہے۔ علمِ الٰہی اور تقدیرِ الٰہی کو خلط ملط کرنے کے نتیجہ میں انسانی فکر نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اس کا نہایت عمدہ تجزیہ کر کے اس مسئلہ کو خوب نکھارا۔ اور اس امر پر بھی گفتگو فرمائی کہ اللہ تعالےٰ بُرے کاموں سے روک کیوں نہیں دیتا جبکہ وہ اس بات پر قادر ہے اس ضمن میں ایک اقتباس پیش ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کو جب یہ علم تھا کہ فلاں آدمی فلاں وقت یہ بُرا کام کرے گا تو اُسے روک کیوں نہیں دیتا۔ مثلاً اگر خدا تعالےٰ کو علم ہے کہ فلاں شخص چوری کرے گا تو کیوں اس نے چوری کرنے سے اُسے روک نہ دیا؟ ہمارے پاس اگر ایک شخص سُندر سنگھ ڈاکو آئے اور کہے کہ مَیں نے فلاں وقت جیون لال کے گھر ڈاکہ مارنا ہے تو اس علم کے باوجود اگر ہم چُپ بیٹھے رہیں تو ہم مجرم ہوں گے کہ نہیں؟ یقیناً شرعی۔ اخلاقی۔ تمدنی اور اپنے مُلک کے قانون کے لحاظ سے ہم مجرم ہوں گے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی اَور کام ہو، اور ہم جیون لال کو نہ بتا سکیں کہ اس کے گھر فلاں وقت ڈاکہ پڑے گا۔ یا ہو سکتا

ہے کہ اگر اسے بتانے جائیں تو اپنے نقصان کا خطرہ ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ یہ خطرہ ہو کہ اگر بتایا تو ڈاکو ہمیں مار دیں گے۔ پس جب باوجود اس کے کہ اس ڈاکو کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے میں ہمیں خطرات ہیں۔ اگر ہم اس کو باز نہیں رکھتے یا ایسے لوگوں کو اطلاع نہیں دیتے جو اُسے باز رکھ سکتے ہیں، ہم زیرِ الزام آجاتے ہیں تو پھر خدا تعالےٰ جو طاقتور اور قدرت والا ہے اس کو کسی کا ڈر نہیں۔ اور کوئی اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا اس پر زیادہ الزام آتا ہے کہ وہ علم رکھنے کے باوجود کیوں ڈاکو کو روک نہیں دیتا یا جس کے گھر ڈاکہ پڑنا ہو اس کو نہیں بتا دیتا تاکہ وہ اپنی حفاظت کا سامان کرلے۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسان تو معذور بھی ہو کیونکہ کوئی نہ کوئی وجہ اس کی معذوری کی ہو سکتی ہے وہ باوجود اس کے پکڑا جائے مگر خدا پر باوجود اس کے قادر ہونے کے کوئی الزام نہ آئے۔

مگر یہ اعتراض محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ کے متعلق اس مثال کا پیش کرنا ہی غلط ہے اور دنیا میں انسان کی پیدائش کی غرض کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ بنائی گئی ہے خدا تعالےٰ کا تعلق جو بندوں سے ہے اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ لڑکوں کا امتحان ہو رہا ہے اور سپرنٹنڈنٹ ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کے لئے کیا یہ جائز ہے کہ جو لڑکا غلط سوال کر رہا ہو اس کو بتا دے؟ نہیں۔ پس جب انسان کو دنیا میں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کو امتحان میں ڈال کر انعام کا وارث بنایا جائے۔ تو اگر اس کے غلطی کرنے پر اسے بتا دیا جائے کہ تو فلاں غلطی کر رہا ہے تو پھر امتحان کیسا؟ اور انعام کس کا؟

اس معاملہ میں خدا تعالےٰ کا جو تعلق بندوں سے ہے وہ وہی ہے جو اس سپرنٹنڈنٹ کا ہوتا ہے جو کمرہ امتحان میں پھر رہا ہو اور جو دیکھ رہا ہو کہ لڑکے غلط سوال بھی حل کر رہے ہیں اور صحیح بھی۔ پس باوجود علم کے اللہ تعالےٰ کا بندہ کو فرداً فرداً نہ روکنا اس کی شان کے خلاف

نہیں۔ بلکہ اس غرض کے عین مطابق ہے جس غرض کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔"[1]

صوفیوں اور بزرگوں کے مختلف لطیفے بیان کر کے آپ نے اس مسئلے پر صوفیاء اور بزرگانِ اُمّت کے اقوال کا صحیح مفہوم پیش فرمایا۔ تقدیر اور تدبیر کے درمیان توازن پر روشنی ڈالی اور تقدیر کی مختلف اقسام بیان کیں اور اس سلسلہ میں بہت سے ایسے امور بیان کئے جو اگرچہ قرآن کریم سے استنباط کئے گئے لیکن گذشتہ علماء اور محققین کی ان نکات تک رسائی نہ ہو سکی تھی۔

تقدیرِ خاص کو آپ نے دو حصّوں میں منقسم فرمایا ایک ایسی تقدیرِ خاص جس کے ساتھ اسباب بھی ظاہر ہوتے ہیں اور ایک ایسی تقدیرِ خاص جس کے ساتھ یا تو اسباب ظاہری نہیں ہوتے یا سرے سے موجود ہی نہیں ہوتے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

"اس تقدیرِ خاص کے علاوہ جس کے ظہور کے لئے اللہ تعالیٰ اسباب پیدا فرماتا ہے۔ ایک تقدیر وہ بھی ہے جو بلا اسباب کے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

اوّل وہ تقدیر جس کا ظہور درحقیقت بلا اسباب کے ہی ہوتا ہے مگر کسی خاص حکمت کے ماتحت اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اسباب کو بھی شامل کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ حضرت صاحب کو الہام ہوا کہ احمدیوں کو بالعموم طاعون نہیں ہوگی۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی کہا کہ جرابیں پہنیں شام کے بعد باہر نہ نکلیں اور کونین استعمال کریں یہ اسباب تھے مگر حقیقی بات یہی ہے کہ یہ تقدیر بغیر اسباب کے تھی کیونکہ جرابیں اور دستانے زیادہ پہننے والے تو اَور لوگ بھی تھے پھر زیادہ دوائیاں استعمال کرنے والے بھی اَور لوگ تھے۔ احمدیوں کے پاس کوئی زیادہ اسباب نہ تھے کہ وہ طاعون سے ان کی وجہ سے محفوظ رہتے۔ دراصل جرمز کو حکم تھا کہ احمدیوں کے جسم میں مت داخل ہو۔ مگر ساتھ ہی احمدیوں کو بھی حکم تھا کہ اسباب کو اختیار کرو۔ وجہ یہ کہ یہ حکم دشمن کے سامنے بھی جانا تھا اور ایمان اور عدمِ ایمان میں فرق نہ رہ جاتا۔ اگر بغیر ان اسباب کے احمدی طاعون سے محفوظ رہتے یا اگر

[1] تقدیر الٰہی صفحہ ۱۱۰-۱۱۱

اس حکم میں استثنائی صورتیں پیدا ہی نہ ہوتیں تو سب لوگ احمدی ہو جاتے اور یہ ایمان، ایمان بالغیب نہ ہوتا۔

(۲) دوسری قسم اس قسم کی تقدیر کی وہ ہے جس میں اسباب موجود بھی نہیں ہوتے اور ساتھ شامل بھی نہیں کئے جاتے۔ یہ تقدیر صرف نبیوں اور مومنوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہے دوسروں کے سامنے نہیں ہوتی کیونکہ دوسروں کے سامنے اگر یہ تقدیر ظاہر ہو تو وہ ایمان حاصل کرنے کے ثواب سے محروم رہ جاویں۔ لیکن مومن جو ایمان بالغیب لا چکتے ہیں ان کو ایمان بالشہادت اس تقدیر کے ذریعے سے دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ خاص طور پر ایمان میں ترقی کرتے ہیں۔

اس قسم کی تقدیر کی مثال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی زندگی میں آپؑ کے کُرتہ پر چھینٹیں پڑنے کا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ آپ نے رؤیا میں دیکھا کہ مَیں خدا کے سامنے کچھ کاغذات لے کر گیا ہوں اور ان کو خدا کے سامنے پیش کیا ہے۔ خدا نے ان پر دستخط کرتے وقت قلم چھڑکا ہے اور اس کے قطرے میرے کپڑوں پر پڑے ہیں۔ حضرت صاحب کو جب یہ کشف ہُوا اس وقت مولوی عبداللہ صاحب سنوری آپ کے پاؤں داب رہے تھے۔ دباتے دباتے انہوں نے دیکھا کہ حضرت صاحب کے ٹخنے پر سُرخ رنگ کا چھینٹا پڑا ہے جب اس کو ہاتھ لگایا تو وہ گیلا تھا جس سے وہ حیران ہوئے کہ یہ کیا ہے۔ مَیں نے ان سے سوال کیا تھا کہ آپ کو خیال نہ آیا کہ یہ چھینٹے غیر معمولی نہ تھے بلکہ کسی ظاہری سبب کے باعث تھے اور انہوں نے کہا مجھے اس وقت خیال آیا تھا، اور مَیں نے اِدھر اُدھر اور چھت کی طرف دیکھا تھا کہ شاید چھپکلی کی دُم کٹ گئی ہو اور اس میں سے خون گرا ہو مگر چھت بالکل صاف تھی اور ایسی کوئی علامت نہ تھی جس سے چھینٹوں کو کسی اور سبب کی طرف منسوب کیا جا سکتا۔ اس لئے جب حضرت صاحب اُٹھے، تو اس کے متعلق مَیں نے آپ سے پوچھا۔ آپ نے پہلے تو ٹالنا چاہا لیکن

پھر ساری حقیقت سُنائی ....

غرض مومنوں کے ایمان کو تازہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کبھی کبھی
تقدیر بلا اسباب کے بھی ظاہر کرتا ہے تا خدا تعالیٰ کی قدرت کا ثبوت
ان کو ملے لیکن کافر کا یہ حق نہیں ہوتا کہ اس قسم کا مشاہدہ کرایا جائے" [1]

یہ تقریر تقدیرِ الٰہی کے مسئلہ پر ہر پہلو سے بحث کرتی ہے اور مختلف قدیم و جدید اعتراضات کے جوابات بھی اس میں دیئے گئے ہیں۔ تقدیر کے ذکر میں آپ نے سات رُوحانی مقامات کا ذکر بھی فرمایا ہے جو تقدیر الٰہی کے مسئلہ کو صحیح معنوں میں سمجھ کر اس کے تقاضے پُورے کرنے کے نتیجہ میں انسان کو مل سکتے ہیں۔ گویا کہ روحانی ترقیات کے سات آسمان ہیں جن کی رفعتوں پر سب سے اُوپر ہمیں آنحضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

۱۹۱۹ء کے اسی جلسہ میں جس میں تقدیر الٰہی کے موضوع پر تقریر ہوئی۔ ۲۷ر دسمبر کی تاریخ انتظامی اور متفرق امور پر خطاب کے لئے وقف تھی لیکن عمومی نصائح کے دوران اس تقریر میں آپ نے بعض دیگر علمی مسائل پر بھی روشنی ڈالی خصوصاً معبود اور عبد کے تعلقات۔ رُوح کے خدا سے عہد اور جنّت کی حقیقت پر نہایت لطیف بحث فرمائی۔

جنّت کے ذکر میں آپ نے اس زمانے کے مسلمانوں کا جنّت کے بارہ میں وہ عام نقشہ بھی پیش کیا جو ظاہر بین مولوی مسلمانوں کے سامنے کھینچا کرتے تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"ایک دفعہ ہم ندوہ کے جلسہ پر گئے جو مسلمانوں کا بڑا مذہبی تعلیم کا مرکز مانا جاتا ہے۔ اس میں ایک مولوی صاحب کا وعظ نماز کی خوبیوں پر تھا۔ مولوی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا نماز پڑھنے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے کہا ہے جو نماز پڑھے گا اسے جنّت ملے گی۔ اور جنّت کیا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے جنّت کا نقشہ اس طرح کھینچنا شروع کیا کہ اس میں بڑی خوبصورت اور حسین عورتیں ہوں گی اور یہ ہوگا وہ ہوگا۔ اس کا وعظ سُن کر میں نے کہا سر سید نے کسی ایسے ہی مولوی کا جنّت کے متعلق وعظ سُن کر کہا ہوگا یہ جنّت جو آج کل کے مسلمان پیش کرتے ہیں وہ چکلا ہے۔ ان مولوی صاحب نے ایسے شرمناک طور پر عورت اور مَرد

---

[1] تقدیر الٰہی صفحہ ۱۳۵ تا صفحہ ۱۳۷

کے مخصوص تعلقات کا بیان شروع کیا کہ غیر احمدی خود شرمندہ ہو ہو کر اپنے
مونہوں پر رومال رکھنے لگے اور کہتے اچھا ہؤا یہ لیکچر رات کو ہؤا اور کوئی
غیر مذہب کا آدمی اس میں شامل نہیں ہؤا ورنہ بڑی ذلّت ہوتی" [1]

اسی تقریر کے دَوران آپ نے حقیقی عبد بننے کے طریق بیان فرماتے ہوئے نماز باجماعت کی اہمیت پر بہت زور دیا۔ نیز تعدّدِ ازدواج پر اور مسئلہ سود پر بھی بحث کی جو مطبوعہ تقریر کے صفحہ ۵۹ تا صفحہ ۶۳ پر درج ہے۔ سُود کے بارہ میں اسلامی نظریہ پر جو احباب تحقیق کرنا چاہیں انہیں ان صفحات کے مطالعہ سے بہت سے رہنما اصول ہاتھ آسکتے ہیں۔

ملائکۃ اللہ

ملائکۃ اللہ آپ کی وہ معرکۃ الآراء تقریر ہے جو آپ نے ۲۸ دسمبر ۱۹۲۰ء کو جلسہ سالانہ کے موقع پر مسجد نور قادیان میں فرمائی۔ مضمون کے ابتدائی تعارف کے بعد آپ نے ملائکہ کے بارہ میں مسلمانوں کا رائج الوقت تصوّر بیان فرماتے ہوئے اس کی غیر معقولیّت کو ثابت فرمایا اور بتایا کہ درحقیقت رائج الوقت تصوّر ہرگز قرآن وحدیث کی تعلیم پر مبنی نہیں بلکہ وہ توہمات اور خیالات ہیں جو غیر قوموں سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے یہ ثابت کیا کہ یہ ایک ایسا غلط تصوّر ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے سے دینِ اسلام میں کوئی بھی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:-

"لوگوں کو ملائکہ کے متعلق جو ایمان ہے وہ ننانوے فیصدی لوگوں میں اتنا کم ہے کہ اگر اس کی نفی کر دی جائے تو ان کے موجودہ ایمان میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اور ان کے ماننے کی وجہ سے ان کے ایمان میں کوئی زیادتی نہیں ہے۔ حالانکہ ہر ایک ایمانی مسئلہ کے یہ معنے ہیں کہ وہ بہت بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے فائدے بھی بہت بڑے ہیں اور اس کو ترک کرنے کے نقصان بھی بہت بڑے ہیں نہ یہ کہ صرف مُنہ سے کہہ دیں کہ فلاں بات ہم نے مان لی تو کافی ہوجاتا ہے ۔ . . . . . .

اگر ہمیں ان سے کوئی فائدہ نہیں تو ان پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کوئی کہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر فرشتے تعلیم لائے

---

[1] تقدیر الٰہی صفحہ ۵۸

اس لئے ان پر ایمان لانا چاہیئے تو کہا جا سکتا ہے کہ پھر ہمیں ان سے کیا تعلق؟
اگر ان کی معرفت وحی کا آنا ہمیں معلوم نہ ہو تو ہمارے ایمان اور ہمارے عمل
میں کیا کمی آجائے گی؟ اگر یہی فرض کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام بلاواسطہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل فرماتا تھا تو اس سے کیا
حرج واقع ہوگا؟ اس سے قرآن کریم میں تو کوئی کمی نہیں آجائیگی۔ پھر ہم
سے فرشتوں کا وجود کیوں منوایا جاتا ہے؟ اور اتنے زور سے کیوں منوایا
جاتا ہے کہ اگر نہ مانیں تو مسلمان ہی نہیں رہتے۔ کافر ہو جاتے ہیں"۔[1]

بعد ازاں آپ نے وجودِ ملائکہ کو ایک ایسی حقیقت کے طور پر پیش کیا جس کا اثبات دیگر حقائق کی طرح ٹھوس دلائل سے کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"نئی تعلیم کی وجہ سے ملائکہ پر بہت اعتراض کئے جاتے ہیں مگر ہم اللہ تعالیٰ
کے فضل سے ان کو ثابت کر سکتے ہیں اور اسی طرح ثابت کر سکتے ہیں جس
طرح اور بہت سی چیزوں کو ثابت کیا جاتا ہے جو نظر سے غائب ہوتی ہیں"۔[2]

تقریر کے آغاز میں آپ نے ملائکہ کے متعلق ان تصورات کا ذکر بھی کیا جو دیگر قدیم و جدید مذاہب میں پائے جاتے ہیں اور یہ ثابت کیا کہ یہ ایک ایسا تصور ہے جو مختلف مذہبی قوموں میں ہر زمانے میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملائکہ کا تصور کوئی واہمہ نہیں بلکہ ایک ٹھوس مذہبی حقیقت ہے جو سب مذاہب میں قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے۔ مزید برآں آپ نے یہ بھی ثابت فرمایا کہ مختلف مذاہب میں فرشتوں کے تصورات صرف اجمالی اشتراک نہیں رکھتے۔ بلکہ بعض صورتوں میں حیرت انگیز طور پر تفصیلی اشتراک بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ زرتشتی مذہب میں فرشتوں کا تصور پیش کرتے ہوئے آپ نے بتایا:۔

"زرتشتی کتب میں سب سے بڑے فرشتہ کا نام "دوہومناح" لکھا ہے۔
اسے "وہشتا مناح" بھی کہتے ہیں یعنی سب سے بہتر فرشتہ، دوہومناح کے
معنے نیک دل یا اصلاح کرنے والے فرشتہ کے ہیں اور عبرانی اور عربی
میں جبریل کے معنے بھی اصلاح کے ہیں۔ پس دونوں ناموں کی مطابقت
سے معلوم ہوتا ہے کہ دوہومناح درحقیقت جبریل کا ہی نام ہے۔
زرتشتی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دماغ کو روشنی اس فرشتہ

---

[1] ملائکۃ اللہ صفحہ ۲   [2] ملائکۃ اللہ صفحہ ۹

کی وساطت سے آتی ہے بلکہ زرتشت نے خدا سے دُعا کی تھی کہ نُور اور الہام کی روشنی سے وہ دوہوماناح کو دیکھے اور آخر وہ فرشتہ اُسے ملا۔ تمام نیک تحریکیں اس فرشتہ کی طرف سے آتی ہیں اور جو لوگ اس فرشتہ کی تحریکات کو قبول نہیں کرتے یہ فرشتہ ان کو چھوڑ دیتا ہے۔......

......ان کا خیال ہے کہ فرشتے ہمیشہ انسان کے دل پر نیک اثر ڈالتے رہتے ہیں تاکہ شیطان اس میں نہ گھس سکے اور کہتے ہیں پیدائش خُدا کی طرف سے ہے اور موت شیطان کی طرف سے ہے اس وجہ سے وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ چونکہ پیدائش خدا کی طرف سے ہوتی ہے اس لئے انسان نیک ہی پیدا ہوتا ہے اور فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں مگر شیطان اس کو بُرائی سکھاتا ہے۔ اگر انسان اس کی بات مان لے، تو فرشتے اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کہ اب یہ شیطان کا بندہ ہوگیا ہے۔

پھر ان کا خیال ہے کہ خدا اور شیطان کا مقابلہ ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ ایرانی النسل ایک نبی پیدا ہوگا اور اس کا نام میسیوزبھی ہوگا۔ یعنی مسیح مبارک کے نام سے ایک نبی آئے گا جو زرتشت کی اولاد سے ہوگا مگر ظاہری اولاد سے نہیں۔ کیونکہ لکھا ہے کہ وہ اس بیوی سے ہوگا جس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

اس کے زمانہ میں شیطان سے آخری جنگ ہوگی وہ خدا تعالیٰ سے التجا کرے گا کہ جنگ بہت مہیب ہے تو فرشتے نازل کر۔ اس پر خدا تعالیٰ فرشتے نازل کرے گا۔ شیطان مقابلہ کرتا کرتا آخر کار تھک جائے گا۔ اس وقت وہ نبی اس پر فرشتوں کی مدد سے آخری حملہ کرے گا اور خطرناک جنگ ہوگی جس میں شیطان کو شکست ہوگی اور وہ پکڑا اور مارا جائے گا۔ اس کے بعد امن ہوجائے گا اور یہ دنیا بہت پھیل جائیگی اس لئے کہ کوئی آدمی مر نہیں سکے گا۔ کیونکہ شیطان جو مارنے سے تعلق رکھتا ہے خود مر گیا ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے یہ باتیں ایک نبی کی کہی ہوئی ہیں کیونکہ سچی نکلی ہیں

اور پوری ہو رہی ہیں۔ مسیو زر بھی (مسیح پاک) آیا اور اپنے نشانات کے ساتھ آیا جو بیان کئے گئے۔ . . . .

پھر فرشتے آسمان سے مانگنے والی بات بھی درست نکلی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعودؑ کا ایک کشف ہے کہ آپ نے خدا سے ایک لاکھ فرشتے مانگے ہیں اور خدا تعالٰے نے فرمایا ہے کہ پانچ ہزار کافی ہیں۔ ایک لاکھ زیادہ ہیں۔ چونکہ قرآن کریم میں زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار فرشتوں کا ذکر آیا ہے اس لئے اتنے ہی دیئے گئے ان سے زیادہ نہ دیئے گئے غرض یہ بات بھی سچی نکلی۔" [۱]

اس کے بعد آپ نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے ملائکہ یعنی فرشتوں کی حقیقت بیان فرمائی اور قرآن و احادیث سے استنباط کرتے ہوئے حقیقتِ ملائکہ پر چودہ نکات بیان کئے۔ چودھواں نکتہ بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"چودھویں بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملائکہ مختلف صفاتِ الٰہیہ کے مظہر ہوتے ہیں۔ بعض کسی ایک طاقت کے اور بعض ایک سے زیادہ طاقتوں کے مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالٰے فرماتا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (۳۵-۲)

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور جو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتا ہے جن میں سے بعض دو بعض تین اور بعض چار صفات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور اللہ ان سے زیادتی بھی کرتا ہے جتنی چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مختلف فرشتے مختلف صفات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور کوئی تھوڑی صفات کے اور کوئی زیادہ صفات کے۔ اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانہ کے لئے جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی ہی استعداد کے فرشتے بھیجے جاتے ہیں ان فرشتوں کو لوگوں کے

---

[۱] (ملائکۃ اللہ صفحہ ۱۲ تا ۱۴)

پاس بھیجا جاتا رہا جن میں ان لوگوں کے مطابق استعداد ہوتی تھی۔ اور جب دنیا پورے درجہ تک پہنچ گئی تو اس وقت خدا تعالےٰ نے جبرائیل کو اپنی کامل صورت میں بھیجا۔ جس کے متعلق رسول کریمؐ فرماتے ہیں کہ اس کے چھ سَو پَر ہیں۔ جو کامل کتاب لے کر آیا۔ اس سے معلوم ہؤا کہ جبرائیل خدا کی چھ سَو صفات کے مظہر ہیں۔ یہ کہنا غلطی ہے کہ خدا کی صفات تو تھوڑی ہیں پھر یہ چھ سَو صفات کے کیونکر مظہر ہوئے؟ خدا تعالےٰ کی بے شمار صفات ہیں اور چھ سَو تو صرف وہ ہیں جو انسان کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہیں۔

حضرت مسیح موعودؑ نے ایک نہایت لطیف بات لکھی ہے جو یہ ہے۔ کہ قرآن کریم کا علم رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جبرائیل سے زیادہ تھا اور یہ بالکل درست بات ہے۔ وجہ یہ کہ اور ملائکہ بھی آپ کی تائید میں تھے۔ اور وہ خدا تعالیٰ کی دوسری صفات کے فرشتے تھے۔

تو معلوم ہؤا کہ ملائکہ مختلف صفات کے مظہر ہوتے ہیں اور اَجْنِحَۃ کے معنے پَر نہیں بلکہ صفات کے ہیں جو ان میں پائی جاتی ہیں۔" [۱]

حقیقتِ ملائکہ بیان کرنے کے بعد آپ نے ان کے سترہ ایسے کام بیان فرمائے جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک کام کا ذکر کرتے ہُوئے آپ نے فرمایا:۔

"ایک کام ان کا یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر مَلَک جو انسان کے ساتھ ہوتا ہے وہ نبی اور اس کی جماعت کا رُعب انسان کے دل پر ڈالتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ؕ (۳-۱۲۵)

کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ تین ہزار ملائکہ تمہاری مدد کو آجائیں۔ تین ہزار ملائکہ کیوں فرمایا؟ اس لئے کہ اس موقع پر دشمن کی فوج اتنی ہی تھی، اس سے معلوم ہؤا کہ یہ اعلیٰ درجے کے فرشتے نہیں تھے بلکہ وہ تھے جو ہر انسان کے ساتھ لگا ہؤا ہے۔ کیونکہ فرمایا کیا یہ کافی نہیں ہے؟ کہ ہم تین ہزار ملائکہ سے تمہاری مدد کریں۔ یعنی جب تم دشمن کے مقابلہ پر

---

[۱] ملائکۃ اللہ صفحہ ۲۹-۳۰

جاؤ تو وہ تمہارا رعب ہر ایک کے دل میں ڈالنا شروع کر دیں۔ چنانچہ آگے فرماتا ہے :۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ۔ (۳-۱۵۲)

کافروں کے دلوں میں رُعب ڈال دیا گیا۔ پس ہر انسان کے ساتھ جو مَلک ہوتا ہے وہ نبی اور اس کی جماعت کا رعب ڈالتا رہتا ہے۔ رعب کی مثال اس زمانہ میں بھی ملتی ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے اپنے مخالفین کو بُلایا کہ مباہلہ کر لو مگر کوئی سامنے کھڑا نہ ہو سکا۔ وجہ یہ کہ جب وہ سامنے کھڑے ہونے کا خیال کرتے تو فرشتہ ان کے دل میں رُعب ڈال دیتا کہ مارے جاؤ گے۔ اس لئے وہ ہٹ جاتے۔

جن دنوں مَیں شملہ گیا وہاں مجھے ایک آریہ ملنے کے لئے آیا۔ ویدوں کے متعلق گفتگو ہوئی۔ مَیں نے کہا کہ اگر تمھیں ویدوں کے سچّے ہونے کا یقین ہے تو قسم کھاؤ۔ کہنے لگا ہاں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ مَیں نے کہا اس طرح قسم کھاؤ۔ اگر یہ سچّے نہ ہوں تو میری بیوی بچّوں پر عذاب آجائے۔ کہنے لگا یہ تو نہیں ہو سکتا۔ یہ کہتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔ مَیں نے کہا مَیں قرآن کے متعلق اسی طرح قسم کھانے کو تیار ہوں۔ کہنے لگا یہ تو بڑی جرأت ہے مَیں نے کہا کہ جب مجھے یقین ہے کہ قرآن سچّا ہے اور خدا کا کلام ہے تو جرأت کیوں نہ ہو"[۱]

اسی طرح فرشتوں کا ایک کام ترویج و اشاعتِ علوم بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :۔

"سولھواں کام ملائکہ کا یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو علم سکھاتے اور تعلیم دیتے ہیں یعنی ان کو مقرر کیا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو علم کی طرف توجّہ کرنے والے ہوں ان کے قلوب پر علم کی روشنی ڈالتے رہو۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جبرائیل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس متمثّل ہو کر آئے اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے ؟ دین کیا ہے ؟ اور رسُول کریمؐ جواب دیتے رہے۔ جب چلے گئے تو رسُولِ کریمؐ نے صحابہؓ کو فرمایا۔ جانتے ہو یہ کون تھا ؟ انھوں نے کہا یا رسُول اللہ ہم تو نہیں جانتے۔ آپ ہی

---

[۱] ملائکۃ اللہ صفحہ ۳۲-۳۳

بتائیے۔ آپؐ نے فرمایا یہ جبرائیل تھا جو تمھیں دین سکھانے کے لئے آیا تھا۔
تو ملائکہ کا یہ بھی کام ہوتا ہے کہ علوم سکھاتے ہیں مگر دینی علوم ہی نہیں دنیا کے معاملات کے متعلق علوم بھی سکھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کافروں کو بھی سکھاتے ہیں۔ مَیں نے ایڈیسن کی ایک کتاب پڑھی ہے وہ لکھتا ہے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جو مَیں نے ایجاد کر کے نکالی ہو۔ ایک دم میرے دل میں آ کر ایک بات پڑتی اور مَیں اس کو عمل میں لے آتا۔ اس کو چونکہ ایسے علوم کا شوق تھا اس لئے اسے اسی قسم کی باتیں سکھائی گئیں نبیوں اور ولیوں میں چونکہ دینی علوم کا شوق ہوتا ہے اس لئے انہیں دینی علوم سکھاتے ہیں۔

فرشتوں کے علوم سکھانے کا بھی عجیب طریق ہے۔ وہ جو بات سکھاتے ہیں اسے OBJECTIVE MIND (قلب عامل) میں نہیں رکھتے بلکہ SUB CONSCIOUS MIND (قلب غیر عامل) میں رکھتے ہیں۔ یعنی دماغ کے پچھلے حصہ میں رکھتے ہیں تاکہ سوچ کر انسان اسے نکال سکے۔ اس میں ظاہری دماغ سے حفاظت کی زیادہ طاقت ہوتی ہے اور یہ ذخیرہ کے طور پر ہوتا ہے۔ ملائکہ جو کچھ سکھاتے ہیں اسی حصۂ دماغ میں ڈالتے ہیں۔ الّا ماشاء اللہ۔ دماغ کے تین حصے ہوتے۔ ایک وہ حصہ جس کے ذریعہ ہم چیزوں کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ دوسرا وہ حصہ جو ذخیرہ کے طور پر ہوتا ہے اور تیسرا وہ حصہ جس میں ذخیرہ تو ہوتا ہے مگر یاد کرنے سے بھی اس میں جو کچھ ہو یاد نہیں آتا بلکہ بحث کر دینے سے وہ بات سامنے آتی ہے۔ ملائکہ کبھی اس تیسرے حصے میں بھی علوم داخل کر جاتے ہیں۔ جب ان کی ضرورت ہو اس وقت ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ وہ علوم سامنے آجاتے ہیں۔ یوں یاد کرنے سے نہیں آتے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ میری کوئی ۱۷۔ ۱۸ سال کی عمر ہوگی حضرت مسیح موعودؑ کا زمانہ تھا اس وقت مَیں نے رسالہ تشحیذ نکالا تھا۔ خواب میں مَیں نے دیکھا کہ ایک فرشتہ آیا ہے جو مجھے کہتا ہے کیا تمھیں کچھ سکھائیں؟ مَیں نے کہا سکھاؤ۔ اُس نے کہا۔

سُورۂ فاتحہ کی تفسیر سکھائیں۔ مَیں نے کہا ہاں سکھایئے۔ اس رؤیاء کا بھی عجیب نظارہ تھا۔ یہ شروع اس طرح ہوئی کہ پہلے مجھے ٹن کی آواز آئی اور پھر وہ پھیلنے لگی۔ اور پھیل کر میدان بن گئی۔ اس میں سے مجھے ایک شکل نظر آنے لگی جو ہوتے ہوتے صاف ہوگئی اور مَیں نے دیکھا کہ فرشتہ ہے۔ اس نے مجھے کہا تمھیں علم سکھاؤں۔ مَیں نے کہا سکھاؤ اس نے کہا لو سُورۂ فاتحہ کی تفسیر سیکھو۔ اِس پر اُس نے سکھانی شروع کی۔ اور اِیَّاکَ نَعۡبُدُ پر پہنچ کر کہا سب نے اسی حد تک تفسیریں لکھی ہیں۔ اِسے ہیں لکھیں۔ مَیں بھی اُس وقت سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ پھر اس نے کہا مگر مَیں تمھیں اس سے آگے سکھاتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ساری سُورۂ فاتحہ کی تفسیر سکھائی۔ اور میری آنکھ کھُل گئی۔ اس وقت مجھے اس کی ایک دو باتیں یاد تھیں۔ جن کی نسبت اتنا یاد ہے کہ نہایت لطیف تھیں۔ مگر دوبارہ سونے کے بعد جب مَیں اُٹھا تو وہ بھی بھُول گیا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ کو جب مَیں نے یہ رؤیاء سُنائی تو آپ بہت ناراض ہوئے کہ کیوں اسی وقت لکھ نہ لی؟ جو کچھ سکھایا گیا تھا اُسے اسی وقت لکھ لینا چاہیئے تھا۔

اس دن کے بعد آج تک مَیں سُورۂ فاتحہ پر کبھی نہیں بولا کہ مجھے اس کے نئے نئے نکات نہ سمجھائے گئے ہوں مَیں سمجھتا ہوں یہ اسی علم کی وجہ سے ہے جو مجھے سکھایا گیا۔

ایک دفعہ مجھے اس علم کا خاص طور پر تجربہ ہوُا۔ ہمارے سکول کی ٹیم امرتسر کھیلنے کے لئے گئی۔ مَیں اس وقت اگرچہ سکول سے نکل آیا تھا لیکن مدرسہ سے تعلق تھا کیونکہ مَیں نیا نیا نکلا تھا اس لئے مَیں بھی ساتھ گیا۔ وہاں ہمارے لڑکے جیت گئے۔ اس کے بعد وہاں مسلمانوں نے ایک جلسہ کیا۔ اور مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا۔ جب ہم اس جلسہ میں گئے تو راستہ میں مَیں ساتھیوں کو سُناتا جارہا تھا کہ خدا تعالیٰ کا میرے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ جب بھی مَیں سُورۂ فاتحہ پر تقریر کروں گا نئے نکات

سمجھائے جائیں گے۔ جلسہ میں پہنچ کر جب میں تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہؤا تو کوئی آیت سوائے سورۃ فاتحہ کے میری زبان پر ہی نہ آئے۔ آخر مَیں نے خیال کیا کہ میرا امتحان ہونے لگا ہے اور مجھے مجبورًا سورۃ فاتحہ پڑھنی پڑی۔ اس کے متعلق کوئی بات میرے ذہن میں نہ تھی مَیں نے یونہی پڑھی۔ لیکن پڑھنے کے بعد فورًا میرے دل میں ایک نیا نکتہ ڈالا گیا۔ اور وہ یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب سورۃ فاتحہ اُتری ہے اس وقت آپ کے مخاطب کفّار تھے۔ یہودی اور عیسائی نہ تھے۔ مگر دُعا اس میں یہ سکھائی گئی ہے کہ ہمیں یہودی اور عیسائی بننے سے بچا کہ ہم ان کی طرح نہ بنیں۔ حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ جو سامنے تھے ان کے متعلق دعا سکھائی جاتی۔ کہ ہم ان کی طرح نہ بنیں۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ مشرکین نے چونکہ تباہ و برباد ہو جانا تھا اور بالکل مٹائے جانا تھا اس لئے ان کے متعلق دُعا کی ضرورت نہ تھی لیکن عیسائیوں اور یہودیوں نے چونکہ قیامت تک رہنا تھا اس لئے ان کے متعلق دعا سکھائی گئی۔

یہ نکتہ معًا مجھے سمجھایا گیا۔ اور مَیں نے خدا تعالےٰ کا شکریہ ادا کیا کہ اس موقعہ پر اس نے میری آبرو رکھ لی۔"

پس ملائکہ کے ذریعے علوم سکھائے جاتے ہیں محی الدین ابن عربی فتوحات مکیہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے بہت سے علوم ملائکہ نے سکھائے ہیں"۔[1]

اس کے بعد فرشتوں کے وجود کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنا ذاتی تجربہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

"مجھے ذاتی طور پر اس بات کا تجربہ ہے کہ ہر چیز پر ملائکہ کا قبضہ ہے اور ان کے ارادے کے تحت وہ چیز کام کرتی ہے۔ ایک دفعہ مجھے بخار ہؤا۔ ڈاکٹر نے دوائیں دیں مگر کوئی فائدہ نہ ہؤا۔ ایک دن چوھدری ظفر اللہ خاں صاحب آئے ان کے ساتھ ایک غیر احمدی بھی تھے۔ اُن کو مَیں نے اپنے پاس بُلا لیا۔ اُن کے آنے سے پہلے مجھے غنودگی آئی اور ایک مچھر میرے سامنے آیا اور کہا آج تپ ٹوٹ جائے گا جب ڈاکٹر صاحب

---

[1] ملائکۃ اللہ صفحہ ۴۳ تا ۴۴

اور چوہدری صاحب اور ان کا غیر احمدی دوست اور بعض اور احباب
آئے تو میں نے ان کو وہ کشف بتا دیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد جب ڈاکٹر
صاحب نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا تو اس وقت تپ نہیں تھا۔

دراصل وہ مچھر نہیں بولا تھا بلکہ اس کی طرف سے وہ فرشتہ بولا
تھا جس کا مچھر پر قبضہ تھا۔ تو ہر ایک چیز جو انتظام اور ارادہ کے ماتحت
کام کر رہی ہے۔ ملائکہ کی ہستی کا ثبوت ہے"۔[1]

ملائکہ کی ضرورت اور ان کے وجود پر مختلف اعتراضات بیان کرکے ان کے جوابات دیئے۔
ایمان بالملائکہ کی حکمتیں بیان فرمائیں اور قرآن کریم سے استنباط کرتے ہوئے فرشتوں کے اقرار کرنے
اور شیطان کے انکار کرنے کا صحیح مفہوم ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

"خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲-۲۵۷)

جو شخص طاغوت کا انکار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ ایسے مضبوط
کڑے کو پکڑ لیتا ہے کہ جو ٹوٹتا ہی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

طاغوت شیطان کو کہتے ہیں۔ اب اگر انکار کے معنے کسی شئے کی ذات
کے انکار ہی کئے جاویں تو اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ ہلاکت سے وہی
شخص بچتا ہے جو شیطان کے وجود کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ کے وجود
کا اقرار۔ حالانکہ یہ معنے سراسر غلط ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم صاف صاف
طور پر خدا تعالیٰ کے وجود کا بھی اقرار کرتا ہے اور شیطان کے وجود کا بھی
اقرار کرتا ہے۔ پس اقرار سے اور ایمان سے اس آیت میں یہی مراد ہے
کہ شیطان کی باتوں کو رد کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو مانتا ہے
اب اگر یہی معنے ایمان کے ملائکہ کے متعلق کئے جائیں تو ان پر ایمان لانے
کا یہ مطلب ہوگا کہ ان کی تحریکات کو مانا کرو۔ اسی طرح کتابوں اور رسولوں
پر ایمان لانے کے یہ معنے ہوں گے کہ جو احکامِ الٰہی کتابوں میں ہوں
ان کو مانو۔ جو کچھ رسول تم کو حکم دیں ان کو مانو اور قیامت پر ایمان

---

[1] ملائکۃ اللہ صفحہ ۴۷

لانے کے یہ معنے ہوئے کہ اس کا خیال کرکے بُری باتوں سے بچو"۔[1]

اس کے بعد آپ نے ملائکہ کے تعلقات اور ان کی اقسام پر روشنی ڈالی اور وقت زیادہ ہو جانے کے باعث تقریر کو دوسرے روز یعنی ۲۹ دسمبر پر ملتوی فرما دیا۔ دوسرے روز متفرق اعتراضات کے جوابات دینے کے بعد لمہ ملکی کی کچھ حقیقت بیان کرکے یہ وضاحت کی کہ اسلامی اصطلاح میں شیطان سے کیا مراد ہے۔ اس کے بعد کسی قدر تفصیل سے لمہ ملکی کی وضاحت کی اور اس کے مقابل پر شیطان صفت انسان کی مختلف قلبی حالتوں کا ذکر بھی فرمایا اور ان دونوں کے درمیان موازنہ کیا۔

تقریر کے اختتام پر آپ نے دس ایسے طریق بیان فرمائے جن کو اختیار کرنے سے قرآن اور حدیث کے ارشاد کے مطابق انسان فرشتوں سے زندہ تعلق قائم کرکے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ آخری طریق آپ نے یہ بیان فرمایا:۔

"دسواں طریق ملائکہ سے فیض حاصل کرنے کا یہ ہے کہ خلیفہ کے ساتھ تعلق ہو۔ یہ بھی قرآن سے ثابت ہے جیسا کہ آتا ہے:۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ (۲-۲۴۹)

کہ ایک زمانہ میں ایک نبی سے لوگوں نے کہا کہ ہمارے لئے اپنا ایسا جانشین مقرر کر دیجئے جس سے ہم دنیوی معاملات میں مدد حاصل کریں لیکن جب ان کے لئے ایک شخص کو جانشین مقرر کیا گیا تو انہوں نے کہہ دیا اس میں وہ کونسی بات ہے جو ہمارے اندر نہیں ہے۔ جیسا کہ اب پیغامی کہتے ہیں نبی نے کہا آؤ بتائیں اس میں کونسی بات ہے جو تم میں نہیں اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس سے تعلق رکھیں گے ان کو فرشتے تسکین دیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خلافت کے ساتھ وابستگی بھی ملائکہ سے تعلق پیدا کراتی ہے کیونکہ بتایا گیا ہے کہ ان کے دل فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ تابوت کے معنے دل اور سینہ کے ہیں۔ فرمایا۔ خلافت سے تعلق رکھنے والوں کی یہ علامت ہو گی کہ ان کو تسلی حاصل ہو گی اور پہلے صلحاء اور انبیاء کے علم ان پر ملائکہ نازل کریں گے۔ پس ملائکہ کا نزول خلافت سے وابستگی

---

[1] ملائکۃ اللہ صفحہ ۶

پر بھی ہوتا ہے۔"

(ملائکۃ اللہ ص۱۰۹)

اس دور کی یہ چند تقاریر ہیں۔ جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے فی الحال ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ آئندہ انشاء اللہ بعض دوسری اہم تقاریر کا اپنے اپنے موقع پر تذکرہ کیا جائے گا۔

مِلّتِ اِسْلامیہ کی سیاسی خِدمات

مقاصد اور لائحہ عمل

حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دوسری غیر معمولی استعدادوں کے علاوہ حیرت انگیز سیاسی بصیرت بھی عطا فرمائی تھی۔ بلا شبہ اس قابلیّت کا انسان اگر سیاسی دُنیا سے متعلق ہوتا تو لوحِ سیاست پر ایک عظیم سیاسی مدبّر کے طور پر اپنا دائمی نقش ثبت کر جاتا لیکن آپ کی حیثیت اوّل و آخر دینی تھی اور دینی ہی رہی اور سیاست میں آپ کی دلچسپی ہمیشہ دین کے تابع ایک ثانوی حیثیت میں رہی۔

پیشتر اس کے کہ اس مضمون کو آگے بڑھایا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سیاسی نظریات، لائحہ عمل اور طرزِ فکر پر کچھ روشنی ڈال دی جائے تاکہ اس پہلو سے آپ کی شخصیت کو سمجھنے میں کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ نے سیاست میں بھی حصّہ لیا اور بنی نوع انسان اور ملک و ملّت کی بعض نہایت اہم خدمات سرانجام دیں تو ہماری مراد ایسی سرگرمیاں نہیں جنہیں عُرفِ عام میں سیاسی دلچسپیوں کا نام دیا جاتا ہے بلکہ آپ کی دلچسپی ایک ایسے باضابطہ اور با اصول طریقِ کار کے تابع تھی جس کی نوعیّت عملاً سیاسی دلچسپیوں سے اتنی مختلف تھی کہ ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم اس امر کا تفصیلی جائزہ لیں کہ آپ کی سیاسی دلچسپیوں سے فی الحقیقت کیا مراد ہے اور کون سے رہنما اصول ان دلچسپیوں کی حدود اور رُخ متعیّن کرتے رہے۔ اس جائزہ کے نتیجہ میں حسب ذیل امور نمایاں حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

اوّل۔ پہلا امر قابلِ ذکر یہ ہے کہ آپ سیاست میں محض اُس حد تک حصّہ لیتے تھے جس حد تک کہ ضروریاتِ دین کے لئے دلچسپی لینا ضروری ہو اور اس کا کلّیۃً دینی امور سے الگ کر دینا ممکن نہ ہو۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں خطبہ جمعہ کے دَوران اس امر کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"گذشتہ سالوں میں جب کانگرس کی تحریک زوروں پر تھی اس وقت مَیں نے

اپنی جماعت کے دوستوں سے کہا تھا کہ وہ اس کا مقابلہ کریں اور یہ مَیں نے اسی لئے کہا تھا کہ میرے نزدیک ملک کا امن نہایت ضروری چیز ہے اور فتنہ و فساد کو مٹانا مومنوں کا فرض ہے۔ اسی طرح جب مَیں نے بعض سیاسی معاملات میں دخل دینا شروع کیا تو اس لئے نہیں کہ وہ سیاسی تھے بلکہ اس لئے کہ مَیں اُنہیں دین کا جزو سمجھتا تھا۔ مَیں نے دیکھا جب میں نے سیاسیات میں حصّہ لینا شروع کیا تو جماعت کے کئی دوست بھی اس پر معترض ہوئے اور بعض دوسرے لوگ خیال کرتے تھے کہ مجھے سیاسیات سے واقفیت ہی کیا ہو سکتی ہے۔" ؎۱

اور پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:-

"مَیں سیاست سمجھتا ہوں اور یہ اس لئے کہ مَیں سیاست کو دینی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ چونکہ اسلام کے اصول نہایت پکے ہیں اس لئے جب مَیں اسلام کے اصول کے ماتحت کسی علم کو دیکھتا ہوں تو اس کا سمجھنا میرے لئے نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی علم ہو خواہ وہ فلسفہ ہو یا علم النفس ہو یا سیاست ہو مَیں اس پر جب بھی غور کروں گا ہمیشہ صحیح نتیجہ پر پہنچوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کا کوئی علم ایسا نہیں جس کے اصول کو مَیں نہ سمجھتا ہوں۔" ؎۲

دوم۔ آپ کے نزدیک دنیا ایک جامد چیز نہیں بلکہ ایک ایسی متحرک حقیقت ہے جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اپنی شکلیں بدلتی رہتی ہے۔ اس اصول کے تحت آپ یہ یقین رکھتے تھے کہ وقت کے تقاضوں کے دوش بدوش دین کے تقاضے بھی بدل سکتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ ایک وقت میں ایک چیز محض دنیا کے دائرے سے تعلق رکھتی ہو مگر دوسرے وقت میں وہی چیز دین کے دائرے میں داخل ہو جائے۔ اس باریک معرفت کے نکتے کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

"مَیں دیکھتا ہوں کہ ابھی ہمارے دوستوں کو اس امر سے واقفیت نہیں کہ دین و دُنیا کا میدان مخلوط ہے۔ ایک وقت میں ایک چیز جو ساری کی ساری دُنیا ہوتی ہے دوسرے وقت میں ساری کی ساری دین ہو جاتی ہے مگر پھر بھی کئی دوست ایسے ہیں جو اس لئے ان امور میں

؎۱ الفضل ۷ جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۵۔ ؎۲ الفضل ۷ جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۵

دلچسپی نہیں لیتے کہ وہ خیال کرتے ہیں یہ دنیوی کام ہیں ان کا دین
سے کوئی تعلق نہیں وہ اپنے آپ کو اور لوگوں سے کچھ کچھ بالا سمجھنے ہیں۔
ان کی مثال بالکل ان نمبرداروں کی سی ہوتی ہے جن کا ذکر حضرت خلیفہ
اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "۔ [1]

سوم۔ چونکہ آپ کے سیاسی اصول سراسر دین کے تابع تھے اس لئے امن کو قائم رکھنے والی قرآنی تعلیم کی روشنی میں آپ کی سیاست کا ایک یہ اصل تھا کہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیئے جس سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو اور امن و امان کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ پس آپ کی تمام کوششیں ہمیشہ اس راہنما اصل کے تابع رہیں۔

چہارم۔ آپ کی سیاست جھوٹ اور غلط بیانی سے کلّیۃً پاک تھی اور آپ ہرگز جائز نہیں سمجھتے تھے کہ سیاسی اغراض کی خاطر جھوٹ کو آلۂ کار بنایا جائے۔

پنجم۔ آپ اس اصول پر سختی سے کاربند تھے کہ جس مستحکم حکومت کے تحت کوئی شخص زندگی بسر کر رہا ہے اس کی پوری اطاعت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور عدم اطاعت کو کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لئے ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی طرح آپ سیاست میں قانون شکنی کے کسی رنگ میں بھی قائل نہ تھے۔

ششم۔ حقوق کے مطالبات کے وقت قرآن کریم کی یہ آیت آپ کے لئے مشعلِ راہ تھی کہ:۔

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔" (مائدہ آیت ۹)

کہ کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ لہٰذا آپ کے مطالبات اس حد تک عدل پر مبنی ہوتے کہ محض اپنے حقوق پر ہی بحث نہ فرماتے بلکہ دوسروں کے حقوق کا بھی ذکر کرتے اور اپنے جائز مطالبات کے ساتھ فریقِ ثانی کے جائز حقوق کو بھی تسلیم کرتے۔

ہفتم۔ آپ کے نزدیک گورنمنٹ کی اطاعت کے یہ معنے ہرگز نہیں تھے کہ حق بات کہنے سے گریز کیا جائے۔ یا خوشامد کا کوئی کلمہ زبان پر لایا جائے۔ آپ کا مسلک یہ تھا کسی قوم میں اگر کوئی قابلِ تعریف چیز نظر آئے تو خواہ کوئی دشمن ہی کیوں نہ ہو اس کی تعریف کی جائے اور اگر قابلِ تعریف بات نہ پائی جائے تو حاکمِ وقت ہی کیوں نہ ہو، اس کی غلط تعریف کسی قیمت پر نہ کی جائے بلکہ مشورے ہمیشہ سو فیصدی حق پر مبنی ہوں۔ اپنے اس موقف کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"مَیں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو گورنمنٹ کے خیر خواہ کہلاتے ہیں کہ وہ

---

[1] الفضل، ۲ جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۹

حد درجہ کے لالچی دنیا دار خود غرض اور قوم فروش ہیں اِلّا ماشاءاللہ
مَیں کسی قوم کے تمام افراد کو ایسا نہیں سمجھتا۔ اس کے مقابلے میں مَیں
کانگریس کے ایک طبقہ کو دیکھتا ہوں کہ اس میں ایثار، قربانی اور سچا
اخلاص پایا جاتا ہے۔ بے شک کانگریسیوں کے اصول سے مجھے اختلاف
ہے لیکن اگر میرے سامنے ذاتی دوستی کا سوال ہو تو مَیں ایک کانگریسی
کو گورنمنٹ کے خوشامدی پر ترجیح دوں گا۔ کیونکہ مَیں دیکھتا ہوں۔ کہ یہ
گورنمنٹ کے خیر خواہ کہلانے والے حد درجہ کے خود غرض لالچی اور نفس
پرست واقع ہوئے ہیں۔" [۱]

ہشتم۔ آپ اپنی جماعت کو سیاست میں بھی ہمیشہ اخلاق کے اس بلند مقام پر فائز دیکھنا چاہتے تھے کہ جو کام کیا جائے وہ بنی نوع انسان کی بہبود اور خدمت کے لئے کیا جائے اصولوں کی خاطر جدوجہد ہو ذاتی مقاصد تعریف و توصیف اور انعامات ہرگز پیشِ نظر نہ رہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

"یہی ہندوستانیوں میں نقص ہے کہ اول تو وہ کام نہیں کرتے اور جب
کرتے ہیں تو معاً خیال آجاتا ہے کہ ہمیں کچھ اس کے بدلے میں ملنا چاہئے
حالانکہ میرے نزدیک اگر ہم کوئی کام اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں اس کے
بدلہ میں کچھ ملے گا تو اس کام کے کرنے سے ڈوب مرنا بہتر ہے۔" [۲]

اس اصول پر اپنی جماعت کے کارکنان کا بڑی سختی سے جائزہ لیتے ہوئے آپ نے بڑے دُکھ سے اس امر کا اظہار کیا کہ:۔

"مجھے تعجب آتا ہے۔ ابھی تک ہماری جماعت میں یہ بلندی پیدا نہیں ہوئی
کئی لوگ ہیں جو لکھ دیتے ہیں فلاں موقع پر مَیں نے گورنمنٹ کا فلاں کام
کیا تھا۔ اب مجھے ضرورت ہے میرا فلاں کام کرا دیا جائے۔ مجھے اس وقت
یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے گویا میرے منہ پر چپیڑ مار دی۔ میں حیران
ہوتا ہوں کہ سوائے کسی ذاتی فائدہ کی تمنا کے ہم کیوں کام نہیں کر سکتے۔" [۳]

نہم۔ آپ کے طریقِ کار میں جبر کو دخل نہیں تھا بلکہ آپ محض اخلاقی ہتھیاروں سے ہی کام لیتے تھے چنانچہ خلافِ آئین تحریکوں کے مقابلہ میں بھی آپ نے کبھی خلافِ آئین ذرائع کو اختیار کرنے کی

---

[۱] الفضل، ۷ جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۹۔ [۲] الفضل، ۷ جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۰۔ [۳] الفضل، ۷ جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۰

اجازت نہیں دی۔ اس بارہ میں آپ نے فرمایا:۔

"ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم پیار محبت اور استقلال کے ساتھ ان خلاف آئین تحریکوں کا مقابلہ کریں۔ میں اپنی جماعت کے تمام افراد کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ جہاں کہیں ہوں انارکسٹوں کی تحریک کی نگرانی رکھیں اور یہ کبھی خیال نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں گورنمنٹ سے انہیں کیا ملے گا۔ میں تو جب کسی کے مُنہ سے ایسی بات سنتا ہوں مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میری کمر ٹوٹ گئی دراصل یہ ہمارا اپنا کام ہے۔ گورنمنٹ نے ملک سے فتنہ و فساد کو روکنے کی ذمہ واری خود اپنے اوپر لی ہے اور ہم پر فتنہ و فساد کے روکنے کی ذمہ واری اللہ تعالےٰ نے ڈالی ہے۔" [1]

دھم۔ قیامِ امن کے سلسلہ میں حکومتِ وقت کا ہاتھ بٹانے کا اصول کسی مخصوص حکومت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک قاعدہ کُلّیہ تھا اور ہر احمدی کو خواہ وہ دُنیا کے کسی بھی خطہ میں بستا ہو اور کسی بھی حکومت میں زندگی بسر کرتا ہو، یہی تعلیم تھی اور آج بھی یہی تعلیم ہے اور کل بھی یہی تعلیم رہے گی کیونکہ جماعت کا یہ موقف غیر مبدل قرآنی تعلیم کے تابع ہے جو وقتی مصالح سے تبدیل نہیں ہوسکتی۔ آپ کو قرآن کریم کے اصولوں کے درست ہونے اور ان پر عمل کے نتیجہ میں صحیح نتائج مترتب ہونے پر ایسا کامل یقین تھا کہ بعض اوقات بظاہر غیر متوقع نتائج ظاہر ہونے کے باوجود آپ کے اس یقین میں تزلزل واقع نہیں ہوتا تھا۔ اور بالآخر وہی بات درست ثابت ہوتی جس کی توقع قرآنِ حکیم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں کی جاسکتی تھی۔ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے ایک مثال دے کر فرمایا:۔

"مَیں نے سیاسی امور میں جب بھی دخل دیا ہے قرآن مجید کے ماتحت دیا ہے اس لئے مجھے کبھی بھی اپنی رائے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی بسا اوقات ایسا تاریک وقت آیا کہ لوگوں نے کہا اب نہایت نازک گھڑی ہے اور بسا اوقات مجھے دوستوں نے کہا کہ اب آپ کو اپنی رائے بدل لینی چاہیئے مگر معًا خدا تعالےٰ ایسے سامان پیدا کرتا رہا کہ مجھے اپنی رائے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے مَیں نے خطبہ جمعہ میں ذکر کیا تھا کہ مجھے کشمیر کے معاملات میں اللہ تعالیٰ کا

---

[1] الفضل ۷ر جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۲

ہاتھ کام کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ جب میں نے یہ خطبہ پڑھا تو اس کے تیسرے ہی دن کشمیر میں خطرناک فساد برپا ہوگیا اور یوں معلوم ہوتا تھا، گویا ہماری تمام تدبیروں کا خاتمہ ہو رہا ہے اور جتنا کام اب تک کیا گیا وہ سب خراب ہو جائے گا لیکن میں سمجھتا تھا اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کام کر رہا ہے چنانچہ ایک مہینہ تک سخت تاریک حالات رہنے کے بعد معاً حالات بدل گئے اور یوں حالت ہوگئی کہ گویا فساد ہؤا ہی نہیں تھا کشمیر میں جس وقت حالات خراب ہوئے میں نے اسی وقت دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے میرے لئے بھی اور دوستوں کے لئے بھی۔ میرے لئے ان معنوں میں کہ آیا میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں یا نہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے اور دوستوں کے لئے اس لحاظ سے کہ ان کی ایمانی کیفیت کا اظہار ہو جائے"[1]

یہ چند اصول ہمیشہ آپ کی سیاست میں مشعلِ راہ بنے رہے۔ ان پر نظر ڈالنے سے سیاست کے مضمون کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ دنیوی اصطلاح میں جسے سیاست کہا جاتا ہے اس کا اس سیاست سے دُور کا بھی واسطہ نہیں جسے ہم احمدی اصطلاح میں سیاست کہتے ہیں۔ دنیا کے سیاستدان اگر ان اصولوں کو اپنا کر کوئی جدوجہد کرنا چاہیں تو قدم قدم پر اُن کی راہ میں روکیں کھڑی ہو جائیں گی اور وہ دنوں کا فاصلہ سالوں میں بھی طے نہ کر سکیں گے۔ مگر یہ عجیب بات ہے اور آئندہ پیش کئے جانے والے واقعات اس بات کی گواہی دیں گے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اسی سیاست کو اپنا کر دُنیا کے سامنے بظاہر انہونی بات ہونی ثابت کر دکھائی کہ اگر خلوص اور حکمت اور مستقل مزاجی کے ساتھ قرآنی تعلیم کے مطابق سیاست پر عمل کیا جائے تو کم سے کم نقصان اُٹھا کر زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں اور سالوں کا فاصلہ دنوں میں طے ہو سکتا ہے۔ جب بھی آپ کو سیاسی میدان میں قدم رکھنا پڑا وہ ہمیشہ وسیع مذہبی اور ملّی تقاضوں کی بناء پر تھا اور بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلام کی سربلندی کے لئے ناگزیر تھا۔ آپ کا سیاسی لائحہ عمل قرآنی اخلاقی تعلیم کے تابع تھا۔ جس میں جھوٹ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ جس میں وقتی تقاضے دُور رس مصالح پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔

آپ کے سیاسی لائحہ عمل میں عوامی جذبات کے استحصال کی بجائے فیصلہ کن امور یہ ہُوا کرتے

---

[1] الفضل ۷ رجولائی ۱۹۳۲ء صہ ۹

کہ حق کا تقاضا کیا ہے اور خود عوام کی بہبود کس چیز میں ہے۔ ہنگامہ آرائی اور عوامی جذبات کے ساتھ کھیلنے سے یہ سیاست بہت بلند تھی۔ آپ اس قرآنی تعلیم پر سچا اور کامل ایمان رکھتے تھے کہ اقتدارِ اعلیٰ بھی خدا کو حاصل ہے۔ طاقت کا سرچشمہ بھی وہی ہے۔ اصولی رہنمائی بھی اسی کی ہے اور اصولوں کی چار دیواری میں شخصی آزادی بھی اسی نے بخشی ہے۔

اس پابندِ اصول سیاست سے آپ نے کسی وقت اجتناب نہیں کیا بلکہ اس کے تقاضوں کو بے دھڑک اور برملا پورا کیا اور جب بھی عالمِ اسلام نے زبانِ حال سے آپ کو پکارا۔ آپ ان کی مدد کے لئے دوڑے۔ آپ کے تمام سیاسی مشورے قرآنی تعلیم پر مبنی تھے۔ آپ کے تمام سیاسی اندازے اور پیشگوئیاں یا تو قرآن سے مستنبط تھیں یا حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی پیشگوئیوں اور رؤیاء وکشوف کے نتیجہ میں کی گئی تھیں۔ قوم پرستی کو آپ کی سیاست میں دخل نہ تھا البتہ حبّ الوطنی کے تقاضوں کو آپ ایک دینی تقاضے کے طور پر جزوِ ایمان سمجھتے تھے آپ کی سیاسی ترجیحات کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ قرآن اور سنّت کو اوّلیت حاصل تھی اور اگر کوئی ملّی مفاد قرآن اور سنّت کو چھوڑ کر حاصل ہوتا ہو تو آپ اس کو شائستۂ التفات نہ سمجھتے تھے۔ اس کے بعد شعائراللہ کی عظمت اور اس کی حفاظت کا احساس تھا، جن کے مقابل پر دوسرے ملّی اور قومی تقاضے آپ کو ادنیٰ اور بے حیثیت نظر آتے تھے۔ اس کے بعد ملّتِ اسلامیہ کا مفاد آپ کو عزیز تر تھا اور بعد ازاں حبّ الوطنی کا درجہ آتا تھا۔ آپ کی سیاست کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ آپ سیاست میں بھی دعاؤں کے اثر کے قائل اور ان سے استفادہ کرنے کے عادی تھے۔ آپ دعا کو بڑے محکم یقین کے ساتھ ایک سیاسی تدبیر کے طور پر استعمال کرتے اور جماعت کو بھی اس کی نصیحت کرتے۔ یہی آپ کی سیاسی شخصیت کا لُبِّ لُباب ہے۔ اس شخصیت سے جب آپ تحریکِ ترکِ موالات کے دوران متعارف ہونگے یا ملکانہ کے کارزار میں اسے مصروفِ عمل دیکھیں گے۔ یا "نہرو رپورٹ پر تبصرہ" کرتے ہوئے پائیں گے یا کشمیر کے مرغزاروں میں مظلوم مسلمانوں کے جہادِ آزادی کا پھریرا بلند کرتے ہوئے دیکھیں گے، تو ہر جگہ آپ کو وہی ایک اندازِ سیاست نظر آئے گا۔ جو ایک عجیب دلرُبا شانِ ایمانی اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی انداز میں آپ نے حصولِ پاکستان کی عظیم جدوجہد میں دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ حصہ لیا۔ اور قربانی کے ہر تقاضے کو دوسروں سے بڑھ کر پورا کیا۔ پھر مسئلہ فلسطین پر بروقت ملّتِ اسلامیہ کو پیش آئند خطرات سے متنبّہ کرکے اتحادِ عمل کی دعوت دی۔

اسی طرح پاکستان کے عالمِ وجود میں آنے پر آپ نے ایسے مسائل کی نشاندہی کی اور مؤثر حل

تجویز کئے کہ ابھی جن کے وجود کا خمیر بھی نہ اُٹھا تھا اور عام اہلِ بصیرت کی نظروں سے اوجھل تھے آپ کا فیض اگرچہ مسلمانوں کے لئے بطورِ خاص تھا مگر انسانی ہمدردی سے مجبور ہو کر آپ نے ایسے مسائل پر جو عام انسانی بہبود سے تعلق رکھتے ہوں بسا اوقات بڑی بڑی سلطنتوں مثلاً امریکہ۔ رُوس برطانیہ عظمیٰ اور جاپان کو بھی قیمتی مشوروں سے نوازا۔ یہ امور اگرچہ بظاہر سیاسی نوعیّت کے تھے لیکن بنظرِ غائر دیکھیں تو ہر اس موقع پر آپ کو ایک عظیم سیاسی مفکّر کے پردے میں ایک مخلص اسلامی دل دھڑکتا ہؤا نظر آئے گا جس کے محرکات بھی دینی تھے جس کا لائحہ عمل بھی دینی تھا جس کا مقصدِ اوّل بھی دینی تھا اور مقصدِ آخر بھی دینی تھا جس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک سکون جس کا اُٹھنا بیٹھنا۔ بولنا اور چُپ رہنا اور گہرے فکر میں مستغرق ہو کر انسانی مستقبل میں دُور تک گہری اور تیز نگاہیں ڈال کر آئندہ کے حالات کا جائزہ لینا سب سراسر دینی رنگ میں رنگین تھا۔

سیاسی موضوع پر آپ نے جو کتب اور رسائل لکھے اور تقریریں فرمائیں یا سیاسی راہنماؤں کو جو نہایت قیمتی مشوروں پر مشتمل پیغام بھیجے، وہ سب اتنی وسعت اپنے اندر رکھتے ہیں کہ ایک مستقل ضخیم کتاب کے متقاضی ہیں۔ بہرحال محدود جگہ اور وقت کے پیشِ نظر کہیں اختصار اور کہیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم آپ کی بعض ایسی ملی اور انسانی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جو عرفِ عام میں سیاست کے دائرے سے تعلق رکھتی ہیں۔

مسٹر مانٹیگو کی ہندوستان میں آمد

— اور —

بعض اہم سیاسی مشورے

سب سے پہلے مسلمانانِ ہند کی سیاسی بہبود میں آپ کی دلچسپی کا سُراغ ۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹیگو وزیرِ ہند کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر ملتا ہے۔ برطانوی حکومت اگرچہ اصولاً ہندوستان کی آزادی کا حق تسلیم کر چکی تھی لیکن عملاً آزادی کی صورت میں پیدا ہونے والے متعدّد مسائل حل طلب تھے اور مُلک کو تدریجاً آزادی کی طرف لے جانے اور حکومت میں حصّہ دے کر حکومت کے اہل بنانے کے سلسلہ میں متعدد تجاویز زیرِ غور تھیں اسی ضمن میں وزیرِ ہند خود دہلی تشریف لا رہے تھے تاکہ مختلف سیاسی گروہوں کے نمائندوں سے ملاقاتیں کر کے ذاتی طور پر صورتِ حال کا جائزہ لے سکیں۔ بلاشُبہ ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم کے لئے یہ ایک بہت ہی اہم موقع تھا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ کیونکہ صرف انگریز سے ہی ایسے حقوق لینے کا سوال نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی ہندو اکثریّت کی محکومی سے بچنے کا بھی سوال درپیش تھا۔ پس موقع کی اہمیّت کے پیشِ نظر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے بنفسِ نفیس دہلی تشریف لے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ خود وزیرِ ہند سے ملاقات کر کے مسلمانوں کے موقف کو بطریقِ احسن پیش کر سکیں علاوہ ازیں جماعت کے نمائندگان پر مشتمل ایک باقاعدہ وفد بھی تیار کیا جو اسلامیانِ ہند کے مسائل اور ان کے بہترین حل کے بارہ میں جماعتی نقطۂ نگاہ پیش کرے۔ حضور نے مکرم محترم چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کو اس وفد کا قائد مقرر فرمایا جنھوں نے لارڈ مانٹیگو کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا۔ جو خود حضرت خلیفۃ المسیحؑ نے تیار کیا تھا۔ بعد ازاں جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے مسٹر مانٹیگو سے ملاقات کی تو محترم چوہدری صاحب ہی نے ترجمانی کے فرائض بھی سر انجام دیئے۔

اس موقع پر مسلمانوں کے سیاسی مفاد میں جو مشورے حضور نے دیئے ان کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اصلاح کے نام پر بعض اوقات بظاہر پسندیدہ اور خوش کُن اقدامات کئے جاتے ہیں جو عملاً بعض قوموں کے لئے نہایت نقصان دہ اور غیر منصفانہ ثابت ہوتے ہیں مثلاً اقلیت کو تعداد سے کچھ زیادہ حقِ نمائندگی دینا بظاہر ایک خوش کُن سیاسی اصول ہے لیکن اگر آنکھیں بند کر کے اس کا اطلاق کیا جائے

تو یہ اس رُوح کے یکسر منافی ثابت ہو سکتا ہے جس کے پیشِ نظر اہلِ سیاست نے یہ اصول وضع کیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال پر جب اس کا اطلاق کر کے دیکھا جائے تو اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفّظ نہیں بلکہ سخت حق تلفی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ آپ نے وزیرِ ہند کی توجّہ اس حقیقت کی طرف مبذول کروائی کہ ہندوستان کے وہ صوبے جن میں ہندو اکثریّت ہے وہاں عموماً مسلمانوں کی تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ ان کو اقلیّت کے نام پر نشستیں دینے کے نتیجے میں صوبے کے سیاسی توازن پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کی جن پانچ صوبوں میں اکثریت ہے ان میں سے دو اہم ترین اور سب سے زیادہ آبادی والے صوبوں یعنی بنگال اور پنجاب میں مسلم غیر مسلم آبادی کا تناسب ایسا ہے کہ اگر ہندوؤں کو اقلیّت کے اصول پر تعداد سے زیادہ نمائندگی دی جائے تو وہ اکثریت میں اور مسلمان اقلیّت میں تبدیل ہو جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سیاسی اصُول ہندوستان سے مسلمان کی سیاسی زندگی کی صف لپیٹنے پر منتج ہو سکتا ہے۔

یہ مشورہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں ایک اہم بنیادی نکتہ کی حیثیّت رکھتا تھا اور یہ امر آپ کی سیاسی بصیرت اور بالغ نظری کا ثبوت ہے کہ اس زمانے میں آپ نے مسلمان اکثریت کے دو صوبوں کے بارے میں جن خطرات کا اندازہ لگایا وہ بعد کے حالات نے درست ثابت کر دیئے چنانچہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے دَوران مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے وہی داؤ چلا گیا جس سے آپ نے متنبّہ کیا تھا اور اقلیّت کو اکثریت میں تبدیل کرنے کے لئے "Other Factors" یعنی بعض دیگر عوامل کی آڑ لے لی گئی جس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ اقلیتوں کو عددی قلّت کے باوجود بعض دیگر اہم امور کے پیشِ نظر سیاسی تحفّظ دیا جائے۔ لیکن دراصل اس کا مقصد بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچانا تھا۔

جماعت احمدیّہ کی طرف سے دوسرا اہم مشورہ اس موقع پر یہ دیا گیا کہ حقوق اور فرائض کے تمام معاملات میں یورپین اور غیر یورپین کی تقسیم کو کلّیۃً ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ ہندوستان کی سیاسی بے چینی کی وجوہات میں سے یہ بھی ایک اہم وجہ ہے۔

تیسری اہم بات جو حضرت امام جماعتِ احمدیّہ نے مسٹر مانٹیگو کے سامنے پیش کرنی ضروری سمجھی وہ یہ تھی کہ اندرونی مذہبی اختلاف سے قطع نظر حکومتِ برطانیہ کو یہ امر خوب ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جماعت احمدیّہ کا سیاسی مفاد کلّیۃً ایسے تمام فرقوں کے ساتھ وابستہ ہے جو جماعت احمدیّہ کی طرح ہی دعوئ اسلام رکھتے ہیں۔ یہ بھی بہت ہی اہم اور بنیادی وضاحت تھی اور ایک

ایسے سنہری اصول پر مبنی تھی کہ اگر مسلمانوں کے تمام فرقے اسے اپنالیں تو مسلمانوں کی سیاسی وحدت کی ایک ٹھوس ضمانت حاصل ہوجائے۔

مسٹر مانٹیگو کی ہندوستان آمد کے بعد دوسرا اہم موقع ملتِ اسلامیہ کے سیاسی مصالح میں دلچسپی لینے کا اس وقت پیش آیا جبکہ جنگِ عظیم اوّل کے معًا بعد خلافتِ ترکیہ بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھی ؛

معاہدۂ ترکیہ۔ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات

اُنیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا آغاز سیاسی لحاظ سے مسلمانوں کے لئے طرح طرح کے دُکھ اور مصائب لے کر آیا۔ لیکن اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ عالمِ اسلام کی صحیح رہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ گو ایک طرف دنیا پر احمدیت کا چاند طلوع ہوتے ہوئے ہدایت اور نور کی کرنیں بکھیر رہا تھا مگر دوسری طرف کروڑہا مسلمانوں کا ایک انبوہِ کثیر تھا جو اس ہدایت اور نور کو ضلالت اور تاریکی قرار دے کر اس سے گریزپا تھا۔ راہبر سے بے خبر تھا لیکن تلاشِ منزل کے لئے سرگرداں نظر آتا تھا۔ جذباتِ محبت و عقیدت بھی تھے۔ ملّتِ اسلامیہ کا درد بھی موجود تھا۔ قربانی کے لئے دل تیار ہی نہیں، قربان گاہوں کے متلاشی بھی تھے۔ اَدِنَا مَنَاسِکَنَا کی آواز عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے اُٹھ رہی تھی مگر افسوس کہ اکثر اس صراطِ مستقیم کو کھو چکے تھے جو ایسی قربان گاہوں کی طرف لے جاتی ہے جہاں خون کا ہر بہنے والا قطرہ اجر کے لاکھوں جواہر عطا کرتا ہے جہاں ہر قربانی گو بظاہر کیسی ہی ادنیٰ نظر آئے رضائے الٰہی کے انعامات پاتی اور رُوحانی خلعتوں کا وارث بناتی ہے۔ یہ وہ دَور ہے جبکہ خلافتِ ترکیہ اپنے آخری سانس لے رہی تھی اور خلافت کی اعلیٰ اقتدار کا تو ذکر ہی کیا دنیوی معیار کے لحاظ سے بھی ہر پہلو سے رُو بہ انحطاط تھی۔

اس عظیم سلطنت کا یہ انحطاط کئی سو سال پر پھیلا ہوا ہے جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت جو اس کی کیفیت تھی وہ ایچ۔سی۔آرمسٹرانگ (H.C. ARMSTRONG) نے اپنی مشہور کتاب GRAY WOLF میں بڑی عمدگی سے بیان کی ہے وہ لکھتا ہے:۔

"ذی شان خلیفہ سلیمان کے بعد تین سو سال کے اندر اندر سلطنت عظمیٰ عثمانیہ کا دیوالہ پٹ چکا تھا اور ارذل عمر تک پہنچ کر اس کے اجزاء منتشر ہونے لگے تھے۔ اس یقین کے نتیجہ میں کہ یہ اب ٹوٹی کہ اب ٹوٹی، عیسائی طاقتیں ہر طرف سے اس پر حریصانہ دباؤ ڈال رہی تھیں کہ جو کچھ لے اُڑنے کی طاقت ہو وہ لے اُڑیں۔ روس کریمیہ اور کاکیشیا پر قبضہ جما چکا تھا۔ قسطنطنیہ کا دعویدار تھا۔ اور ڈارڈنل کے راستے بحرِ اوقیانوس تک پہنچنے کی راہ مانگ رہا تھا۔ فرانس شام اور تیونس کو ہتھیا چکا تھا انگلستان

مصر اور قبرص پر قبضہ جما چکا تھا۔ ایسے حال میں نئی وسعت پذیر طاقت جرمنی نے
سلطان عبدالحمید کو بقیہ یورپ کے مقابل پر ہیرو بنا کر آگے کیا جس کا مقصد صرف
یہ تھا کہ جونہی دوسرے دشمنوں کا قصّہ پاک ہو ترکی پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔
تمام قومیں ترکی سے خصوصی مراعات اور حقوق کا مطالبہ کر رہی تھیں۔
ایسے گِدھوں کی طرح جو کسی جانور کی موت کے انتظار میں بیٹھے ہوں،
عیسائی طاقتیں ترکی کے آخری سانس کا انتظار کر رہی تھیں ایک دوسری
سے ڈرتی ہوئی اس عالمگیر تباہی کی تیاری میں مصروف جسے جنگِ عظیم
کہا جاتا ہے وہ ایک دوسرے کی حاسدانہ نگاہوں کے ساتھ نگرانی کر رہی
تھیں۔ کسی ایک طاقت کو یہ مجال نہ تھی کہ تنہا پہل کر سکے۔ اس لئے
عثمانیہ سلطنت میں زندگی کی رمق باقی رہی جبکہ سرخ سلطان عبدالحمید
اپنے باسفورس کے محلّات میں شاطرانہ چالیں چلتا ہوُا ایک قوم کو دوسری
سے لڑانے میں مصروف تھا۔"[۱]

عربوں کا ایک بڑا حصّہ شدّت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ مذہب کے نام پر ایک غیر قوم کو ان پر حکومت کا ایک بہانہ ہاتھ آیا ہوُا ہے اور اگر مذہبی اشتراک ہی اس حکومت کا جواز پیش کرتا ہے تو پھر عرب بحیثیت قریش اس کے اوّلین حقدار ہونے چاہئیں جن میں اسلام کا سراجِ منیر ضیاریز ہوُا تھا۔ ترکی حکومت کا شمالی علاقہ جو کئی ریاستوں پر مشتمل تھا پہلے ہی چھینا جا چکا تھا اور بلقان کی یورپین ریاستیں جن کے مشرق میں بحر اسود ہے اور مغرب میں ADRIATIC SEA اور جنوب میں AEGEAN SEA۔ جنگِ بلقان کے نتیجہ میں ترکی کے ہاتھ سے چھن چکی تھیں۔ صرف قسطنطنیہ اور گیلی پولی کا تھوڑا سا علاقہ بچا تھا جو ترکی کے قبضہ میں باقی رہا تھا۔ دوسری طرف عربوں کا ایک حصّہ بھی اپنی گردن سے عثمانیہ حکومت کا جُوا اتار پھینکنے کے لئے بے چین تھا علیحدگی کے ان رجحانات کو انگریز مزید ہوا دے رہے تھے۔ ماضی میں عثمانیہ سلطنت کے ہاتھوں عظیم عیسائی طاقتوں کو جو بار بار زک پہنچ چکی تھی اس کے زخم ابھی تک ہرے تھے مگر تہذیب و تمدن کے لبادے اوڑھے ہوئے یہ قومیں محض کسی ظاہری بہانے کے انتظار میں اس شکار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں۔

---

[۱] (INTRODUCTION PAGE IX - X) GRAY WOLF BY H. C. ARMSTRONG
METHUEN & CO LTD. LONDON. 36 ESSEX ST STRAND W-C 2.

اس پس منظر میں جنگِ عظیم اوّل کا آغاز ہوا۔ جرمنی نے اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ترک خلافت کی خیر خواہی کا روپ دھار کر خلیفہ عبدالحمید کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ اس نے جرمنوں کا حلیف بن کر میدانِ جنگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ بالخصوص ہندوستان کے مسلمان حلقوں میں بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ انہوں نے سمجھا کہ اب انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کا وقت آ گیا اور بڑی بڑی اُمنگیں اُن کے دلوں میں کروٹیں لینے لگیں۔ یہ خیال کیا جانے لگا کہ جرمنی اور ترکی مل کر دنیا کی نئی بانٹ اس طرح کریں گے کہ وہ تمام مسلمان علاقے جو روس نے پہلے ہتھیا لئے تھے یا وہ چھوٹی چھوٹی شمالی ریاستیں جو قبل ازیں ترکی حکومت کے اثر سے آزاد ہو چکی تھیں عالمِ اسلام کو دوبارہ عطا ہوں گی اور اسلامی خلافت نئی شان اور نئی قوّت کے ساتھ دنیا میں پھر اُبھرے گی مگر ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں ایک صاحبِ بصیرت راہ نما ایسا بھی تھا جس نے اس صورتِ حال کو مختلف رنگ میں دیکھا اور اس جنگ میں خلافتِ ترکیہ کے جرمنی کی طرف سے شامل ہو جانے کے فیصلہ کو ایک ایسی سنگین غلطی قرار دیا جو عالمِ اسلام کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ رہنما جماعت احمدیہ کے امام حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ تھے۔

آپ کا یہ اختلافِ رائے اور بھی زیادہ عجیب نظر آتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود ترکی میں بھی رائے عامہ ہندوستان کی رائے عامہ کے مطابق جرمنی کے ساتھ شمولیت کو درست اقدام تصوّر کر رہی تھی یہانتک کہ وہ سیاسی راہ نما جنہوں نے سلطان عبدالحمید کے خلاف انقلابی مہم کا آغاز کیا تھا یعنی طلعت پاشا۔ انور پاشا۔ جمال پاشا وغیرہ۔ وہ سب بھی سلطان سے اپنے اختلافات کے باوجود جرمنی کا حلیف بننے کے فیصلہ کو درست سمجھتے تھے۔ ترکی میں ایک استثنائی شخصیت تھی اور وہ کمال اتاترک کی ذات تھی۔ جس نے ابتداء ہی سے اس فیصلہ کو غلط اور غیر دانشمندانہ قرار دیا۔ اور گو قوم کے ساتھ مل کر وہ جرمنوں کی طرف سے جنگ لڑنے پر مجبور ہو گیا لیکن بعد ازاں حالات نے ثابت کر دیا کہ اس کی رائے ہی درست تھی اور ترکی کو اس غلط فیصلے کی پاداش میں بڑی ہولناک قربانی دینا پڑی [۱]

القصّہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی سیاسی بصیرت کا اس امر سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی آنکھ نے ہزاروں میل کے فاصلے سے وہ کچھ دیکھا جو اہالیانِ ترکی کی کروڑوں مبصر آنکھیں نزدیک سے نہ دیکھ سکیں۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے وہ خلافتِ ترکیہ کا ایک ایسا خوش آئند اور بعید از حقیقت تصوّر رکھتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ سوچنا بھی غدّاری کے

۱؎ (GRAY WOLF. PAGE. 22)

مترادف تھا کہ سلطان عبدالحمید محض ایک دنیوی بادشاہ ہے اور خلافتِ راشدہ اسلامیہ سے اُسے حقیقت میں کوئی نسبت نہیں۔ ایسے وجود کے متعلق یہ سُننا وہ کسی طرح گوارا نہیں کرسکتے تھے کہ اس کے فیصلوں میں کسی قسم کی غلطی کا احتمال ہے۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی تنہا آواز ہندوستان کے نقار خانے میں سُنی تو گئی مگر سخت ناپسندیدگی کے ساتھ۔

بہرحال جنگ کے اختتام پر جب اتحادیوں نے ترکی سے انتقام لینے کی ٹھانی اور ترکی کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے تین بڑی طاقتوں امریکہ۔ فرانس اور انگلستان کے نمائندے برسلز میں جمع ہوئے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں شدید ہیجان پیدا ہوگیا۔ چنانچہ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو مسلم کانفرنس کے زیرِ اہتمام مسلمان راہنماؤں کا ایک اجلاس لکھنؤ میں طلب کیا گیا جس کے سیکرٹری چوہدری ظہور احمد وکیل نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو بھی اس میں شمولیت کی دعوت دی۔ اسی طرح مولوی سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی نے بھی اپنی ذاتی حیثیت میں حضور کو شمولیت کے لئے تاکیداً عرض کی۔ یہ دعوت نامہ آپ کو ۱۷ ستمبر کو ملا۔ ۱۸ ستمبر کو آپ نے اس موضوع پر اپنی آراء کو قلمی جامہ پہنایا۔ ۱۹ کو یہ مضمون ایک رسالہ کی صورت میں بعنوان "ترکی کا مستقبل اور مسلمانوں کا فرض" طبع ہو کر تیار ہوگیا۔ اور اسی روز حضور کے نمائندگان کا ایک وفد حضرت مولوی شیر علی صاحب رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ یہ مضمون حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی گہری سیاسی بصیرت کا آئینہ دار اور آپ کی غیر معمولی جرأت اور حق گوئی کا شاہکار ہے ایسے حقائق کا بیان جو اس وقت کے جذباتی ماحول میں مسلمانوں کے لئے تلخیٔ کام و دہن کی کڑی آزمائش تھے۔ آپ نے لومۃ لائم سے بے پرواہ ہو کر اُن کو جُرعہ بجُرعہ پلائے اور قطعاً پرواہ نہ کی کہ اس کے نتیجہ میں جماعت احمدیہ جو پہلے ہی ہدفِ ملامت ہے ان کے طعن و تشنیع کا مزید نشانہ بنے گی۔ جو کچھ آپ نے سوچا زمانے نے ثابت کیا کہ وہی حق تھا۔ جو کچھ آپ نے کہا خود ترکی کے اہلِ بصیرت وطن پرستوں کے نزدیک بھی وہی درست تھا اور بعد کے آنے والے حالات نے گواہی دی کہ آپ کے مشوروں کو قبول نہ کرنے کے نتیجہ میں عالمِ اسلام کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ترکی کے مسئلہ پر جو کئی سال تک ہندوستان میں سیاسی قیاس آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کا موجب بنا رہا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے زیرِ نظر مضمون میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ان کا لبِّ لباب یہ تھا کہ تمام عالمِ اسلام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے خلافت کی بحث کو ترک کر دیا جائے اور ترکی کی مدد محض ایک مظلوم مسلمان سلطنت کے حوالے سے کی جائے۔ اس سے ایسے مسلمان

فرقوں مثلاً شیعوں اور اہلِ حدیث وغیرہ کی ہمدردیاں بھی حاصل ہو جائیں گی جو ترکی خلافت کا جُوا اپنے کندھوں پر مزید برداشت کرنے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ آپ نے حجاز کے سوال کو خاص طور پر پیش کیا اور واضح کیا۔

"دوسرا امر اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ مسلمان حکومتِ حجاز کا سوال بیچ میں سے بالکل اُٹھا دیں۔ عربوں نے غیر اقوام کی حکومتوں کے ماتحت اپنی زبان اور اپنے تمدّن کے متعلق جو کچھ نقصان اُٹھایا ہے، وہ مخفی امر نہیں ہے اور ہر ایک شخص جو ان ممالک کے حالات سے آگاہ ہے اس امر سے واقف ہے اور پھر عربوں نے جو کچھ قربانی اس آزادی کے حصول کے لئے کی ہے، وہ بھی چھپی ہوئی بات نہیں عرب کی غیرتِ قومی جوش مار رہی ہے اور اس کی حریّت کی رگ پھڑک رہی ہے۔ وہ اب کسی صورت میں اپنی مرضی کے خلاف، ترکوں کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ تیرہ سو سال کے بعد اب وہ پھر اپنی چار دیواری کا آپ حاکم بنا ہے اور اپنے حسنِ انتظام اور عدل و انصاف سے اس نے اپنے حق کو ثابت کر دیا ہے۔ اس کے متعلق کوئی نئی تجویز نہ تو کامیاب ہو سکتی ہے نہ کوئی معقول انسان اس کو قبول کر سکتا ہے۔ نہ عرب اسے ماننے کے لئے تیار ہے۔ حجاز کا آزاد رہنا ہی اب اسلام کے لئے مفید ہے۔ مقاماتِ مقدّسہ کا ایک چھوٹی اور نظرِ طمع سے بچی ہوئی سلطنت میں رہنا بہت بہتر ہے۔ پس اس سوال کو ہمیشہ کے لئے فیصل شُدہ خیال کرنا چاہیئے۔" [۱]

یہ دونوں مشورے اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں کو نہایت ناگوار گذرے۔ مگر ترکی کے قوم پرست مسلمانوں نے کمال اتاترک کی قیادت میں بعد ازاں عملاً دنیا پر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہی رائے درست تھی اور ترکی کا مفاد اسی سے وابستہ تھا۔

چنانچہ کمال اتاترک کے سامنے جب ہندوستان کے علماء کا ایک وفد یہ درخواست لے کر پیش ہُوا کہ اب آپ ہی خلیفۃ المسلمین بن جائیے تو اس نے بڑی حقارت سے اس تجویز کو ردّ کر دیا۔ اسی طرح جب اتاترک کے اپنے ساتھیوں میں سے جو تحریکِ انقلاب میں اُن کے ساتھ شامل تھے بعض نے

---

[۱] الفضل ۷ ستمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۶

ایسی آراء کا اظہار کیا کہ از سرِ نو عثمانی حکومت کی حدود کو شمال میں یورپ کی بعض ریاستوں اور جنوب میں مصر و شام اور حجاز تک ممتد ہونا چاہیئے تو کمال اتاترک نے اس خیال کو بھی بڑی سختی سے رد کیا اور واضح کیا کہ ترکی کی موجودہ تمام مصیبتیں اسی غلط جذباتی طرزِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم نے عرب اور شمالی یورپ میں نفرت کی فصلیں کاٹی ہیں ہمیں اس حکومت کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا لہٰذا ترکی کی انقلابی حکومت نہ تو خلافت کا لبادہ اوڑھے گی اور نہ ہی اپنی حدود ترکی سے باہر کسی علاقے تک ممتد کرے گی۔" [1]

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس مضمون میں ایک اَور نہایت ہی قیمتی مشورہ جس تک کسی اَور راہ نما کی نظر نہیں پہنچی تھی یہ دیا کہ محض برطانوی حدود میں کوئی تحریک چلانا ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے مطلب براری کی بجائے برعکس نتیجہ نکلنے کا احتمال ہے۔ اس وقت ترکی کا فیصلہ صرف برطانیہ کے رحم و کرم پر نہیں بلکہ فرانس اور امریکہ کی بڑی طاقتیں بھی اس میں برابر کی شریک ہیں ان تینوں میں سے برطانیہ کا رویہ ترکی کے حق میں ہے اور امریکہ اور فرانس کا شدید مخالفانہ۔ اگر اس وقت انگریزوں کے خلاف تحریک چلائی جائے تو اوّل تو فائدہ کی بجائے یہ نقصان پہنچے گا کہ ان کی ہمدردیاں بھی مسلمانوں سے جاتی رہیں گی۔ دوسرے یہ کہ اگر انگریز چاہے بھی تو تنہا امریکہ اور فرانس کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا فرانس اور امریکہ کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ جو ایک محنت طلب کام ہے۔ اس حصّہ مضمون پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے حالات کا حسب ذیل نہایت قیمتی جائزہ پیش کیا۔ آپ لکھتے ہیں:۔

> "پس اگر اس امر میں کامیاب ہونے کی کوئی امید ہو سکتی ہے تو صرف اس طرح کہ ان دیگر اقوام کی رائے بھی بدلی جاوے جو اس وقت صلح کی کانفرنس میں حصّہ لے رہی ہیں۔ خصوصاً امریکہ اور فرانس کی۔ اگر ان دونوں ملکوں کی رائے بدل دی جائے تو پھر کوئی مشکل نہیں رہتی۔
>
> مگر ایسی کوشش کرنے سے پہلے یہ سوال حل کرنا چاہیئے کہ ان اقوام کو ترکی سے اس قدر نفرت کیوں ہے۔ کیونکہ جو خیالات ان کے ان فیصلوں کے محرک ہیں انہی کے دُور کرنے سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں جرمن قوم جو جنگ کی اصل بانی ہے اور جس نے جنگ کے دَوران میں انسانیت اور آدمیت کے تمام اصول کو پامال کر دیا تھا وہ صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو وہ بھی فرانس سے لیا ہوا تھا۔ چھوڑ کر اور کسی قدر علاقہ

پولینڈ کا آزاد کر کے پھر اسی طرح اپنے ملک پر قابض ہے۔ آسٹریا جو اس جنگ کا بانی تھا اپنے ملک میں اسی طرح حکومت کر رہا ہے اور صرف ان غیر علاقوں کو جو اس سے خود جُدا ہونا چاہتے تھے۔ جُدا ہونے کی اجازت دی گئی ہے بلغاریہ باوجود انتہائی درجہ کے مظالم اور غداری اور معاہدہ شکنی کے اپنے ملک پر قابض ہی نہیں بلکہ اسے سمندر کی طرف راستہ دینے کی تجاویز ہو رہی ہیں۔ رومانیہ نے تین دفعہ اِدھر سے اُدھر پہلو بدلا۔ مگر اور زیادہ علاقہ کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ترک جس نے خود یورپین طاقتوں کے اقوال کے مطابق مجبور ہو کر جرمن دباؤ کے نیچے جنگ کی تھی اور جس نے جنگ کے دَوران میں نہایت شرافت، نہایت دلیری اور بہادری سے کام لیا تھا اور بحیثیتِ قوم کسی قسم کا ظلم نہیں کیا اس کو ناقابلِ حکومت قرار دیا...... کہا جاتا ہے کہ آرمینیہ کے قتلِ عام اس کی اصل وجہ ہیں..... لیکن ان کو صحیح تسلیم کر کے بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ اسی قسم کے مظالم اور حکومتوں میں بھی ہیں۔ روس میں جو کچھ یہود سے ہوتا رہا ہے وہ آرمینیہ کے قتلِ عام سے کم نہیں۔ بلکہ بہت زیادہ ہے اب بولشوکس جو کچھ کر رہے ہیں سب دنیا اس پر انگشت بدنداں ہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی انہوں نے قتل کر دیئے ہیں اور ایسے مظالم سے کام لیتے ہیں کہ عقل دنگ ہو جاتی ہے........ امریکہ جو اس وقت لوائے حرّیت کا حامل ہے اور سب سے زیادہ انصاف و عدل کے دعوے کرتا ہے اور اسی وجہ سے پریذیڈنٹ وِلسن کہتا ہے کہ اگر اس جنگ کے بعد ٹرکی حکومت قائم رہے تو گویا اس جنگ کی غرض ہی فوت ہو گئی خود اس کے ملک میں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کے وسیع اختلافات کی وجہ سے نہیں کالے اور گورے رنگ کے فرق سے ایسے ایسے مظالم ہو جاتے ہیں کہ حیرت آتی ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وکسبرگ میں لائڈ کلے نامی ایک انیس سالہ حبشی لڑکا جو کسی الزام کے ماتحت حوالات میں تھا اور جو بعد کی تحقیق سے بالکل بے گناہ ثابت ہوا اُسے عام آبادی نے قیدخانہ توڑ کر باہر نکال لیا۔ اور زندہ کو

شہری اُسے عذاب دینے کے لئے جمع ہوئے ایک درخت پر اُسے لٹکا دیا گیا اور بالکل ننگا کر دیا گیا۔ بعضوں نے مشورہ دیا کہ اسے قتل کر دیا جاوے مگر دوسروں نے کہا کہ نہیں اسے آہستہ آہستہ مرنے دو۔ اور پہلے مٹی کا تیل اس کے بدن کو ملا گیا پھر لکڑیوں کا انبار لگا کر پٹرول اُوپر ڈال کر اسے جلایا گیا۔ اس کے چیخنے اور چلّانے اور آہ و فریاد کرنے کو ایک پُر لطف تماشا سمجھ کر عورت و مرد نے ڈیڑھ گھنٹے تک یہ نظارہ دیکھا اور جب اس کی لاش اتاری گئی تو وہ رسیاں جس سے وہ بندھا ہُوا تھا ان کے ٹکڑے بطور یادگار لوگوں نے اپنے پاس رکھے اور اس درخت کو جس سے وہ لٹکایا گیا تھا۔ ایک مقدس یادگار قرار دیا گیا۔ پھر ابھی پچھلے ماہ میں ہی تسکیگو میں حبشیوں پر جو کچھ ظلم کئے گئے ہیں اخبارات میں شائع ہوتے ہی رہے ہیں۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ صرف یہ کہ ایک حبشی لڑکا جھیل کے کنارہ پر غلطی سے اس حصہ پر چلا گیا تھا۔ جو سفید رنگ کی آبادی کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس پر سفید آبادی نے اس پر پتھروں کا مینہ برسایا اور اس واقعہ سے وہ خطرناک آگ بھڑک اٹھی جس نے پچھلے دنوں تمام دنیا کو حیرت میں ڈالے رکھا تھا۔ انہی واقعات پر پریذیڈنٹ وِلسن کو ایک دفعہ کہنا پڑا تھا کہ "جب ہم اپنی ڈیماکریسی کو یہ ثابت کر کے کہ وہ کمزوروں کے لئے باعثِ حفاظت نہیں ہے، ذلیل کر رہے ہیں تو دوسروں کے سامنے ڈیماکریسی کیونکر پیش کر سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر کہا جائے کہ لالچ سے ایسا کیا جاتا ہے تو یہ درست نہیں کیونکہ امریکہ کو کوئی لالچ نہیں۔ کم سے کم امریکہ کوئی حصہ اپنے لئے لینے کیلئے تیار نہیں۔

پس معلوم ہوتا ہے کہ اس نفرت کا باعث کچھ اور ہے اور وہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ترک مسلمان کہلاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرا مطلب اس بات کے کہنے سے کہ ترکوں سے اس لئے نفرت کی جاتی ہے کہ وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ یہ ہے کہ ان ممالک کے لوگوں کو اسلام سے اس قدر بُعد ہے اور آباؤ اجداد سے اُن کے دل میں اسلام کی نسبت اس قدر بدظنّیاں بٹھائی گئی ہیں کہ وہ اسلام کو ایک عام مذہب کے طور پر خیال

نہیں کرتے بلکہ ایک ایسی تعلیم خیال کرتے ہیں جو انسان کو انسانیت سے نکال کر جانور اور وہ بھی وحشی جانور بنا دیتی ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ایسی وحشیانہ تعلیم دیتا ہے کہ اس کی موجودگی میں رحم اور انصاف دل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔"[1]

صورتِ حال کو یوں نکھار کر پیش کرنے کے بعد آپ نے بڑے دردمند دل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان غیر ممالک میں خصوصاً امریکہ اور فرانس میں پروپیگنڈا کے مراکز قائم کریں اور آخر پر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ایک آریہ لیڈر لالہ لاجپت رائے کی چٹھی کا ایک اقتباس پیش کیا جو اخبار لیڈر الہ آباد میں شائع ہوئی تھی اور جس نے ہندو ہونے کے باوجود غیر ممالک میں مسلمانوں کے خلاف زہریلے پروپیگنڈا کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اپنے تأثرات ان الفاظ میں بیان کئے:۔

"مجھے اپنے سفروں میں اس سے زیادہ کسی امر نے تکلیف نہیں دی جس قدر کہ اس گہری ناواقفیت اور سخت تعصّب نے جو اسلام اور اسلامی ممالک کے متعلق امریکہ میں پھیل رہا ہے۔ ممالکِ متحدہ میں آپ کو چین۔ جاپان اور ہندوستان کے ہمدرد تو ملیں گے لیکن مَیں نے اپنے پانچ سالہ سفروں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو اسلام اور اسلامی ممالک کے متعلق کوئی کلمۂ خیر مُنہ سے نکالتا ہو۔ ایک مسلمان دوست سمیت مجھے ایک مجلس میں جانے کا اتفاق ہوُا جس میں ترکی حکومت کے مستقبل کے متعلق گفتگو تھی۔ ترکوں کی طرف سے ایک ترک ہی وکیل تھا۔ لیکن جو لوگ اس کو جواب دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے انہوں نے ایسی ناواقفیّت اور کھلی کھلی دشمنی اور تعصّب کا ثبوت دیا کہ میرے لئے صبر کے ساتھ سُننا مشکل ہو گیا۔ ترکی وکیل نے بہت بُری طرح وکالت کی اور اپنے خلاف تعصّب کا طوفان کھڑا کر لیا۔ ترکوں کو ایک ڈراؤنی شہرت حاصل ہے اور مسلمان اقوام کے معاملہ کو ایسی طرح پیش کرنے کے لئے کہ لوگوں کے دل میں ان سے ہمدردی پَیدا ہو بڑی لیاقت دانائی اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ آخر میں میرے دوست نے میرے کہنے پر اس تعصّب کے کم کرنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز اکیلی آواز تھی۔

---

[1] الفضل قادیان ۲ ستمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۸

مسلمانانِ ہند پر ان کے مذہب ان کے ہم مذہبوں اور خود اپنے نفسوں کی طرف سے یہ ذمہ داری عاید ہے کہ وہ چند لائق آدمی تمام ذونفوذ ممالک میں بطور اپنے وکلاء کے مقرر کریں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جو فوری توجّہ چاہتی ہے۔ یہ تمام ہندوستانیوں کا بلا تفریق مذہب فرض ہے کہ وہ اسلام کی عزّت کو بدنامی کے صدمہ سے بچائیں اور جب کبھی انہیں کسی مفید نتیجہ کی امید ہو، مسلمانوں کے لئے بھی اس انصاف اور حق جوئی کا مطالبہ کریں جس کا مطالبہ دوسری اقوام کے لئے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ خود مسلمانوں پر ایک ایسی ذمّہ داری ہے کہ جسے انہیں بغیر تاخیر اور بغیر پہلو تہی کے بجالانا چاہیئے۔ اگر وہ اس ذمّہ داری کے بجالانے سے غفلت کریں گے تو اس کا نقصان خود اُٹھائیں گے۔" [1]

یہ اقتباس پیش کرنے کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی غیرت کو ان الفاظ میں جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔

"یہ ایک ہندو کی آواز ہے بلکہ ایک آریہ کی آواز ہے جو مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگاتی ہے اسلام کی حالت ایسی گر گئی ہے۔ کہ اس سے مذہبی مخالفت رکھنے والے لوگ اب اسے ہوشیار کرتے ہیں۔ اور اس کی حالت ان کے رحم کو جذب کرتی ہے۔ بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے اور تھوڑا باقی ہے اگر اب بھی سُستی کی گئی تو کسی بہتری کی امید رکھنی فضول ہے جب تک اسلام بحیثیت اور دنیا کے لئے ایک مہلک بیماری کے رنگ میں دیکھا گیا اس وقت تک مغربی بلاد سے کسی انصاف کی امید رکھنا ایک فضول امر ہے اور جب تک دوسرے بلاد خصوصًا امریکہ کی رائے انگلستان کے ساتھ نہ ہو اس وقت تک برطانیہ کی آواز کے سُنے جانے کا خیال بھی کرنا ایک وہم ہے۔" [2]

یہ مضمون مسلمانوں کے اس تاریخی نمائندہ اجلاس میں بڑی بے دلی سے سُنا گیا گویا کہنے والے کی زبان اور تھی اور سُننے والوں کی زبان اور۔ ہنگامہ خیز خطاب کی توقع رکھنے والے دلوں پر بھلا عقل و دانش کی یہ سُلجھی ہوئی آواز کیا اثر کر سکتی تھی۔ ہر چند کہ یہ تقریر عقل اور جذبات کے توازن کا ایک شاہکار تھی۔ لیکن سُننے والے کسی اور ہی خیال میں مگن تھے۔ انہیں ایسے شعلہ بیانوں کی ضرورت تھی۔

---

[1] الفضل قادیان، ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۰-۹۔ [2] الفضل قادیان، ۲ ستمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۱

جو عقل و خرد کے خرمن کو پھونک ڈالیں اور ضبط و تحمل کے تقاضوں کو بھاڑ میں جھونک دیں۔ انہیں ایسے آتش نواؤں کی ضرورت تھی جو سادہ لوح عوام کے جذبات کو بھڑکا کر ایک ایسا الاؤ تیار کریں جس کے شعلے آسمان تک پہنچیں اور جس کی پہنائی برِصغیر کے کناروں کو محیط ہو۔

احمدی جماعت کے اس نوجوان رہنما کو بھلا کیا حق پہنچتا تھا کہ مسلمانوں کو بے نتیجہ کھوکھلی اور عامیانہ سیاست کے چنگل سے نکال کر ایک بالغ نظر باثمر لائحہ عمل کی طرف بلائے۔

نتیجہ وہی نکلا جس کی ان حالات میں توقع کی جا سکتی تھی۔ اس "بے وقت کی راگنی" کی بھلا کیسے سزا نہ دی جاتی۔ لازماً احمدی رہنما کے پُرخلوص مشوروں کی کچھ نہ کچھ سزا اس کی جماعت کو ملنی چاہیئے تھی سو ایسا ہی ہُوا۔

ایسا ہی ہُوا اور بعض جوشیلے علماء نے محض گالیوں کے زبانی جمع خرچ کو کافی نہ سمجھتے ہوئے احمدیوں کے خلاف اس بناء پر ایذاء رسانی کی ایک ملک گیر مہم چلا دی کہ یہ لوگ خلافتِ ترکیہ کو برحق نہیں سمجھتے۔ اور ملک میں بدامنی پھیلانے والی تحریکات کی محض اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت کا تسلّط قائم رہے جس کے ختم ہونے کے روشن امکانات پیدا ہو چکے ہیں۔

یہ تحریک بڑی چابکدستی اور بے رحمی کے ساتھ چلائی گئی اور اس کے نتیجہ میں جگہ جگہ احمدیوں پر سخت مظالم توڑے جانے لگے۔ جن کا کچھ تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔

اس صورتِ حال پر تقریباً نو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ انگریزوں کو سخت گالیاں دی گئیں۔ مسلمان عوام میں دلفریب نعروں سے جوش پیدا کیا گیا حتیٰ کہ خلافت ترکیہ کے حق میں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں کے جذبات شدید ہیجان پکڑ گئے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔ اتحادی طاقتوں نے معاہدۂ ترکیہ کی صورت میں ایک نہایت ظالمانہ فیصلہ کیا جو ترکی کے لئے نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام کے لئے انتہائی تکلیف دِہ تھا۔ اس پر یکم جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد میں مسلمان راہ نماؤں کی ایک اور کانفرنس طلب کی گئی۔ اس کانفرنس میں بھی اس جلسہ کی منتظم نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو دعوت دی۔ لیکن اس بار بھی وہی پہلی کہانی دُہرائی گئی۔ یعنی یکم جون کو ہونے والے اجلاس کی دعوت آپ کو ۳۰ مئی کو پہنچی گویا اس کانفرنس میں اگر آپ شمولیت کرنا بھی چاہتے تو آپ کے لئے سوچنے اور لکھنے کا بظاہر کوئی وقت نہ تھا لیکن جس صاحبِ عزم و ہمت انسان کو یہ دعوت دی گئی تھی اس نے جواباً اسی عزم و حوصلہ کا اظہار کیا۔ جو ایک بار پہلے کر چکا تھا۔ اسی دن چند گھنٹوں کے اندر ایک معرکۃ الآراء مضمون بعنوان "معاہدۂ ترکیہ

اور مسلمانوں کا آئندہ رویّہ" رقم فرما کر رات ہی رات میں اُسے طبع کروایا اور اگلے روز علی الصبح آپ کا نمائندہ وفد یہ تحریری پیغام لے کر کانفرنس میں شمولیت کے لئے الہ آباد پہنچ گیا۔

اپنے گزشتہ تجربے کی بناء پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس مضمون کو بڑے دُکھی دل کے ساتھ تحریر کیا۔ یہ مضمون لکھتے وقت بھی آپ کو یہ احساس تھا کہ کوئی ان باتوں پر کان نہیں دھرے گا اور یہ قیمتی مشورے ضائع جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی غیر معمولی ہمدردی اور احساسِ فرض آپ کو مجبور کر رہا تھا کہ شاملِ اجلاس راہ نماؤں کی خدمت میں حق بات بہرحال پہنچادی جائے۔ آپ نے فرمایا۔

"اے احبابِ کرام! مَیں نے ستمبر گزشتہ کے اجتماع کے وقت تحریر کے ذریعہ سے آپ لوگوں کو توجہ دلائی تھی کہ دولتِ عالیہ عثمانیہ کے مستقبل کے متعلق جدوجہد کی بنیاد اس امر پر رکھنی چاہیئے کہ سلطانِ ترکی کثیر حصّہ مسلمانان کے نزدیک خلیفہ ہیں۔ اور باقی تمام مسلمان بھی بوجہ ان کے اسلامی بادشاہ ہونے کے ان سے ہمدردی رکھتے ہیں اس لئے ان سے معاہدہ صلح کرتے وقت تمام عالم کے مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھا جاوے اور ان سے انہی اصول کے ماتحت معاملہ کیا جاوے جن کے ماتحت دوسری مسیحی حکومتوں سے معاملہ کیا گیا ہے۔ اور مَیں نے بتایا تھا کہ اس طریق پر تمام وہ فرقے جو اسلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کا آپس میں کیسا ہی اختلاف ہو اس معاملہ میں اکٹھے ہو سکیں گے لیکن افسوس کہ اس وقت آپ لوگوں کو میرا مشورہ پسند نہ آیا اور اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ یورپ کو یہ بات کہنے کا موقع ملا کہ خلافتِ عثمانیہ کے متعلق مسلمانوں کی آواز ایک نہیں اور اس لئے یہ کہنا کہ ترکوں کے متعلق تمام مسلمانوں کی ایک رائے ہے درست نہیں۔

اگر میرا مشورہ اس وقت تسلیم کیا جاتا تو احمدیہ جماعت کو خلافت کے مسئلہ کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ اور وہ ترکوں کے لئے انصاف کا جائز طور پر مطالبہ کرنے میں اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ شامل ہو سکتی تھی۔

اگر اس وقت میرا مشورہ قبول کر لیا جاتا تو شیعہ اصحاب کو جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ علی الاعلان اس تحریک سے براءت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اور وہ بھی دوسرے بھائیوں کے ہم زبان ہو کر اس مسئلہ کے متعلق اپنی ہمدردی کا اظہار کر سکتے تھے "[1]

پھر اپنے گذشتہ مشوروں کا جن کو رد کرنے کے نتیجہ میں بہت کچھ نقصان پہنچا تھا۔ مختصراً ان الفاظ میں ذکر کیا۔

" اگر میرا مشورہ قبول کر لیا جاتا تو عرب کے وہابی فرقہ کو بھی کھلے طور پر اس مسئلہ میں دوسرے ممالک کے لوگوں کے ساتھ شریک ہونے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اور اگر میرا مشورہ قبول کر لیا جاتا تو یورپ کے لوگوں کو اس بات پر ہنسی اُڑانے کا موقع نہ ملتا کہ مسلمان اپنے خلیفہ کی حفاظت کی اپیل عیسائی حکومتوں سے کرتے ہیں۔

اور اگر اس کام کو تکمیل پر پہنچانے کے متعلق جو بات مَیں نے لکھی تھی اُس پر عمل کیا جاتا تو یقیناً شرائطِ صلح موجودہ شرائط سے مختلف ہوتیں۔ وفود کا بھیجا جانا اس قدر معرض التواء میں ڈالا کہ عمل کا وقت ہاتھ سے جاتا رہا۔ امریکہ کی طرف کوئی وفد نہیں بھیجا گیا۔ عراق، شام، عرب اور قسطنطنیہ کی طرف وفد بھیجے جانے ضروری تھے۔ مگر اس کا کچھ خیال نہیں کیا گیا۔ فرانس اور اٹلی کی طرف مستقل وفدوں کی ضرورت تھی مگر اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ جاپان بھی توجہ کا مستحق تھا اُسے بھی نظر انداز کیا گیا۔ انگلستان کی طرف وفد گیا اور وہ بھی آخری وقت میں۔ ساری کوشش ہندوستان کی گورنمنٹ کو بُرا بھلا کہنے میں یا ان لوگوں کو گالیاں دینے میں صرف کر دی گئی جو گو ترکوں سے ہر طرح ہمدردی رکھتے تھے مگر سلطان المعظم کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مگر کیا گالیاں دینے سے کام ہوتے ہیں۔

---

[1] اخبار الفضل قادیان ، ۷ جون ۱۹۲۰ء صٓ ۳)

کام کام کرنے سے ہوتے ہیں......

اے نمائندگانِ اسلام! اس وقت جبکہ آپ نہایت سنجیدگی سے دولتِ عثمانیہ کے مستقبل پر غور کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ اور آپ کے دلوں میں غم اور فکر کا ہجوم ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ناکردہ گناہ بچےّ اور بے قصور عورتیں اس شدّتِ گرما میں اس قصور میں پیاسے تڑپ رہے ہیں کہ ان کے والدین یا شوہر کیوں سلطان المعظم کی خلافت کے قائل نہیں اور مسلمان کہلانے والے لوگوں نے نہ معلوم کس کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے اس پانی سے بھی ان کو روک دیا ہے جس سے خدا تعالےٰ کافر سے کافر انسان کو بھی نہیں روکتا۔ اب آپ سوچیں کہ کیا اُن کی آہیں........اور ان کی چیخ و پکار خدا تعالیٰ کے عرش کو ہلا کر اس بات کی درخواست کر رہی ہو گی کہ ان ہم پر ظلم کرنے والوں کے کام میں برکت دے اور ان کی مرادوں کو پورا کر........

محض اس اختلافِ رائے پر کہ کیوں احمدی خلافتِ عثمانیہ کے قائل نہیں ان کو پانی سے روکا جاتا ہے۔ ان کو خرید و

فروخت سے باز رکھا جاتا ہے ان کے گھروں میں کام کرنے سے مہتروں کو باز رکھا جاتا ہے اور ان پر نماز ادا کرتے وقت کنکروں کی بارش کی جاتی ہے۔“ [1]

اس کے بعد آپ نے ترکی کے متعلق اتحادیوں کے فیصلوں پر کڑی نکتہ چینی کی اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا کہ ترکوں کے ساتھ انتہائی غیر منصفانہ سلوک کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:۔

”ترکوں کے متعلق شرائطِ صلح کا فیصلہ کرتے وقت ان اصول کی پابندی نہیں کی گئی جن کی پابندی یورپ کے مدبر انصاف کے لئے ضروری قرار دے چکے ہیں۔

عراق کی آبادی کو ایسے طور پر اپنی رائے کے اظہار کا موقع نہیں دیا گیا جیسا کہ جرمنی کے بعض حصوں کو۔ ان سے باقاعدہ طور پر دریافت نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے لئے کس حکومت یا کس طریقِ حکومت کو پسند کرتے ہیں۔ شام کی آبادی کو باوجود اس کے صاف صاف کہہ دینے کے کہ وہ آزاد رہنا چاہتی ہے فرانس کے زیرِ اقتدار کر دیا گیا ہے۔ فلسطین کو جس کی آبادی کا ۴/۵ حصہ مسلمان ہے ایک یہودی نوآبادی قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہود کی آبادی اس علاقہ میں ۱/۸ کے قریب ہے۔ اور یہ آبادی بھی جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے ۱۸۸۰ء سے ہوئی ہے اور زیادہ تر ان پناہ گیروں کی ہے جنہوں نے ان ممالک سے آکر پناہ لی ہے جن میں یہودیوں پر ظلم کرنا سیاست کا ایک بڑا جزو قرار دیا گیا ہے۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا) (یعنی روس وغیرہ)

Consisting Principally of refugees from countries where anti-semition is an important element in Politics.

پس ایسے علاقہ سے ترکوں کو دست بردار کرانا اور یہود کے سپرد

---

[1] الفضل ۷ جون ۱۹۲۰ء صفحہ ۴

کر دینا جس میں کثیر حصۂ آبادی مسلمان ہے اور جو یہود کے لئے ایک ہی جائے پناہ تھی کیا اس جرم کے سبب سے ہے کہ انھوں نے کیوں یہود کو اس وقت پناہ دی جبکہ مسیحی حکومتیں ان کو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے بے دخل کر رہی تھیں۔

یہی حال لبنان کا ہے اس کو فرانس کے زیرِ اقتدار دینا بالکل کوئی سبب نہیں رکھتا اور آرمینیا کا آزاد کرنا بھی بے سبب ہے۔ کیونکہ آرمینیا کا جائے وقوع ایسے علاقہ میں ہے جس کے چاروں طرف ترک آباد ہیں۔ اور ان کی الگ حکومت بنانے سے یہ مطلب ہے کہ ترک قوم آپس میں اتحاد نہ کر سکے۔ اور روسی ترکستان کے لوگ کسی وقت بھی ایشیائے کوچک کے ترکوں سے مل نہ سکیں۔ پھر آرمینیا کو جو بہت سے علاقے دیئے گئے ہیں ان میں کثیر حصۂ آبادی کا مسلمان ہیں۔ اور ایسی بعض ولایات کے دینے کی تجویز ہے، جہاں کی آبادی قریب قریب ساری مسلمان ہے۔ حالانکہ یہ بات ثابت ہے کہ آرمینین مسیحیوں نے نہایت بیدردی سے مسلمانوں کو قتل کیا ہے اور خود وزیرِ انگلستان اس بات کا انکار نہیں کر سکے کہ آرمینین مسیحیوں نے بھی مسلمانوں پر سخت سے سخت مظالم کئے۔ پس اگر ترکوں کو اس جرم میں اس علاقہ کی حکومت سے بے دخل کیا جاتا ہے کہ وہ کُردوں کو آرمینین مسیحیوں پر ظلم کرنے سے کیوں نہیں روک سکے تو آرمینین مسیحیوں کو جو خود مسلمانوں کو قتل کرنے کے جرم کے مرتکب ہیں۔ مسلمانوں پر کیوں حکومت دے دی گئی ہے۔ اور اگر کوئی ایسے قواعد بنا دیئے گئے ہیں کہ جن کے ماتحت آرمینین مسیحی مسلمانوں پر ظلم نہیں کر سکیں گے تو کیوں انہی قواعد کے ماتحت آرمینیا کو ترکوں کے ماتحت نہیں رکھا گیا تا مسلمان مسیحیوں پر ظلم نہ کر سکتے۔

اسی طرح سمرنا کو یونان کے حوالہ کرنا بھی خلافِ انصاف ہے۔

کیونکہ کسی مُلک کے صرف ایک شہر میں کسی قوم کی کثرتِ آبادی اُسے اس ملک کی حکومت کا حقدار نہیں بنا دیتی۔ اور یہ اصول کبھی بھی سیاست میں تسلیم نہیں کیا گیا۔" ؎

بعد ازاں آپ نے مسلمانوں کے آئندہ لائحہ عمل کے متعلق حسب ذیل قیمتی مشورے دیئے۔

"اس سوال کے جواب میں کہ اگر اتحادی اس معاہدہ کو نرم نہ کریں، تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ مختلف آراء پیش کی گئی ہیں۔ بعض نے ہجرت کی تجویز پیش کی ہے۔ بعض نے جہادِ عام کو پسند کیا ہے بعض نے قطع تعلق کی پالیسی کو سراہا ہے مگر میرے نزدیک ان سب تجاویز میں سے ایک تجویز بھی درست نہیں اور نہ قابلِ عمل ہے۔ ہندوستان کی سات کروڑ آبادی ہندوستان کو چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتی اور نہ اس کے باہر جانے کی کوئی غرض اور فائدہ ہے۔ . . . دوسری تجویز جہاد کی ہے۔ جہاد اس ملک میں شرعاً جائز نہیں . . . . . ہمیں سب سے زیادہ اپنا مذہب عزیز ہونا چاہیئے۔ اگر ہم تمام دنیا کی حکومت کے لئے بھی اپنا مذہب قربان کر دیتے ہیں تو ہم گھاٹے میں رہیں گے۔ پس حکومتِ برطانیہ کے زیر سایہ رہتے ہوئے اس کی حفاظت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا یا اس کے متعلق تدابیر سوچنا ایک مسلمان کے لئے جو اپنے مذہب کی کچھ بھی قدر کرتا ہے ناجائز ہے اور اسلام کی عظمت کرنے والا مسلم اس تجویز پر بھی عمل نہیں کر سکتا۔

اگر کہا جاوے کہ باہر جا کر پھر جہاد کریں تو اوّل تو اس سوال کے ساتھ پھر ہجرت کا سوال آجاوے گا جسے مَیں پہلے ناجائز اور ناممکن ثابت کر چکا ہوں۔ دوم جہاد کے لئے یہ شرط ہے کہ اس حکومت سے کیا جاوے جو اسلام کو مٹانے کے لئے مسلمانوں پر حملہ کرتی ہے اور ترکوں سے جنگ کرنے میں اتحادیوں نے ابتداءً نہیں

؎ (اخبار الفضل قادیان ۷ر جون ۱۹۲۰ء صفحہ ۴-۵)

کی۔ نہ اس جنگ کی وجہ اسلام کو مٹانا تھا۔ پس جب تک یہ ثابت نہ کیا جاوے کہ اس جنگ کی ابتداء اتحادیوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اتحادیوں نے ترکوں سے اس لئے جنگ کی تھی کہ وہ ان کو جبراً مسیحی بنالیں جہاد ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے جو برطانیہ کی حکومت کے نیچے رہتے ہیں جائز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔

اگر سب مسلمان اس تجویز پر عمل کرنے لگیں تب بھی وہ گورنمنٹ پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے کیونکہ اس ملک کی آبادی کا صرف چوتھا حصہ مسلمان ہے ۳/۴ ہندو ہیں اور قریباً چالیس لاکھ مسیحی ہیں پس اگر گورنمنٹ کو اس کے خطاب واپس کر دیئے جائیں تو اس سے اس کا کوئی نقصان نہیں اور اگر اس کی ملازمت سے علیحدگی کی جاوے تو ہندوستان کی ۳/۴ آبادی اُن کی جگہیں پُر کرنے کے لئے تیار ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ہندو سر برآوردہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن اس تجویز کی مخالفت ہندوؤں میں بہت زیادہ ہے اور یقیناً پانچ فیصدی ہندو بھی مسلمانوں کا ساتھ نہ دیں گے۔ اگر مسلمان وکلاء اپنا کام چھوڑ دیں گے۔ تو خود مسلمان بھی اپنی دادرسی کے لئے ہندو وکلاء کی خدمات کو حاصل کر لیں گے۔ اور وہ شوق سے ان کے مقدمات لیں گے اور اگر مسلمان جج استعفا دے دیں گے تو ہندو امیدوار فوراً ان کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھیں گے۔ اگر فوجی مسلمان استعفا دے دیں گے تو علاوہ اس کے کہ وہ فوجی قواعد کی خلاف ورزی کر کے سزا پائیں گے ان کا مستعفی ہو جانا ایسا مؤثر نہ ہوگا۔ کیونکہ ہندو قوم اب فوجی خدمات کی اہمیت سے کافی طور پر واقف ہو چکی ہے اور وہ اپنے قدیم ملک کو بلا حفاظت چھوڑنے پر کبھی رضامند نہ ہوگی۔ غرض ہر ملازمت کے لئے دوسری اقوام کے لوگ نہ صرف مل جائیں گے بلکہ شوق سے

آگے بڑھیں گے۔ کیونکہ ملازمت تلاش کرنے والوں کی ہمارے ملک میں کمی نہیں ہے۔ ایسے لوگ مسلمانوں کے اس فیصلے کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھیں گے اور ان کی بیوقوفی پر دل ہی دل میں ہنسیں گے پس سوائے اس کے کہ اس فیصلہ سے لاکھوں مسلمان اپنی روزی سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور تعلیم سے محروم ہو جاویں اور اپنے حقوق کو جو بوجہ مسلمانوں کے سرکاری ملازمتوں میں کم ہونے کے پہلے ہی تلف ہو رہے ہیں اور زیادہ خطرے میں ڈال دیں اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا..........

مَیں صرف اسی کارروائی کا مشورہ نہ دوں گا بلکہ اس کے علاوہ میرے نزدیک مسلمانوں کو آئندہ کے لئے ایک عملی پروگرام بھی بنانا چاہیئے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس معاہدہ کی پابندی کا اثر اسلام پر کیا پڑے گا۔ اس سوال کا جواب دیتے وقت ایک چیز نمایاں طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور وہ ان علاقوں کی نگہداشت ہے جن میں مسلمان بستے ہیں۔ اور جنہیں یونان اور آرمینیہ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ یونانیوں اور آرمینیوں کا تعصب اسلام سے اس قدر بڑھا ہُوا ہے کہ اس کے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ان دونوں قوموں نے پچھلے دنوں میں مسلمانوں سے کیا ہے اس کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان کی حکومت میں باوجود یورپ کی تمام تسلّیوں کے مسلمانوں کو امن نہ ہوگا۔ اس طرح یورپ کے نئے تغیّرات کے ماتحت اور کئی علاقوں میں بھی مسلمانوں کو امن نہ ہوگا۔ پس اس خطرہ سے ان ممالک کے بھائیوں کو بچانے کے لئے فوراً بلا تاخیر ایک عالمگیر لجنہ اسلامیہ قائم ہو جانی چاہیئے۔ جس کا کام یہ ہو کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی مذہبی حالت کی اطلاع رکھے اور اس بات کی خبر رکھے کہ دُنیا کے

کسی علاقے میں مسلمانوں کو ظاہر و مخفی ذرائع سے اپنے مذہب کے تبدیل کرنے یا بصورتِ دیگر ہلاک ہو جانے پر تو مجبور نہیں کیا جاتا اور اس غرض کے لئے دنیا کے تمام ممالک میں ایسے مبلغ بھیجنے چاہئیں جو ہر جگہ کے مسلمانوں کو اپنے مذہب پر ثابت قدمی سے پابند رہنے کی تلقین کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی جگہ مسلمانوں کو جبرًا تو اسلام سے نہیں ہٹایا جاتا۔ خواہ وہ جبر ظاہری اسباب سے ہو خواہ مخفی اسباب سے۔ اور اس کی جستجو رکھیں اور جس وقت کوئی ایسی بات معلوم ہو فورًا امرکز کو ان کی اطلاع دیں تا کہ تمام متمدن دُنیا کو اس سے اطلاع دی جاوے۔ کیونکہ ظالم کو کس قدر بھی طاقتور ہو جب اسے معلوم ہو کہ میرا ظلم دیکھنے والے موجود ہیں تو اسے بہت کچھ دبنا پڑتا ہے اور اپنے نام کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"[1]

پھر آپ فرماتے ہیں:۔

میں اس جگہ یہ بھی اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مَیں نے بغیر اس امر کا انتظار کئے کہ دوسرے لوگ اس امر کے متعلق کیا فیصلہ کرتے ہیں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر دی ہے۔ اور مختلف ممالک میں دو دو آدمی اس غرض کے لئے بھیجنے کی تجویز کر دی ہے۔ اور اور میری جماعت کے جانبازوں کی ایک جماعت نے اپنے آپ کو اس غرض کے لئے وقف بھی کیا ہے جو عنقریب سہولتِ راہ میسّر آنے پر اپنے مفوّضہ علاقہ میں چلی جاوے گی ....

اس وقت اسلام کی ترقی کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے کہ ہم تبلیغ اسلام کے لئے کھڑے ہو جاویں۔ یورپ کو ترکوں سے نفرت جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں کسی بد انتظامی کی وجہ سے نہیں بلکہ درحقیقت اس کی وجہ یورپ کا یہ خیال ہے کہ اسلام تہذیب کا دشمن ہے اور وہ اس کو اپنی دنیا کا دشمن سمجھ کر جو اُن کو بہت عزیز ہے مٹانا چاہتے ہیں۔ پس جب تک یورپ کے دل سے بلکہ تمام مسیحی دنیا کے دل

---

[1] الفضل ، ۷ جون ۱۹۲۰ء صفحہ ۵ تا ۷

سے یہ خیال دُور نہ کیا جاوے گا اُسوقت تک ہرگز مسلمانوں کے مصائب دُور نہیں ہو سکتے۔ . . . .

پس اُٹھو اور اپنے جوشوں کے پانی کو یونہی زمین پر بہنے دینے کی بجائے تبلیغ اسلام کی نہر کے اندر محدود کر دو۔ تا ان کا کوئی فائدہ ہو اور ان سے کام لیا جا سکے۔ پانی جب سطحِ زمین پر بہہ جاتا ہے۔ تو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہی پانی جب نہر کی شکل میں بند کر دیا جاتا ہے تو اس سے ہزاروں ایکڑ زمین سیراب کی جا سکتی ہے اور آبشاریں بنا کر اس سے بجلی نکالی جا سکتی ہے۔ پس اے احبابِ کرام! ملک کے جوش کو بیہودہ طور پر ضائع نہ ہونے دو۔ بلکہ اس سے اسلام کی ترقی کے لئے کام لو اور پھر دیکھو کہ خدا تعالےٰ کی نصرت کس طرح نازل ہوتی اور اسلام کے جلال کو دنیا پر ظاہر کرتی ہے۔"[1]

آخر پر آپ نے اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے اپنے اس یقینِ محکم کا اظہار کیا کہ سیاسی غلبہ کے باوجود عیسائیت کے دن اب گنے جا چکے ہیں۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے ظہور کے بعد زمانے کے حالات بہرحال بدلیں گے اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں چنانچہ اس فقرے پر آپ نے مضمون کو ختم کیا کہ :۔

"خدا کی غیرت اس کے مامور کے ذریعہ سے ظاہر ہو چکی ہے۔ اور اب سب دنیا دیکھ لے گی کہ آئندہ اسلام مسیحیت کو کھانا شروع کر دے گا اور دنیا کا آئندہ مذہب وہی ہو گا جو اس وقت سب سے کمزور مذہب سمجھا جاتا ہے۔

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔"[2]

اس کانفرنس پر بھی چھ ماہ گذر گئے لیکن ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا!

تمام ہندوستان میں شور و غوغا تو برپا رہا لیکن ایک کوڑی کا فائدہ نہ ترکوں کو حاصل ہوا،

---

[1] الفضل ۷ر جون ۱۹۲۰ء صفحہ ۸۔ [2] ایضاً

نہ عالمِ اسلام کو۔ نعروں۔ ہُلڑ بازی اور گالی گلوچ نے اتحادی طاقتوں کو کچھ اور بھی مسلمانوں سے بدظن کر دیا لیکن ان کی دادرسی پر آمادہ نہ کیا۔ یہ دَور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے شدید بے چینی کا دَور تھا۔ جذبات مشتعل ہو چکے تھے۔ دینی غیرت جوش میں تھی اسلام کے لئے عوام الناس جان نذر کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ کچھ کر گزرنے کو جی چاہتا تھا۔ مگر کیا ہونا چاہیئے تھا اور کیا کرنا چاہیئے تھا اس کی کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ بالآخر یہ جوش و خروش اس مشہور تحریکِ ترکِ موالات پر مرتکز ہُوا جسے تحریکِ خلافت بھی کہا جاتا ہے اس وقت کے مسلمان رہنماؤں کی اکثریت اس بات پر متفق ہو چکی تھی کہ خلافت عثمانیہ کو از سرِ نو قائم کرنے اور ترکوں کو ان کے غصب شدہ حقوق دلانے کے لئے انگریزوں پر ایسا شدید سیاسی دباؤ ڈالنا چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کی خواہش کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جائیں چنانچہ آپس کی مشاورتوں کے بعد یہ طے کر لیا گیا کہ انگریزوں سے ترکِ موالات کی جائے جس کے معنے یہ تھے کہ ہر میدان میں عدم تعاون ہو۔ خطابات واپس کئے جائیں۔ فوجی اور سول نوکریوں سے استعفے دیئے جائیں۔ وکیل وکالت کی ڈگریاں واپس کر دیں۔ مسلمان طلباء کالجوں سے اُٹھ آئیں اور آئندہ کوئی طالب علم سکولوں اور کالجوں میں داخل نہ ہو سب سے بڑھ کر یہ کہ اہلِ ایمان کے لئے جہاں تک ممکن ہو وہ اپنی جائیدادیں فروخت کر کے پونجی بغل میں داب ہندوستان سے افغانستان کی طرف ہجرت کر جائیں۔ آج آپ کو یہ باتیں خواہ کیسی ہی عجیب کیوں نہ دکھائی دیں۔ کل انہی باتوں پر ہندوستان کے کم و بیش تمام مسلمان لیڈر متفق ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شمال سے جنوب تک کوئی ہنگامہ سا ہنگامہ تھا۔ مسلمانوں میں سے وہ سنجیدہ طبقہ جو اس تحریک کو ایک سنگین مذہبی اور سیاسی غلطی شمار کرتا تھا۔ محض ایک معمولی اور بے اثر اقلیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ کون تھا جو اسے لب کشائی کی اجازت دیتا۔ اور کس کی مجال تھی اور کسے یہ طاقت تھی کہ تحریکِ ترکِ موالات کے خلاف ایک لفظ تک زبان سے نکال سکے۔ اس زمانے کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی فکر کا گویا دوالہ نکل چکا تھا تس پر ظلم کی انتہا یہ تھی کہ عالمِ اسلام کی بہبود کے لئے اس ملک گیر تحریک کی قیادت عملاً مہاتما گاندھی کو سونپی جا رہی تھی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ترکِ موالات کی پٹی ہی مہاتما جی کی پڑھائی ہوئی تھی۔ مسلمان علماء کی مجلس میں وہ شریک ہوتے۔ ان کے جلسوں کی صدارت

کرتے اور انہیں خوب اس عزم میں پختہ کرتے کہ اسلام کی خدمت کا یہی وقت ہے لہذا اپنا سب کچھ قربان کر کے انگریز کا سر کچل کر رکھ دو۔ یہ صورتِ حال مسلمانانِ ہند کے لئے اتنی خطرناک تھی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ جیسا نڈر مجاہد اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس علم کے باوجود کہ اس موقع پر سچی اور درست بات کہنا مسلمانوں کی شدید دشمنی مول لینے کے مترادف ہے۔ آپ نے محض اسلام کی محبت اور مسلمانوں کی خیر خواہی سے مجبور ہو کر بیش قیمت نصائح اور علمی دلائل پر مشتمل وہ مشہور کتاب لکھی جو ترکِ موالات اور احکامِ اسلام ہی کے نام سے طبع کروا کر دانشوروں میں تقسیم کی گئی۔ آپ خوب جانتے تھے کہ آپ کا یہ مشورہ بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا لیکن آپ دُنیا کی پسندیدگی اور ناراضگی سے بے نیاز تھے اور اپنے ہر فعل کو محض رضائے الٰہی کی کسوٹی پر پرکھنے کے عادی تھے۔ اسی لئے آپ نے اپنی نصائح کے امکانی ردِّ عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مَیں جانتا ہوں کہ ترکِ موالات کے بانیوں کو میری یہ تحریر بُری لگے گی اور اُن کے فریب خوردہ ساتھی بھی اس پر غصّہ کا اظہار کریں گے۔ مگر اُن کی ہمدردی اور ان کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے کہ مَیں سچی سچی بات اُن کو سُنا دُوں۔ حق ایک سخت کڑوی چیز ہے اور بہت دفعہ انسان خود اپنے آپ کو حق سُنانے سے بھی ڈر جاتا ہے مگر ہم نے اپنی زندگیاں اسی لئے وقف کی ہوئی ہیں اور خدا کے بندوں کی ہدایت کا بار اپنے سروں پر اٹھایا ہے اور کسی کی مخالفت یا عداوت کی ہمیں پرواہ نہیں۔ طبیب کبھی بیمار کی سختی کو دیکھکر علاج کو ترک نہیں کرتا۔ پس ہم بھی اپنے کام سے باز نہیں رہ سکتے اور اپنے بھائیوں کی اصلاح سے مایوس نہیں ہیں۔"[1]

اس کتاب کے تعارفی کلمات میں بھی آپ صاحبِ دل اور اہلِ درد اصحاب سے اپیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"پس میری ان تمام اصحاب سے جو ملّتِ خیرِ انام سے محبت رکھتے ہیں

---

[1] ترکِ موالات اور احکامِ اسلام صفحہ ۸۳

اور اس کے احیاء کے متمنی ہیں درخواست ہے کہ وہ اس رسالہ کو
جہاں تک ہو سکے اپنے دوستوں، واقفوں، شناساؤں اور ہموطنوں
تک پہنچائیں اور اس خطرناک رَو کے روکنے میں پوری سعی کریں
جو اسلام کے بدنام کرنے کا باعث ہو رہی ہے اور مسلمانوں کی رہی
سہی طاقت کے مٹانے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ یہ وقت غفلت کا
نہیں ہے۔ اسلام پہلے ہی بہت صدمہ خوردہ ہے اور اس کی پاک
اور پُر امن تعلیم پر پہلے ہی نہایت میلے کچیلے غلاف ڈالے جا چکے
ہیں اب زیادہ تغافل قابلِ برداشت نہیں۔ پس اٹھو اور بلا کسی
ملامت کے خوف اور لوگوں کے طعنوں کے ڈر کے اس کی مدد کے
لئے کھڑے ہو جاؤ۔ بے شک لوگ آپ کو ترکِ موالات کی مخالفت
کی وجہ سے بُزدل کہیں گے اور خوشامدی نام رکھیں گے۔ لیکن
اگر اسلام کی محبت کے لئے آپ یہ کام کریں گے تو یہ باتیں آپ
کا نقصان نہیں کر سکتیں۔ وہ شخص بہادر نہیں ہوتا جو بُزدل کہلانے
سے ڈر جاتا ہے۔ اور نہ وہ بُزدل ہوتا ہے جو حق کو اس لئے نہیں
چھوڑ دیتا کہ لوگ اُسے بزدل کہیں گے۔ خاکسار مرزا محمود احمد"

اس نصیحت کا آخری فقرہ ہر دَور، ہر ملک اور ہر مذہب و ملت کے راہنماؤں کے لئے ایک مینارِ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے بہتر الفاظ میں ہم آپ کی صاحبِ عزم شخصیت کا تعارف کرانے سے قاصر ہیں۔ یقیناً وہ ایک بہادر شخص تھا جو بُزدل کہلانے سے کبھی نہیں ڈرا۔ اور کبھی اس نے حق کو اس لئے نہیں چھوڑا کہ لوگ اس کو بُزدل کہیں گے۔

تحریکِ ترکِ موالات پر آپ کا تبصرہ محض ایک مفید سیاسی مشورہ ہی نہیں بلکہ علومِ قرآنی کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے اور اسے پڑھے بغیر صحیح معنوں میں یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ آپ کا یہ دعویٰ کیا معنے رکھتا تھا کہ میری سیاست قرآن پر مبنی ہے آپ نے متواتر قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے مسلمان قیادت کی غلطیوں کی نشاندہی فرمائی۔ ان کے لائحہِ عمل کو سراسر غیر اسلامی ثابت کیا جو بظاہر اسلام کی بہبود کی خاطر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ آپ نے قرآن کریم سے اسے غلط

ثابت کیا اور عقلاً اسے خودکشی قرار دیا۔ اور تفصیل سے اس امر پر روشنی ڈالی کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانانِ ہند کو کیسے عظیم اور ہولناک نقصانات برداشت کرنے پڑیں گے۔ سب سے زیادہ افسوس آپ نے اس امر پر کیا کہ آج ملّتِ اسلامیہ کا راہ نما ایک ایسے شخص کو بنا لیا گیا ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے دائرہ سے کلیتہً آزاد ہے۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کی قیادت قبول کرنے پر اور ان کی بات کو حرفِ آخر قرار دینے پر احتجاج کرتے ہوئے آپ نے لکھا:۔

"کیا ترکِ موالات کے حامیوں کے پاس ان سوالوں کا ایک ہی جواب نہیں کہ مسٹر گاندھی نے چونکہ ایسا کہا اس لئے ہم اس طرح کرتے ہیں۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس طرح نہ کرو جس طرح مسٹر گاندھی کہتے ہیں۔ اگر کسی کے خیال میں مسٹر گاندھی کا پروگرام مفید اور قابلِ عمل معلوم ہوتا ہے تو وہ بے شک اس پر عمل کرے مگر مسٹر گاندھی کے قول کو قرآن کریم کیوں قرار دیا جاتا ہے شریعت اس کا نام کیوں رکھا جاتا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو لوگوں سے یہ کہو کہ چونکہ مسٹر گاندھی اس طرح فرماتے ہیں اس لئے اسی طرح تم کو عمل کرنا چاہیئے یہ کیوں کہتے ہو کہ شریعتِ اسلام کا یہ فتویٰ ہے۔ شریعتِ اسلام نے غیر مسلموں سے ترکِ موالات کرنے کا جن شرائط کے ساتھ حکم دیا ہے وہ شرائط تو جب بھی کسی قوم میں پائی جائیں اس سے ہر قسم کی امداد لینی یا اس کو کسی قسم کی مدد دینی ناجائز ہو جاتی ہے سوائے اس کے کہ تذلّل کی امداد ہو یعنی ایسی مدد ہو جس میں ہم حاکم ہوں اور وہ ماتحت ہوں۔ پس اگر یہ فتویٰ وہی ہے جو خدا تعالےٰ نے دیا ہے اور وہی حالات ہیں جن میں ترکِ موالات کرنا اللہ تعالےٰ نے فرض قرار دیا ہے۔ تو پھر پروگرام مقرر نہیں ہو سکتے۔ کسی قسم کی موالات معاف نہیں ہو سکتی۔ نفع اور نقصان کو نہیں سوچا جا سکتا۔ لیکن اگر یہ پروگرام شریعتِ اسلام کا نہیں بلکہ مسٹر گاندھی کا ہے تو پھر اس کو شریعت

کی طرف منسوب کرنا اور آیاتِ قرآنیہ سے اس کا استدلال کرنا ایک خطرناک گناہ ہے۔ اگر ترکِ موالات کے حامی اسے شریعت کا فرض مقرر کرتے ہیں تو پھر اس طرح عمل کریں جس طرح کہ شریعت نے کہا ہے اور اگر اسے مسٹر گاندھی کا ارشاد قرار دیتے ہیں، تو عوام کو قرآن کریم کے نام سے دھوکا نہ دیں اور اسلام کا تمسخر نہ اُڑائیں۔"[1]

قرآن کریم کی متعدد آیات سے استدلال کرنے کے علاوہ آپ نے احادیثِ نبویّہ سے بھی متعدد استدلال کیئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے جو ارشاداتِ عالیہ غلط رنگ دے کر پیش کیئے جا رہے تھے اُن کے اصل معانی بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان فرمائے۔ پھر ایک دوسرے موقع پر مسٹر گاندھی کی اقتداء کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے آپ نے حسب ذیل الفاظ میں مسلمانوں کی دینی حمیّت کو جھنجوڑا:۔

"مذہبی معاملہ میں مسلمان مسٹر گاندھی کی اقتداء میں

کیا تم کو یہ نظر نہیں آتا کہ تم اس صحیح راستہ کو ترک کر کے کہاں کہاں دھکے کھاتے پھرتے ہو؟ اوّل تو تمام علماء و فضلاء کو چھوڑ کر ایک غیر مسلم کو تم نے لیڈر بنایا ہے۔ کیا اسلام اب اس حد تک گر گیا ہے کہ اس کے ماننے والوں میں سے ایک روح بھی اس قابلیّت کی نہیں ہے کہ اس طوفان کے وقت میں اس کشتی کو بھنور سے نکالے اور کامیابی کے کنارے تک پہنچائے۔ کیا اللہ تعالےٰ کو اپنے دین کی اس قدر غیرت بھی نہیں رہی کہ وہ ایسے خطرناک وقت میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا شاگرد اور آپ کے خدام سے ہو؟ اور جو اس وقت مسلمانوں کو اس راستہ پر چلائے جو ان کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے؟ آہ! تمھاری گستاخیاں یہ کیا رنگ لائیں؟ پہلے تو تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مسیح ناصری کا ممنونِ منت بنایا کرتے تھے اب مسٹر گاندھی کا مرہونِ احسان بناتے ہو؟ اگر یہ درست ہے کہ ترکِ موالات سے ایک دو سال میں تم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

[1] ترکِ موالات اور احکام اسلام صفحہ ۵۵-۵۹

تو اسلام کی دوبارہ زندگی یقیناً مسٹر گاندھی کے ہاتھوں میں ہوگی اور نعوذ باللہ من ذالک ابدالآباد تک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سرِ مبارک بارِ احسان سے اُن کے سامنے جھکا رہے گا۔ کیونکہ مسٹر گاندھی نے آپ سے کچھ نہیں لیا اور آپ گویا سبھی کچھ مسٹر گاندھی کی عطا سے پائیں گے۔ اے کاش! اس خیال کے دل میں آنے سے پہلے تم نے اس دل ہی کو کیوں نہ نکال کر باہر پھینک دیا؟ .... تم نے خدا کے محبوب کو حضرت مسیح علیہ السلام کا احسان مند بنا کر اس کی گردن اس کے سامنے جھکائی تھی خدا نے تمہاری گردنوں کو ہر جگہ مسیحیوں کے آگے جھکا دیا ہے۔ پس یہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہتک کا ثمرہ ہے۔ اب تم دوسری غلطی کرنے لگے ہو اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مسٹر گاندھی کا ممنونِ احسان بنانے لگے ہو۔ حضرت مسیح علیہ السلام تو خیر ایک نبی تھے۔ اب جس شخص کو تم نے اپنا مذہبی رہنما بنایا ہے وہ تو ایک مومن بھی نہیں۔ پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس ہتک کا نتیجہ پہلے سے بھی زیادہ سخت دیکھو گے اور اگر باز نہ آئے تو اس جرم میں مسٹر گاندھی کی قوم کی غلامی اس سے زیادہ تم کو کرنی پڑے گی جتنی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اُمت کی غلامی تم کہتے ہو کہ نہیں کرنی پڑی ہے۔"[1]

اس کتاب میں آپ نے دوبارہ مسلمانوں کی توجہ اس مرکزی نقطہ کی طرف مبذول کروائی کہ مسلمانوں کی مشکلات کا واحد حل تبلیغِ اسلام ہے۔ مسلمانوں پر جتنی مصیبتیں ٹوٹیں تبلیغ نہ کرنے کے نتیجہ میں ٹوٹیں اور جو عالی مراتب انہوں نے حاصل کئے وہ ان کی تبلیغی کوششوں ہی کا ثمرہ تھا۔ چنانچہ عارضی اور سطحی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ان کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی طرف پھیری کہ جب تک تم تبلیغ کا جہاد شروع نہیں کروگے تمہاری کھوئی ہوئی عظمت تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔ تبلیغ کی طرف مسلمانوں کو ایک نئے انداز سے بُلاتے ہوئے آپ نے لکھا:۔

---

[1] ترکِ موالات اور احکام اسلام صفحہ ۸۵-۸۶

اس وقت اس مجرب نسخۂ موالات کو استعمال کرو جو ہلاکو خاں کے ہاتھ سے عباسی سلطنت کے مٹنے پر استعمال کیا گیا نہ کہ اسکے برعکس ترکِ موالات کا نسخہ

"اے عزیزو! ہوشیار آدمی کسی سبق کو بھلاتا نہیں اور دانا کسی عبرت کی بات کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اس فتنہ کے وقت میں یہ تو سوچو، کہ آج سے پونے سات سو سال پہلے اسلامی حکومت کو موجودہ صدمہ سے بہت زیادہ صدمہ پہنچا تھا۔ اب تو کچھ نہ کچھ ڈھانچہ موجود بھی ہے اس وقت تو ہیولیٰ بھی باقی نہ رہا تھا۔ اس وقت کیا ہتھیار تھا جو کام آیا تھا اور کیا گُر تھا جس سے یہ سوال حل ہوا تھا۔ ایک دفعہ کا تجربہ شدہ نسخہ اس قسم کی بیماری کے دوبارہ ظاہر ہونے پر اس بات کا مستحق ہے کہ سب سے پہلے اسی کا تجربہ کیا جائے۔ غور تو کرو کہ جب ترکوں نے خلافتِ عباسیہ کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ جب ان کے ٹڈی دل لشکروں کا مقابلہ کرنے والا مسلمانوں میں کوئی باقی نہ رہا تھا۔ اور جب اسلام کے مقدس مقامات ایک لاوارث کی طرح دشمنوں کے رحم پر تھے اس وقت کیا علاج تھا جو ہمارے آباء نے سوچا تھا۔ اور کیا وہ اس علاج میں کامیاب ہوئے تھے یا ناکام۔ اگر تم کو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا تدبیر اختیار کی تھی اور اگر تم اس سبق کو فراموش کر چکے ہو تو سنو۔ اس وقت انہوں نے موالات کے ہتھیار سے نہ کہ ترکِ موالات کے ہتھیار سے ان پر حملہ کیا تھا۔ اور آخر کفر کو فنا کر کے اسی کے جسم اور اسی کے پوست اور اسی کے خون سے اسلام کے لئے ایک نیا جسم تیار کر دیا تھا۔ جس میں اسلام کی رُوح نے دنیا کو پھر اپنی جادو بیانی کا والہ و شیدا بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت کے علماء نے جو اس وقت کے علماء سے کہیں علم و فضل میں بڑھ کر تھے اور جن کے عمل کا نتیجہ ان کی رائے کے صائب ہونے پر

تصدیق کی مُہر لگا چکا ہے۔ یہ راہ اختیار کیا تھا کہ وہ ترکوں کے درباروں اور ان کی کھلی مجالس میں گھس گئے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کے جسموں پر فتح پانے والوں کے دلوں پر فتح پانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ آخر اس موالات کا یہ اثر ہُوا کہ اس بادشاہ کا پوتا جس نے بغداد کی اسلامی حکومت کو تباہ کیا تھا اور اٹھارہ لاکھ مسلمان کے خون سے اس سرزمین کو رنگ دیا تھا اسلام کی غلامی میں داخل ہُوا۔ اور خدائے واحد لاشریک کے عبادت گزاروں میں شامل ہو کر ایک نئی اسلامی حکومت کا بانی ہُوا جس کے آثار اب موجودہ جنگ میں آکر مٹے ہیں بلکہ اب بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں۔ وجہ کیا ہے کہ اب وہی نسخہ نہیں برتا جاتا۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس علاج کیا جاتا ہے۔ اگر اُس وقت کے مسلمانوں نے موالات کو اختیار کر کے اسلام کی حفاظت کی تھی، تو آج ترکِ موالات کی کیوں تعلیم دی جاتی ہے۔ کیا کوئی کامیاب نسخہ کو بھی ترک کیا کرتا ہے؟ کیا اب اسلام میں ہی ایسا جذب نہیں رہا کہ وہ فاتحین کے دلوں کو مسخر کر سکے؟ یا تم میں ہی وہ نورِ ایمان نہیں رہا جو تمہارے آباء میں تھا؟ ان کی باتوں کا دلوں پر اثر ہوتا تھا لیکن تمہاری باتیں بالکل بے اثر ہیں۔ کیا سبب ہے کہ وہ محبت سے دشمن کو دوست بنا لیتے تھے۔ اور تم دوست کو عداوت سے دشمن بنانا چاہتے ہو۔ یا دوست نہ سہی دشمن کو اور بھی زیادہ دشمن بنانا چاہتے ہو۔"[1]

بہرحال جیسا کہ آپ کو خدشہ تھا اور تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ آپ کی یہ تنبیہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی نہ تو مسلمان خواص ہی نے اس طرف توجہ کی نہ عوام اس سے استفادہ کر سکے۔ عوام تو پھر عوام تھے۔ حیرت ہے کہ اس زمانے کے دانشوروں کو کیا ہو گیا تھا۔ آج کا قاری اس دَور کے شب و روز کا صحیح تصور قائم نہیں کر سکتا۔ جب تک موازنہ کی خاطر ان تصورات اور حالات کی کچھ جھلکیاں نہ دکھائی جائیں جن میں دوسرے مسلمان خواص و عوام زندگی بسر

---

[1] ترکِ موالات اور احکام اسلام ص ۸۵-۸۶

کر رہے تھے۔ ان پر نظر ڈالنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ حضرت خلیفۃ المسیح مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کس مشکل کام پر ہاتھ ڈالا اور کیسی جرأت اور حوصلے اور عزم کے ساتھ تنِ تنہا ہلاکت خیز طوفانوں کا رخ بدلنے کی کوشش کی ۔ اس تاریک دور میں جب ساری قوم ظلمات کی طرف بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے لپکی چلی جاتی تھی ایک آپ ہی کی تنہا آواز تھی جو قادیان کے روشن مینار سے بلند ہوئی اور بروقت اسلامیوں کو ہلاکت کے ان گڑھوں سے خبردار کیا جن کی طرف وہ بگٹٹ دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ مولانا عبد المجید سالک اس زمانے کی آنکھوں دیکھی روئداد پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب "سرگزشت" کے صفحہ ۱۱۳ پر مسلمانوں کی خلافت موومنٹ کے جلسوں کا ایک منظر حسب ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

"اسی رات کانگریس کے پنڈال میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا اس وقت بھولتا ہوں کہ صدر گاندھی جی تھے یا مولانا محمد علی ۔ بہرحال تمام اکابر اس میں شریک ہوئے۔ اسٹیج پر گاندھی جی۔ تلک مسز اینی بسنٹ ۔ جیکر۔ کیلکر۔ محمد علی ۔ شوکت علی ۔ ظفر علی خاں۔ سید حسین ۔ مولانا عبد الباری۔ مولانا فاخر الہ بادی۔ مولانا حسرت موہانی اور بہت سے دیگر راہ نما موجود تھے۔ مولانا محمد علی نے پہلے انگریزی میں تقریر شروع کی اور کہا کہ میں کچھ دیر تک انگریزی میں تقریر کروں گا۔ تاکہ جو اکابرِ ملک اردو نہیں سمجھتے وہ خلافت کے مسلمانوں کے موقف کو سمجھ لیں اس کے بعد اردو میں تقریر کروں گا ۔ مولانا کی تقریر بے نظیر تھی ۔ نہ صرف زبان اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بلکہ مطالب کے لحاظ سے بھی پورے مسئلے پر حاوی تھے اور جذبات انگیزی کی کیفیت اس فقرے سے معلوم ہوتی ہے کہ "ہمیں اب اس ملک سے ہجرت کر جانے کے سوا اور کوئی شرعی چارہ باقی نہیں ہے اس لئے ہم اس ملک کو چھوڑ جائینگے اور اپنے مکانات اپنی مساجد اپنے بزرگوں کے مزارات سب بطور امانت اپنے ہندو بھائیوں کو سونپ جائیں گے۔ تا آنکہ ہم

پھر فاتحانہ اس مُلک میں داخل ہو کر انگریزوں کو نکال دیں اور اپنی امانت اپنے بھائیوں سے واپس لیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہندو بھائی جن کے ساتھ ہم ایک ہزار سال سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری اتنی خدمت سے پہلو تہی نہ کریں گے۔"

ان کے بعد بریلی کے ایک بنسی دھر پاٹھک کھڑے ہوئے ان کی تقریر بہت پُر جوش اور بے حد دلچسپ تھی۔ انہوں نے مولانا محمد علی کے "نہلے پر دہلا" یوں مارا کہ اگر مسلمان بھائی اپنی شریعت کے احکام کے تحت اس ملک سے ہجرت کر جانے پر مجبور ہیں تو ہندو بھی یہاں رہ کر کیا کرینگے۔ اگر مسلمان چلے تو ہندو جاتی بھی ہجرت میں مسلمانوں کا ساتھ دے گی اور ہم اس ملک کو ایک بھائیں بھائیں کرتا ہُوا ویرانہ بنا دیں گے۔ تاکہ انگریز اس ویرانہ سے خود ہی دہشت کھا کر بھاگ جائیں۔

کس قدر عقل سے دُور باتیں ہیں۔ لیکن جذبات کی دنیا نرالی ہے۔ اس وقت جلسے کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگ چیخیں مار مار کر رو رہے تھے اور خلافت کانفرنس مجلس عزا بن گئی تھی۔" [1]

اُس وقت مسلمانوں کو اس جذباتی ماحول میں جس قسم کے فرشتے نظر آ رہے تھے اُسے ہم فریبِ نظر کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مسز اینی بسنٹ ایک انگریز خاتون سیاستدان جب تحریک خلافت کے اس عظیم اسلامی سٹیج پر تقریر کے لئے تشریف لائیں تو بقول سالک صاحب

"ان کا سفید سر۔ سفید چہرہ اور سفید لباس دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اُتر آیا ہے۔" [2]

گاندھی جی اُن دنوں صرف ہندوؤں ہی کے نہیں مسلمانوں کے بھی مہاتما بن چکے تھے۔ اور شہدائے اسلام کے معاملات غور و خوض کے لئے اُنہی کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔ ہندو مسلم مذہبی اتحاد کا وہ عالم تھا کہ دینِ الٰہی کے موجد اکبر کی رُوح بھی وہ نظارے دیکھ کر اگلے جہان میں پھڑک رہی ہوگی۔ مولانا سالک صاحب لکھتے ہیں:۔

"چند روز کے بعد گاندھی جی آئے۔ بہت عظیم الشان جلسہ ہُوا۔

---

[1] سرگزشت مصنفہ عبدالمجید سالک صفحہ ۱۰۸-۱۰۷ — [2] ایضاً صفحہ ۱۰۸

گاندھی جی جلسہ شروع ہونے سے پہلے دفتر زمیندار میں تشریف لائے وہ بعض خلافتی رہنماؤں سے گفتگو میں مصروف تھے اور میں چلکوٹ گورے اور حبیب اللہ خاں مہاجر شہید کے متعلق کاغذات لئے گاندھی جی کے سر پر کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے سارا معاملہ انہیں سمجھایا۔ . . . .

اتنے میں ہزارہا حاضرین جلسہ (بھی) تکلیفِ انتظار سے مضطرب ہوکر دفتر "زمیندار" کے سامنے سڑک پر جمع ہوگئے اور فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔ مہاتما گاندھی جی کی جے۔ ہندوستان کی جے۔ ہندو مسلمان کی جے۔ بندے ماترم۔ اللہ اکبر۔ ست سری اکال۔ آخر گاندھی جی اُٹھے اور جلسہ میں شامل ہونے کے لئے چلے۔ رضا کاروں نے ہجوم میں سے راستہ نکالا۔ گاندھی جی جلسہ گاہ میں پہنچے تو جوش و خروش کی انتہا نہ تھی۔ پہلے دوسرے لیڈروں نے تقریریں کیں۔ اس کے بعد گاندھی جی نے مجمع کو خطاب کیا اور مولوی ظفر علی خاں کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے وہ فقرہ کہا جو یار لوگوں کی محفلوں میں مدّت تک سرمایۂ قہقہہ بنا رہا۔ "مولوی جیھر آلی کھاں اپنا پھرج بجاؤ"

چند ہفتوں کے بعد گاندھی جی پھر تشریف لائے۔ اس مرتبہ اُن کے ساتھ رہنماؤں کی پوری جماعت تھی۔ . . . . سِکھ مولانا ابوالکلام کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے۔ ہندو مولانا محمد علی کے چرنوں کی دھول آنکھوں سے لگاتے تھے اور مسلمان گاندھی جی کی پذیرائی یوں کرتے تھے گویا کسی خدا رسیدہ ولی نے لاہور کو اپنے قدوم سے مشرف فرمایا ہے۔ بہت شاندار تقریریں ہوئیں اور اہلِ لاہور کو یقین ہو گیا کہ اب خلافت کی بحالی اور مُلک کی آزادی کوئی دن کی بات ہے۔" [1]

اُدھر مسلمان ایک ہندو "مہاتما" کی قیادت میں ایک خیالی جنّت کے خواب دیکھ رہے تھے اور اسے ایک ایسا خدا رسیدہ ولی قرار دے رہے تھے جو صدیوں کے بعد عالمِ اسلام کو نصیب

---

[1] سرگزشت مصنفہ عبدالمجید سالک صفحہ ۱۲۴-۱۲۵

ہوا تھا۔ اُدھر قادیان کی ایک چھوٹی سی بستی میں ایک وجود اس غم میں گھُلا جا رہا تھا اور اپنے نفس کو ہلاک کر رہا تھا کہ کاش یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام خود اپنے آقا کی ہتک اور گستاخی کا موجب بن رہے ہوں اور ایک ہندو آقا کے چرنوں پر اسلام کا سر جھکانے کو ہی اسلام کی سربلندی سمجھ رہے ہوں۔ کبھی وہ ان کو غیرت کے کچوکے دیتا۔ کبھی قرآنی تعلیم اُن پہ آشکار کرتا۔ کبھی سنّتِ رسُولؐ سے آگاہ فرماتا اور کبھی تاریخ اسلام سے عبرت آموز واقعات پڑھ کر سُناتا اور کبھی بصد منّت اور کبھی پُرشوکت انتباہات کے ساتھ کبھی خدا کے جلال سے ڈرا کر اور کبھی اس کے انعامات کی ترغیب دیتے ہوئے انہیں واپس صراطِ مستقیم پر بلانے کے لئے کوشاں تھا۔ وہ اس فکر میں شب و روز غلطاں و پیچاں تھا کہ کاش اب بھی مسلمان کی آنکھ کھُلے اور وہ حقیقتِ حال دیکھنے اور سمجھنے کا اہل ہو سکے۔ مگر صد حیف کہ ایسا نہ ہونا تھا اور نہ ہُوا۔ جنوب مشرق سے شمال مغرب کی سمت چلنے والی بادِ سموم کتنے ہی نونہالوں کو اپنے ساتھ اُڑا لے گئی۔ "کابل چلو" کا شور بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔ مسلمان عوام کے قافلے وطنِ مالوف کو چھوڑ کر کابل کی طرف روانہ ہونے لگے۔ ہجرت ہوتی رہی۔ گھر لُٹتے رہے۔ عمر بھر کی پونجیاں برباد ہوتی رہیں۔ مسلمان کی دولت ہندو کی ایسی امانت بنتی رہی جسے کبھی واپس لوٹ کر نہ آنا تھا۔ مسلمان بچّے تعلیم سے دل برداشتہ ہو کر گلیوں میں آوارہ پھرنے لگے۔ مسلمان وکلاء عدالتوں سے دست کش ہو گئے اور ہندو ان کا خلاء پُر کرنے لگے۔ مسلمان ملازمتوں سے مستعفی ہونے لگے تو ہندو آگے بڑھ بڑھ کر اپنے نام خدمتِ انگریز کے لئے پیش کرنے لگے۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک مسلمان ملازمت سے استعفےٰ دیتا تو دس ہندوؤں کی درخواستیں اس کو پُر کرنے کے لئے آپہنچتیں لیکن صد حیف کہ وہ سادہ لوح مخلص مسلمان جن کو دین اور شریعت کا ذاتی علم کچھ نہ تھا مسلمان علماء کے فتووں پر ایمان لاتے ہوئے جب سب کچھ لُٹا کر افغانستان پہنچے تو ان کا استقبال پھول نچھاور کر کے یا ہار پہنا کر نہیں کیا گیا۔ کسی نے دف بجا بجا کر ان کی آمد پر تہنیّت کے گیت نہیں گائے۔ افسوس صد افسوس کہ ان لُٹے ہوئے خستہ حال مخلصین پر کابل کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور وہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اس حال میں اپنے وطن کو لَوٹے کہ کئی تن کے کپڑوں سے بھی محروم ہو چکے تھے اور کئی سفر کی صعوبتوں سے راستہ ہی میں دم توڑ گئے اور پھر ان کو اپنا وطن دیکھنا نصیب نہ ہُوا۔ بہت سے جو واپس آئے

ان کو سر چھپانے کے لیئے کوئی جگہ نہ ملی۔ خلوص اور محبت اور دین کے لیئے قربانی کا وہ جوش وخروش جو خلافت موومنٹ کے دوران ہندو مسلم راہنماؤں کی چرب زبانیوں نے پیدا کیا تھا اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ کون تھا جو ان اجڑے ہوئے لٹے پٹے مہاجرین کو گھر لا کر دو وقت کی روٹی میں اپنا شریک کرتا۔ فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو کا یہ قول یقیناً اس موقع پر پوری صداقت کے ساتھ چسپاں ہو رہا تھا کہ

"یہ مخلوق آگ کی طرح بھڑکتی ہے راکھ کی طرح ڈھیر ہو جاتی ہے"۔

وہی مسلمان جو مرزا بشیر الدین محمود احمد کی آواز پر کان دھرنا بھی اپنی ہتک سمجھتے تھے اور اس جرم کی پاداش میں کہ کیوں ترکی خلیفہ کو خلیفۃ المسلمین تسلیم نہیں کیا گیا اور کیوں مسلمانوں کو قرآن وحدیث کی صحیح تعلیم بتا کر ترکِ موالات سے اجتناب کا مشورہ دیا گیا۔ آپ کی جماعت کو ناحق طرح طرح سے دکھ دینے ہی کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ ان کے غیظ وغضب کا رُخ تحریکِ خلافت کے راہنماؤں نے پہلے تو کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کی طرف موڑ دیا اور سب الزام ترکی کی بے دین قیادت پر دھرا جانے لگا۔ لیکن جب واقعات مزید نتھر کر سامنے آئے تو عوامی غیظ وغضب نے ایک بار پھر رُخ پلٹا اور بالآخر تحریکِ خلافت کی کہانی ان گالیوں پر جا کر ختم ہوئی جو بعد ازاں مدت تک سابق خلیفۃ المسلمین سلطان عبد الحمید کو دی جاتی رہیں

افسوس ہوش آیا بھی تو اس وقت جب گھر جل چکا تھا اور وہ گولی چل چکی تھی جو آدھے راستے سے واپس نہیں آیا کرتی۔ مسلمان قیادت کی اس پشیمانی کی کیفیت کا کچھ اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کی حسب ذیل تحریر سے لگایا جا سکتا ہے:۔

"کار فرما دماغوں کے لیئے نازک گھڑیاں روز نہیں آتیں لیکن جب آتی ہیں تو انہی میں اصلی آزمائش ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک گھڑی تھی جب پہلے پہل انقلابِ خلافت کی خبریں ہمارے دماغوں سے ٹکرائیں۔ یہی اس بات کی آزمائش کا وقت تھا کہ کہاں تک ہم میں دماغی قوتِ فعال پیدا ہوئی ہے؟ کہاں تک ہم نے ایسے معاملات کو سوچنا سمجھنا اور ان کی نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونا سیکھا ہے؟ کہاں تک ہم میں یہ طاقت پیدا ہوئی ہے۔ کہ دوستوں کی غلطی اور دشمنوں کی شماتت میں پھنس کر راہِ عمل گم نہ کریں؟ ضرورت تھی کہ ہم میں جو لوگ صاحب فکر وعمل تھے۔ کامل حزم واحتیاط سے کام

لیتے۔ دل اور زبان دونوں کی لگام کھنچی رہتی، فوری تاثر، ہیجانی جذبات انفعالی انفجار اور بدحواسانہ جلد بازی کی جگہ تدبر و دانشمندی اور ضبط فکر و اعتدال رائے کا سنجیدہ مظاہرہ کیا جاتا۔ ایک ایسے اہم معاملہ پر طبع آزمائی کرنے میں اگر تھوڑی سی دیر ہو جائے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑتی۔ لیکن جلد بازی اور بے لگامی سے خطرناک اور لاعلاج ٹھوکریں لگ سکتی ہیں۔ فرانسیسی ضرب المثل ہے۔"جو گولی چل چکی وہ آدھے راستے سے واپس نہیں آئے گی اگرچہ واپسی کے لئے تم کتنے ہی بلاوے بھیجو۔" افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گولی چل گئی اور آزمائش کے نتیجہ پر ہمارے لئے کوئی مبارک باد نہیں۔" [1]

کتاب"مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی" سے میاں محمد مرزا دہلوی کا ایک اقتباس درج ہے جن پر یہ طوفان گزر جانے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ یہ ایک سیاسی بحران تھا جس نے مسلمانوں کی قومی خود داری کا خاتمہ کرکے رکھ دیا۔ لیکن ستم بالائے ستم یہ کہ

"یہ ہندوؤں کا پروگرام تھا۔ ہندو ہی اس کے رہنما تھے۔ مسلمانوں کی حیثیت اس ایجی ٹیشن میں ان کے آلہ کار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت تک ان سے کام لیا جب تک انہیں ضرورت رہی اور اس وقت ایجی ٹیشن بند کر دیا جب ان کی ضرورت ختم ہو گئی۔" [2]

حقیقتِ حال خواہ کچھ بھی ہو مسلمانانِ ہند کی سیاست کا یہ دَور مستقبل کے مورخ کی نگاہ میں ہمیشہ ناقابلِ فہم اور قابلِ شرم قرار پائے گا۔ لیکن وہ بڑے تعجب کے ساتھ اس حقیقت کا اقرار کرنے پر بھی مجبور ہو گا کہ جہاں برِصغیر کے بڑے بڑے مسلمان رہنما ٹھوکر کھا گئے اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹکنے لگے وہاں اسلام کا ایک مایۂ ناز اور صاحبِ بصیرت فرزند ایسا بھی تھا جس نے ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں اُجالے کی ایک شمع روشن کئے رکھی۔

تحریکِ خلافت کے اس ہنگامہ خیز دَور میں آپ کا کردار بہت حد تک محض ایک مشیر کا رہا یعنی ایک ایسے مشیر کا جس کی تنبیہات اور نصائح پر بروقت عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں ملتِ اسلامیہ نے بہت کچھ نقصان اُٹھایا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عملی جدوجہد سے ہٹ کر اور سیاست

---

[1] تبرکات آزاد مرتبہ مولانا غلام رسول مہر صفحہ ۲۴۳۔ [2] مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی صفحہ ۱۰۹

کی ہنگامہ خیزیوں میں کودے بغیر دُور بیٹھے ہوئے کسی کا اچھے مشورے دے دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ جب ایک سیاست دان عملی میدان میں قدم رکھتا ہے۔ تو ایسی مشکلات اُسے درپیش ہوتی ہیں کہ ان کے حل کے لئے اسے بعض اوقات بڑے بڑے سنہری اصول بھی قربان کر دینے پڑتے ہیں۔ یہ اصولوں کی باتیں محض دُور کی آنکھ کے دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ عمل کی دنیا میں بعض اوقات ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ خصوصًا اعلیٰ اخلاقی اصولوں کو صحیح و سالم قائم رکھنا سیاست کے دنیوی خارزاروں میں تو کسی طرح ممکن نہیں۔ لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اس اعتراض کی لغویت کو اپنے عمل سے آشکارا کر چکی تھی۔ آپ کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آئے جبکہ آپ کو عملی سیاست میں بھی دخل دینے کا موقع ملا اور اپنے اصولوں کو قربان کئے بغیر بلکہ انہی کی مدد سے آپ نے حیرت انگیز نتائج حاصل کئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ایسے کئی مواقع پیدا ہوئے کہ جب آپ کو عملاً اسلام کی سربلندی اور ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کی خاطر ایسے میدانوں میں اقدام کرنا پڑا جو بظاہر سیاسی نوعیت کے تھے اور دنیا کی اصطلاح میں ان کا تعلق یقیناً سیاست ہی سے تھا۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے خالصتہً دینی مصالح اور مقاصد کے پیشِ نظر ان میں دلچسپی لی اور اس دَوران بلا تأمّل دینی اصولوں پر سختی سے کاربند رہے اور سیاسی مصالح پر انہیں کبھی قربان نہ ہونے دیا۔

ایسے مواقع بھی آپ کی زندگی میں آئے جبکہ آپ نے جماعت احمدیہ کی کوششوں کو مسلمانوں کی کسی وسیع تحریک کے تابع کر کے ملتِ اسلامیہ کی عظیم الشان خدمت سرانجام دی اور ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ جب خود مسلمانانِ ہند نے کسی تحریک کی ذمہ داری آپ کو سونپی اور تمام مسلمانوں کی راہ نمائی کرتے ہوئے آپ نے انہیں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ پھر ایسے مواقع پر بھی آپ کو خدمت کی توفیق ملی جب ہندو مسلم نزاع کی چنگاری مشتعل ہو کر سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لینے والی تھی۔ مگر آپ کی فراست اور تدبّر نے ایسی راہِ عمل تجویز کی جس سے فتنہ و فساد کی آگ بھی ٹھنڈی پڑ گئی اور بے ضرورت قربانی اور نقصان کے بغیر اہلِ اسلام کا مقصد بھی حاصل ہو گیا۔ یہ ایک دلچسپ اور طویل داستان ہے جس کا تذکرہ آگے چل کر موقع اور محل کے مطابق کیا جائے گا۔ فی الحال ہم اس سے ملتے جلتے ایک موضوع پر آپ کی عملی جدوجہد کی ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جو فی الحقیقت تو مذہبی جہاد کی حیثیت رکھتی تھی

لیکن بعض دوسرے پہلوؤں سے اُسے ملّی سیاست کی ایک عظیم تحریک بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہماری مراد تاریخِ ہند کے اس ولولہ انگیز دَور سے ہے جس میں تحریکِ شدھی نے جنم لیا۔ اور بہت جلد ایک ایسی عظیم اور اہم کشمکش میں تبدیل ہوگئی کہ تمام ہندوستان کی نظروں کا مرکز بن گئی۔ یہ وہ موقع ہے جبکہ محض مشوروں پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ عملاً ایک فعّال قومی تحریک کی آپ نے قیادت کی۔ یہ وہ موقع ہے جبکہ آپ کے سوا دوسری متعدد مسلمان جماعتیں بھی اسی مقصد کے حصول کے لئے متوازی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ یہ وہ موقع ہے جبکہ جذبات میں طوفان اور دلوں میں جوش تھا اور دشمن منہ زور اور طاقتور تھا اور کوئی ضابطۂ اخلاق اس کے ہاتھ روکنے یا اس کی چالوں کو محدود کرنے والا نہ تھا۔ اس وقت آپ نے ان اصولوں کا پابند رہتے ہوئے جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ میدانِ کارزار میں سعیٔ مسلسل اور عملِ پیہم کے گھوڑے دوڑا دیئے۔ یہ باب آپ کے طرزِ فکر و عمل کا غیروں کے طرزِ فکر و عمل سے موازنہ کرنے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ اور آپ کی عظیم قائدانہ صلاحیتیں اس موقع پر امتیازی شان کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ آیئے ہم کچھ دیر کے لئے تحریکِ شدھی کے محرکات اور عوامل اور آغاز و انجام پر نظر ڈالیں۔

تحریکِ شدھی

بیسویں صدی کے اوائل میں بعض مخلص مسلمان رہنماؤں کو یہ رُوح فرسا خبر ملی کہ ندوۃ العلماء اور علی گڑھ کی "مسلم یونیورسٹی" کے ارد گرد بسنے والے بعض ملکانہ راجپوتوں کو ہندو پنڈت "شُدھ" کرکے اسلام سے منحرف کر رہے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کو اس خبر سے ایسا شدید دھچکا لگا کہ ان کا غم وغصہ بے ساختہ ان لفظوں میں ڈھل گیا:۔

"جس وقت مَیں یہاں سے چلا ہوں میری جو حالت تھی، یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے کہ مَیں نے اس وقت کوئی گالی نہیں اُٹھا رکھی تھی جو مَیں نے ان ندوہ والوں کو نہ سُنائی ہو گی کہ اے بے حیاؤ! اور اے کم بختو! ڈوب مرو۔ یہ واقعات پیش آئے ہیں۔ ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڑھ کو بھی پھونک دو۔ یہی الفاظ مَیں نے اُس وقت بھی کہے تھے اور آج بھی کہتا ہوں۔"[1]

اس صورتِ حال سے مؤثر طور پر نمٹنے کے لئے انہوں نے اپریل ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے مقام پر تمام ہندوستان کے مسلمان مشاہیر کی ایک کانفرنس طلب فرمائی۔ علامہ شبلی کے سوانح نگار مولانا سیّد سلیمان ندوی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"مولانا یہ چاہتے تھے کہ اشاعت کے کام تمام فرقے مل کر کریں۔ اسی لئے مرزا بشیر الدین محمود احمد (صاحب) جو اب خلیفہ قادیان ہیں اور خواجہ کمال الدین صاحب تک کی شرکت سے انکار نہیں کیا گیا اس پر اسی جلسہ کے دَوران میں مولانا پر یہ الزام رکھا گیا کہ انہوں نے قادیانیوں کو جلسہ میں کیوں شریک کیا؟ اور ان کو تقریر کی اجازت کیوں دی"؟[2]

اس کا اثر مولانا شبلی پر یہ ہُوا کہ

"مولانا بیمار اور پراگندہ خاطر ہو کر مولوی عبد السّلام صاحب اور سیرت کو لے کر بمبئی روانہ ہو گئے اور دو چار ماہ کے غور و فکر کے

---

[1] حیاتِ شبلی صفحہ ۵۵۷-۵۵۸۔ [2] حیاتِ شبلی صفحہ ۵۶۹۔

بعد جولائی ۱۹۱۳ء کو ندوۃ سے مستعفی ہو کر سبکدوش ہو گئے اور
کام کی ساری تجویزیں درہم برہم ہو کر رہ گئیں۔"[1]

اس واقعہ کے بعد ملکانہ کے ہندو پنڈت تو مسلسل مسلمانوں کو "شدھ" کرنے میں مشغول رہے لیکن مسلمان علماء اس عظیم فتح کی خوشی میں اطمینان سے اپنے گھروں میں جا سوئے کہ وہ "قادیانیوں" کو اسلامی جہاد میں شرکت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۲۳ء کی ایک نامسعود صبح مسلمانانِ ہند پر اس حال میں طلوع ہوئی کہ آریہ سماجی رہنما اپنی فتح کے شادیانے بجا رہے تھے۔ اور اسلام کا شدید معاند شردھانند بڑے فخر سے یہ اعلان کر رہا تھا کہ :-

"نواحِ آگرہ میں راجپوتوں کو تیز رفتاری سے شدھ کیا جا رہا ہے۔
اور اب تک چالیس ہزار تین سو راجپوت ملکانے، گوجر اور جاٹ
ہندو ہو چکے ہیں .... ایسے لوگ ہندوستان کے ہر حصے
میں ملتے ہیں۔ یہ پچاس ساٹھ لاکھ سے کم نہیں اور اگر ہندو سماج
ان کو اپنے اندر جذب کرنے کا کام جاری رکھے تو مجھے تعجب نہ ہوگا
کہ ان کی تعداد ایک کروڑ تک ثابت ہو جائے۔"[2]

یہ اعلان کیا تھا ایک بم کا خوفناک دھماکہ تھا جس نے مسلمانانِ ہند کو شرق سے غرب تک ہلا کر رکھ دیا اور اس عجیب حال میں بیدار کیا کہ سینے چاک اور دل فگار تھے۔ ہندوؤں نے صرف اسی اعلان پر اکتفا نہ کی بلکہ شدھی کی تحریک کو سارے ہندوستان میں پھیلا دینے کے لئے ایک عام بگل بجا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ہر طرف ایک شورِ آہ و بکا بپا ہو گیا۔ اور مسلمان اخبارات بڑے مؤثر اور پُر درد انداز میں اپنے علماء اور دیگر راہ نماؤں سے اپیلیں کرنے لگے کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو بھلا کر خدمتِ اسلام کے لئے آگے آئیں۔ اور جس فرقے کو جس قدر توفیق ملے ملکانہ کے مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ مختلف مسلمان فرقوں کی طرف سے متعدد مہمات کا آغاز کیا گیا اور لکھو کھا روپیہ چندہ جمع کرنے کی اپیلیں جگہ جگہ شائع ہونے لگیں اسی طرح جانی قربانی کے لئے بھی مجاہدین کو بلایا گیا۔ شیعوں نے ایک الگ مہم کا آغاز کیا کہ وہ اپنے طور پر ارتداد کی اس خوفناک رَو کو پلٹ سکیں۔ اس وقت ایک مشہور اخبار

---

[1] حیاتِ شبلی صفحہ ۵۷۳ [2] اخبار "پرتاپ" لاہور ۱۶ مارچ ۱۹۲۳ء صفحہ ۴۔

کے مدیر نے نام لے کر حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد کو بھی پکارا کہ اے ہمدردیٔ اسلام کا دعویٰ رکھنے والو! آج تم کہاں ہو۔ آج اسلام کے لئے قربانی کے میدان تمہیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ آج وقت ہے کہ تم اور تمہاری جماعت اپنے دعووں کی صداقت کا ثبوت دو۔ اگرچہ اس دعوت سے ایک روز قبل ہی یعنی ۷ مارچ ۱۹۲۳ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اسی موضوع پر جماعت کو مخاطب فرما چکے تھے اور یہ ہدایت دے چکے تھے کہ جماعت ہر قربانی کے لئے تیار ہو جائے اور ایک ایسی سکیم کا بھی تعارف کروا چکے تھے جو آپ نے پہلے سے ہی فتنۂ ارتداد کے سدِّباب کے لئے تیار کر لی تھی لیکن وکیل امرتسر کی اس دعوت پر غیرتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ نے فوری طور پر بذریعہ اشتہار ۹ مارچ کو اس کا جواب لکھا اور ان کوششوں سے مختصراً اہلِ اسلام کو آگاہ کیا جو پہلے ہی اس بارہ میں شروع کی جا چکی تھیں نیز اس سلسلہ میں مسلمانانِ ہند کو ۲۰ لاکھ روپے چندہ اکٹھا کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا کہ سب فرقے اپنے اپنے حصّے کی رقم خود ہی اکٹھی کریں اور خود ہی اپنے زیرِ انتظام خرچ کریں اسی طرح ہر فرقے کے زیرِ انتظام مجاہدین کے الگ الگ دستے اس مشترکہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے روانہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا اگرچہ تعداد کے اعتبار سے ۲۰ لاکھ میں سے باقی مسلمانوں کے مقابلہ میں جماعت احمدیّہ کا حصہ ۱۶۰ واں یعنی صرف تیرہ ہزار روپے بنتا ہے لیکن جب مندرجہ ذیل دو اُمور کو ملحوظ رکھا جائے تو اس قربانی میں جماعت کا حصّہ اَور بھی کم مقرر ہونا چاہیئے۔

اوّل:۔ جماعت میں کروڑپتی تو الگ رہے لکھ پتی بھی کوئی نہیں جبکہ دوسرے تمام مسلمان فرقوں میں متعدّد کروڑپتی یا لکھ پتی موجود ہیں۔

دوم:۔ ماضی قریب میں جماعت احمدیّہ کی خواتین خدمتِ اسلام کی ایک نہایت اہم ذمہ داری قبول کر چکی ہیں یعنی تعمیرِ مسجد برلن کے ضمن میں پچاس ہزار روپے پیش کرنے کا وعدہ کر چکی ہیں اور اس وقت وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں مصروف اور زیرِ بار ہیں۔

تاہم کمی کے مندرجہ دونوں تقاضوں کے باوجود حضرت امام جماعت احمدیّہ نے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ تیرہ ہزار روپے میں سے کچھ کم کرنے کی بجائے آپ اپنی جماعت کے خلوص اور قربانی کے معیار کے پیشِ نظر تحریک شُدھی کے ضمن میں پچاس ہزار روپے جمع کرنے کا اعلان کرتے ہیں جو اسلام کے حق میں تحریک شُدھی کا رُخ پلٹنے کیلئے خرچ کئے جائیں گے۔

جس وقت حضرت خلیفۃ المسیح نے فتنۂ ارتداد کے سدِّ باب کے لئے جماعت احمدیہ کی طرف سے پچاس ہزار روپے کا وعدہ کیا، مناسب ہوگا کہ جماعت کی اس وقت کی عمومی مالی حالت کا بھی کچھ جائزہ لے لیا جائے تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ اس وعدہ کی کیا حیثیت تھی۔ آج کے معیار سے دیکھا جائے تو پچاس ہزار روپے کی رقم ایک ایسی معمولی رقم ہے۔ کہ جماعت احمدیہ میں متعدد ایسے افراد مل جائیں گے جو انفرادی طور پر ہی اس سے بہت زیادہ رقم خدمت دین کے لئے پیش کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس وقت کے حالات آج سے بالکل مختلف تھے۔ اوّل تو اُس وقت اور آج کے روپے کی قیمت میں ہی زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے جماعت کی مالی حالت فی ذاتہٖ بھی بہت خراب تھی۔ اور ذرائع آمد نہایت قلیل اور محدود تھے۔

تحریک شدّھی سے صرف ایک سال قبل یعنی مارچ ۱۹۲۲ء کی مشاورت کی رپورٹ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ ایجنڈے پر یہ مسئلہ برائے غور پیش تھا کہ جماعت احمدیہ جس شدید مالی بحران میں سے گزر رہی ہے اس کا سدّ باب کیسے کیا جائے۔ انجمن کی غربت کا عالم یہ تھا کہ کارکنوں کو تنخواہیں دینے کے لئے بھی پیسے موجود نہیں تھے کارکنوں کی کئی کئی ماہ کی تنخواہوں کا قرض انجمن پر چڑھا ہوا تھا اور انجمن کا قرضہ کم ہونے کی بجائے روز بروز خطرناک رفتار کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ جماعت اپنی غربت اور بے سروسامانی کے باوجود جس عالمگیر غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں مشغول تھی۔ اس کے مالی تقاضے تمام تر پورے کرنے تو درکنار ادنیٰ ضرورتیں پوری کرنے کی بھی جماعت میں طاقت نہ تھی اور احمدی مبلّغین نہایت دردناک حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ممالکِ بیرون میں مبلّغ بیمار پڑتے تو علاج کے لئے دوا تک کے پیسے نہ ہوتے تھے۔ اس مالی بحران کے دَوران جماعت احمدیہ کا سالانہ بجٹ جس طرح بنایا گیا۔ اور سخت تنگی سے بنائے ہوئے بجٹ کے باوجود جماعت کو جن شدید مشکلات سے گزرنا پڑ رہا تھا ان کا ذکر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ کی تقریر میں ان الفاظ میں کیا:۔

"ایک اَور کمیٹی بٹھائی جس نے ۳-۴ ہزار کی اَور کمی کی۔ پھر بجٹ میرے پاس آیا۔ مَیں نے اس میں ۲۰ ہزار کی کمی کی مگر باوجود اس کے کہ اس قدر کمی کی اور لڑکوں کے وظائف میں اس قدر کمی کی، کہ اس سے کم نہیں ہو سکتی تھی - اور باوجود اس کے کہ پہلے ہی جو تنخواہ

باہر ملتی ہے اس سے بہت کم یہاں کام کرنے والوں کو ملتی ہے۔ اب ان کی تنخواہ میں اَور بھی کمی کر دی گئی ہے۔ غرباء کو بچانے کے لئے جن غرباء کو قحط الاؤنس ملتا تھا وہ بند نہ کیا۔ بلکہ جن کی تنخواہ ۵۰ سے اُوپر تھی ان کو پندرہ فی صدی اور جن کی ۱۰۰ سے اُوپر تھی اُنکی بیس فیصدی کم کر دی گئی۔ مَیں نے کہا ان کو قربانی کرنی چاہیئے۔ اور سب نے خوشی سے منظور کر لیا اور باوجودیکہ یہاں کے لوگوں کو کم تنخواہیں ملتی ہیں اور گورنمنٹ نے دگنی تگنی کر دی ہیں مگر ہم نے اَور کم کر دی ہیں۔ مگر بجائے اس سے بوجھ کم ہو جانے کے ابھی تک کئی ماہ کی تنخواہیں نہیں دی گئیں۔ پہلے تین ماہ کی تنخواہیں باقی تھیں اور اب پانچ پانچ ماہ کی ہیں۔ اور اب حالت یہانتک ہو گئی ہے کہ چونکہ انہوں نے قرض لے کر کھایا ہے اس لئے دکانوں کا دیوالہ نکل گیا۔ ادھر پانچ پانچ ماہ کی تنخواہیں نہیں ملیں ادھر دکانوں پر سرمایہ نہیں رہا .... یہاں ایسا ہو رہا ہے کہ کئی لوگوں کو کئی کئی دن کا فاقہ ہوتا ہے۔ ابھی ایک شخص نے بتایا کہ میرے پاس سے ایک شخص گزر رہا تھا جو فاقہ سے تھا۔ مَیں نے اس کی شکل سے اسے پہچانا اور فی الواقعہ کئی دن کا اسے فاقہ تھا۔ اس نے کچھ دیا مگر آدھا ایک اَور کو راستہ میں دے دیا۔ اسی طرح ایک اَور کے متعلق سُنا کہ فاقہ سے بیہوش ہو گیا۔ اور مَیں نے گھر کا کھانا اسے بھیجا اور آدمی کو کہا کہ کھلا کر آنا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہاں ایسے مخلص ہیں کہ بھوک سے مر جائیں گے اور کام نہ چھوڑینگے مگر کیا ہماری جماعت کے لئے یہ دھبہ نہ ہوگا کہ ایسے کارکن بھوکے مرگئے۔ تو مالی لحاظ سے نہایت نازک وقت آیا ہوا ہے۔[1]

یہ وہ حالات تھے جن میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جماعت احمدیہ کی خواتین کے سامنے تعمیر مسجد برلن کی سکیم پیش فرمائی۔ آپ نے جماعت پر واضح کیا کہ ہم اپنی مالی مشکلات کو دینی ضروریات کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ نے انہیں بتایا کہ

---

[1] رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۸-۱۹

آج جرمنی میں خدمتِ اسلام کا ایک نیا اور وسیع میدان کھُلا ہے جس کے تقاضوں کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنگِ عظیم کے بعد جرمن قوم میں نفسیاتی لحاظ سے ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں کہ یورپ کے دیگر ممالک کی نسبت اس میں اسلام قبول کرنے کا امکان زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ پس آپ نے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ جماعت پہلے ہی شدید مالی مشکلات میں گرفتار ہے مسجد برلن کی تعمیر کے لئے چندہ کی تحریک فرمائی اور احمدی مستورات کو اس بات کا پابند کر دیا کہ وہ پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم مسجد برلن کی تعمیر کے لئے خالصۃً اپنے ذرائع سے پیش کریں اور اپنے خاوندوں سے کوئی مطالبہ نہ کریں۔ یہ پابندی اس لئے تھی کہ واقعۃً جماعت کے مَردوں میں اس وقت مزید مالی بوجھ برداشت کرنے کی طاقت نظر نہ آتی تھی اور عورتوں سے یہ توقع تھی کہ وہ اپنے اندوختے اور زیورات فروخت کر کے اسلام کی اس اہم ضرورت کو پورا کر دیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوُا۔ لیکن یہ ایک الگ داستان ہے جس کا کچھ ذکر اپنے محل پر کیا جائے گا۔ فی الوقت اس کا ذکر محض اس لئے کیا گیا ہے کہ آج شُدھی کے حالات کا مطالعہ کرنے والا قاری یہ اندازہ کر سکے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے ملکانہ کے جہاد کے لئے جس جماعت سے پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا وہ کن حالات میں سے گزر رہی تھی۔ اور یہ مطالبہ اپنی ذات میں کیا قیمت اور کیا مقام رکھتا تھا یہ دونوں مطالبات جہاں ایک طرف آپ کے صاحبِ عزم ہونے پر دلالت کرتے ہیں وہاں اس بات کی بھی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کو اپنے ربّ کے فضلوں اور نصرت پر غیر معمولی ایمان اور توکّل تھا اور یقین تھا کہ یہ خدا ہی کے کام ہیں اور وہی ان کے پورا کرنے کے سامان کرے گا۔ پس دنیا نے یہ عجیب معجزہ دیکھا کہ فاقہ کشوں کی اس جماعت نے اسلام کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی اور قربانی کے ہر مطالبہ پر پہلے سے بڑھ کر جوش اور صدقِ دل کے ساتھ لبّیک کہا۔ یقیناً یہ خدا ہی کا فضل تھا لیکن یہ فضل محمؐود کے ذریعہ ظاہر ہوُا تھا۔ جماعت کو خدا نے ایک ایسا عظیم رہنما عطا کیا تھا کہ جو خدمتِ اسلام کے لئے ان فدائیوں کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر پیش کرنے کیلئے تیار تھا وہ ایک ایسا رہنما تھا جو قربانی کے ہر میدان کی طرف پہلے خود قدم بڑھاتا اور پھر جماعت کو اپنے پیچھے قدم بڑھانے کی دعوت دیتا۔ اس کے کردار میں ایک عجیب بلندی تھی۔ اس کی زبان میں ایک عجیب جادُو تھا۔ جب وہ خدمتِ اسلام کے لئے قربان گاہوں

کی طرف جماعت کو بُلاتا تو دلوں کی عجیب کیفیت ہوجاتی۔ جوشِ خدمت سے سینے پھٹنے لگتے۔ اور دل اچھل اچھل کر دینِ محمدؐ پر نچھاور ہونے کے لئے ہنسلیوں سے سر ٹکرانے لگتے۔ جماعت والہانہ اس کے پیچھے دَوڑ پڑتی۔ اور ہر احمدی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔ جو کمزور تھے گرتے پڑتے گھسٹتے قربان گاہوں کی طرف روانہ ہوجاتے اور جو لاچار اور معذور تھے وہ زبانِ حال سے یہ دردناک گیت الاپا کرتے۔ ؎

وہ خوش قسمت ہیں اُس مجلس میں جو گر پڑ کے جا پہنچے
کبھی پاؤں پہ سر رکھا کبھی دامن سے جا لپٹے
مرے ہمراز پر وُہ پرشکستہ کیا کریں جن کے
ہوا میں اُڑ گئے نالے گئیں بے کار فریادیں

جس رنگ میں آپ نے اس تحریک کو جماعت احمدیہ میں چلایا اور آریہ سماج کے مقابلے میں مٹھی بھر فدائیوں کو ایک عجیب شانِ ایمانی کے ساتھ صف آرا کیا۔ یہ سرگزشت تاریخِ احمدیت میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھی جائے گی۔

سب سے پہلے تو آپ نے کام کا ایک باقاعدہ منصوبہ تیار کیا۔ اور فوری طور پر حالات کا جائزہ لینے کے لئے بعض ذہین تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملکانہ کے علاقے میں روانہ کیا اس کے بعد خطبات اور تقاریر کے ذریعہ جماعت کو اس مسئلہ کی نوعیت سے پوری طرح آگاہ کیا۔ مشکلات سے خبردار کیا۔ خوب اچھی طرح واضح کر دیا کہ ایک انتہائی طاقتور دشمن کا سامنا ہے جو کیا بلحاظ جمعیّت اور کیا بلحاظ مال و دولت اتنا بڑا ہے کہ دنیوی لحاظ سے جماعت احمدیّہ کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے بعد اسلام کے دَورِ اوّل کے مسلمان مجاہدین کی عظیم قربانیاں یاد دلا کر ان کے دلوں میں ایک ایسی ہل چل مچادی کہ بڑے اور چھوٹے مرد اور عورتیں، جوان اور بچے سبھی اپنا سب کچھ اسلام کے لئے قربان کرنے کو تیار ہوگئے۔ لیکن آپ نے ان کے ان جذبات کو بے محابا سڑکوں پر بے لگام نہ ہونے دیا۔ اور عوامی مظاہرں کی صورت میں ان کے ولولوں کو ضائع ہونے کی اجازت نہ دی۔ قادیان کی گلیوں میں پُرجوش نعروں کی کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ اور آریہ سماج کے خلاف دشنام طرازی کی کوئی مہم نہ چلائی گئی البتہ قوم عزمِ صمیم کا پیکر بنی ہوئی عملِ پیہم کے لئے تیار ہوگئی۔ سب سے پہلے آپ نے جماعت کی توجہ کا رُخ دعا کی طرف پھیرا اور ان پر خوب واضح کر دیا کہ دُعا کے بغیر

نتیجہ خیز عمل تو الگ رہا محض عمل کی توفیق بھی نہیں مل سکتی۔ اور ہر مرد اور ہر عورت بوڑھا اور بچّہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق دعاؤں میں مصروف ہو گیا۔ تمام احمدی آبادیاں شب زندہ دار ہو گئیں اور راتوں کو خدا کے حضور کی جانے والی گریہ وزاری کا شور گھر گھر سے بلند ہونے لگا۔ تہجدوں میں سربسجود ہو کر غلبۂ اسلام کے لئے دعائیں کی جانے لگیں اور اللہ کے دین کی نصرت اور حمایت کے لئے آگے قدم بڑھانے والے اللہ ہی سے نصرت اور حمایت کی بھیک مانگنے لگے۔

دعا کی طرف توجہ دلانے کے بعد آپ نے جماعت کو مال اور جان کی قربانی کی طرف بلایا اور پیش آنے والی مشکلات سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ ہر قسم کے خطرات کی نشاندہی کی اور خوب کھول کر انہیں بتا دیا کہ اس راہ میں بہت سخت وقت آئیں گے بعض اوقات کبھی بھوکے اور کبھی پیاسے، کبھی دھوپ میں اور کبھی سردی میں۔ کبھی ننگے پاؤں اور کبھی پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ۔ کبھی اپنا سامان اٹھاتے ہوئے اور کبھی دوسروں کا بوجھ لئے ہوئے تمہیں دنوں، ہفتوں مہینوں گزر اوقات کرنی پڑے گی۔ فقیرانہ گاؤں گاؤں پھر کر اپنے غلطی خوردہ بھائیوں کو دوبارہ اسلام کی طرف بلانا ہو گا۔ گالیاں کھا کر صبر کرنا ہو گا ماریں کھا کر دُعا دینی ہو گی۔ دوا کے بغیر ہر قسم کی بیماریاں کاٹنی پڑیں گی۔ کمر توڑ مشقت کے کام کرنے ہوں گے۔ بیوی بچّوں اور گھروں کے آرام کا خیال تک دل سے نکال دینا ہو گا۔ یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد آپ نے انہیں یقین دلایا کہ اگر تم خدمتِ اسلام کی ان قربانگاہوں کی طرف بڑھنے کی ہمّت پاتے ہو تو مَیں تمھیں خوشخبری دیتا ہوں کہ خدا تعالےٰ تمھارے ساتھ ہو گا اور دنیا کی کوئی طاقت اپنی ظاہری عظمت، مال و دولت اور جمعیّت کے باوجود تمھیں شکست نہیں دے گی۔ تم خدا کے پیارے ہو جاؤ گے اور دین و دنیا کی سعادتیں اور برکتیں تمھیں نصیب ہوں گی۔

آپ نے جماعت سے ایسے صاحبِ عزم و استقلال مجاہدین کا مطالبہ کیا جو مصائب و مشکلات کی اتھاہ گہرائیوں میں بے دھڑک کُود پڑنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ نے پہلے ہی سے ان کو خبردار کر دیا کہ تمہارا مقابلہ صرف بیرونی دشمن ہی سے نہیں ہو گا خود تمہارے اپنے بھائیوں میں سے مسلمان کہلانے والے علماء تمہارے خلاف فتووں کی ایسی مہم چلائیں گے کہ تمہارے سامنے بھی ایک دشمن ہو گا اور پیچھے بھی ایک دشمن ہو گا اور ہر طرف سے تم پر

وار کئے جائیں گے۔ تمھیں کافر و ملحد و دجّال قرار دیا جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ تمھاری تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے سے بدرجہا بہتر ہے کہ مرتد ہونے والے ملکانے آریہ، برہمو سماج یا عیسائی ہو جائیں۔ لیکن کسی احمدی کے ذریعہ کلمۂ توحید کا اقرار نہ کریں۔ لیکن جہاں ایک طرف آپ دنیوی خطرات سے خوب متنبّہ کرتے وہاں خدا کی عظمت اور جلال کا نقشہ بھی اس انداز میں کھینچتے کہ دل خشیت اللہ سے بھر جاتے۔ اور دُنیا کی زندگی اور دنیوی آرام و آسائش سے دل اُچاٹ ہو جاتے۔ اور آپ کے خطبات کو سُننے والا ہر شخص اور آپ کی تحریکات کو پڑھنے والا ہر قاری برضا و رغبت ایک والہانہ جذبۂ قربانی کے ساتھ اپنی زندگی اور تمام متاعِ زندگی اس خدمت کے لئے پیش کر دیتا۔

اس موقع پر آپ جماعت سے جس عظیم مالی قربانی کی توقع رکھتے تھے اور جس انتہائی اقدام کے لئے آپ تیار کھڑے تھے اس کا اندازہ حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر بی۔ اے ایل ایل بی کی روایت سے ہوتا ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے حضرت شیخ صاحب فرماتے ہیں:۔

> "۱۹۲۳ء کی مجلس مشاورت میں خاکسار موجود تھا۔ حضور نے شدّھی کے متعلق تقریر کی اور ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ اگر آریہ قوم اپنے مال و دولت کے بَل بُوتے پر شدّھی کو کامیاب کرنا چاہتی ہے تو میرا اندازہ ہے کہ اس وقت میری جماعت کی کل جائیداد کی قیمت کا اندازہ دو کروڑ روپیہ کے قریب ہوگا میری جماعت یہ سب املاک و جائیداد اس تحریکِ شدّھی کے خلاف قربان کرنے سے دریغ نہ کرے گی۔
>
> اس بات سے حضور کا اولوالعزم ہونا اور جماعت کی ایسی تربیت کرنا اور یہ یقین کہ جماعت خوشی سے اپنا سب کچھ قربان کر دے گی ثابت ہے۔ چنانچہ بعد کے واقعات اسی اطاعت کو ثابت کرتے ہیں سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے مطابق۔
>
> مجھے نہیں معلوم کہ حضور کی تقریر کے یہ فقرات کہیں شائع یا درج ہوئے ہیں یا نہیں لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہیں اور مَیں کئی موقعوں پر دوستوں اور دیگر اشخاص سے یہ ذکر کرتا رہا ہوں ۱۹۲۳ء کی

مشاورت کے بعد خاکسار کو بھی شدھی کے علاقے میں کام کرنے کی
توفیق اللہ تعالےٰ نے دی "

پس بہترین اور کامیاب رہنما وہی ہوا کرتا ہے جو عقل اور جذبات میں توازن قائم رکھے۔ آپ نے اس تمام عرصہ میں اس توازن کو اس عمدگی کے ساتھ قائم رکھا کہ اس کا نظارہ کرنے والا بے اختیار ہو کر مرحبا، اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرنے لگتا ہے۔ ایک طرف تو ایسا عمدہ اور معقول منصوبہ جماعت کے سامنے رکھا جو باقاعدہ منظم صورت میں جماعت کے لئے ایک پروگرام پیش کرتا تھا اور جذباتی اور تخیلی اثرات سے پاک خالصۃً عقل اور تجربات کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ایک نہری نظام کے مشابہ تھا جسے بڑے فکر و تدبر سے، بڑی محنت اور جانکاہی کے ساتھ اس طرح تیار کیا گیا کہ ہر طرف آبپاشی کا ایک جال بچھ جائے۔ اور پانی کا ایک ایک قطرہ فصلوں کی نشوونما کے لئے استعمال ہو۔ دوسری طرف آپ نے جذبات میں اپنی شعلہ نوائی سے ایک ایسا ہیجان پیدا کر دیا کہ ہر سینے میں قربانی کے ولولے موجزن ہو گئے۔ پھر آپ نے ان کو نظم و ضبط کا ایک عظیم بند باندھ کر اس طرح محفوظ کر لیا کہ وہ سیلاب کی صورت میں غارت گری کرنے کی بجائے نظم و ضبط کی نہروں میں بہتے ہوئے جن زمینوں کا رُخ کریں حیات آفرینی ہی کا موجب بنیں۔ اگرچہ وفورِ جذبات کا یہ عالم تھا کہ آپ چاہتے تو ہزارہا مخلصین کارزارِ شُدھی میں جھونک دیتے لیکن آپ جانتے تھے کہ اس طرح فائدہ کی بجائے نقصان کا احتمال زیادہ ہے اور تھوڑے عرصہ ہی میں قوم کی ساری طاقت استعمال ہو کر جوش ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے ابتداء میں صرف ڈیڑھ سو مجاہدین طلب کئے۔ اگرچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ڈیڑھ ہزار کے قریب نوجوانوں اور بوڑھوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا لیکن آپ نے بڑے حزم و احتیاط کے ساتھ حالات کے تقاضوں کے مطابق انتخاب فرمایا اور انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کا ایک امیر مقرر فرمایا۔ کہ وہ اپنے علاقہ میں رہ کر مفوضہ فرائض انجام دے۔ ان سب پر مکرم چوہدری فتح محمد صاحب سیال رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا گیا۔ جو اصولی ہدایات دی گئیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ امیر کی اطاعت ہر حال میں فرض ہو گی نفسانی جوشوں کو دبانا پڑے گا۔ اور شدید آزمائش کے باوجود فتنہ و فساد سے بچنا ہو گا مار یں کھانے کے باوجود ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہ ہو گی۔ کم از کم تین ماہ کے لئے وقف کرنا ہو گا اور اس عرصہ میں ہر قسم کے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے علاقے کے باشندوں پر کسی قسم کا مالی یا ذاتی بوجھ ڈالنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اگر کھانا میسر نہیں

تو چنے چبا کر اور اگر چنے بھی میسر نہیں تو درختوں کے پتے کھا کر زندگی کا رشتہ قائم رکھنا پڑیگا مقامی باشندوں سے مانگ کر کھانے کا خیال ہی دل میں نہیں آنا چاہیئے۔ صرف زبانی نصائح سے کام نہیں لینا بلکہ جہاں تک ممکن ہو علاقے کے مفلوک الحال اور ضرورت مندوں کا خیال رکھنا اور ان کی مدد کرنی ہے۔ ان اصولی ہدایات کی مشعل لئے جتنے قافلے اس مہم پر روانہ ہوئے سبھی نے نظم و ضبط کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا اور قربانیوں کی ایسی شاندار مثالیں قائم کر دیں کہ قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

اگرچہ مجاہدین نے سو فیصدی اپنا خرچ خود برداشت کیا۔ لیکن ان اخراجات کے علاوہ بھی جو مجاہدین کو میدانِ عمل میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کرنے پڑتے تھے مرکزی انتظامی ضروریات کے لئے لٹریچر کی اشاعت اور دنیا کو صورتِ حال سے باخبر رکھنے کے لئے اور پھر عندالضرورت مقدمات کی پیروی اور حکّامِ وقت سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے ایک خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے جماعت میں پچاس ہزار روپے چندہ کی تحریک فرمائی اس تحریک پر بھی جماعت نے حیرت انگیز قربانی کا مظاہرہ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس مطالبہ کو پورا کر کے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس وقت یہ مالی تحریک اتنا بڑا مطالبہ سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستان کے غیر احمدی اور غیر مسلم پریس نے بھی اس بات کا نوٹس لیا اور نظریں اس طرف لگ گئیں کہ آیا یہ چھوٹی سی جماعت اتنے بڑے مطالبہ کو پورا کر سکتی ہے یا نہیں؟ بلاشبہ جماعت کی اس وقت کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ بہت بڑا مطالبہ تھا۔ ایک معمولی عزم و ہمت کا انسان گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ قلیل اور غریب جماعت اتنی بڑی قربانی دے سکتی ہے۔ لیکن دنیا نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ جماعت نے ہر رنگ میں آپ سے تعاون کیا اور ہر آواز پر لبیک کہا۔ قربانیاں پیش ہی نہیں کیں بلکہ اس شان اور اخلاص اور جذبۂ ایمان کے ساتھ پیش کیں کہ ان کے ذکر پر آج بھی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور دل کی گہرائیوں سے خود بخود ان مجاہدین کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔ الفضل ۱۵ر مارچ ۱۹۲۳ء میں ایک بوڑھے باپ کے جذبات کا ان الفاظ میں ذکر ہے:۔

"۱۰ر مارچ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی عصر کی نماز کے بعد مسجد میں رونق افروز ہوئے تو قاری نعیم الدین صاحب بنگالی نے جو ایک معمّر اور سن رسیدہ بزرگ ہیں کچھ عرض کرنے کی اجازت

چاہی۔ اور اجازت ملنے پر اپنی بنگالی اُردو میں ایک پُر جوش تقریر کی۔

قاری صاحب نے کہا .... گو میرے بیٹے (مولوی خلیل الرحمٰن اور مطیع الرحمٰن (متعلم بی اے کلاس) نے مجھ سے کہا نہیں مگر مَیں نے اندازہ کیا ہے کہ حضور نے جو کل راجپوتانے میں جاکر تبلیغ کرنے کے لئے زندگی وقف کرنے کی تحریک کی ہے اور جن حالات میں وہاں رہنے کی شرائط پیش کی ہیں شاید ان کے دل میں ہو کہ اگر وہ حضور کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کریں گے تو مجھے جو ان کا بوڑھا باپ ہوں تکلیف ہو گی۔ لیکن مَیں حضور کے سامنے خدا تعالےٰ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ مجھے ان کے جانے اور تکالیف اٹھانے میں ذرا بھی غم یا رنج نہیں۔ مَیں صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر یہ دونوں خدا کی راہ میں کام کرتے ہوئے مارے بھی جائیں تو اس پر ایک بھی آنسو نہیں گراؤں گا۔ بلکہ خدا تعالےٰ کا شکر ادا کروں گا۔ پھر یہی دونوں نہیں میرا تیسرا بیٹا محبوب الرحمٰن بھی اگر خدمتِ اسلام کرتا ہؤا مارا جائے اور اگر میرے دس بیٹے ہوں اور وہ بھی مارے جائیں تو بھی مَیں کوئی غم نہیں کروں گا۔ شاید یہ خیال ہو کہ بیٹوں کی تکلیف پر خوش ہونا کوئی بات نہیں۔ بعض لوگوں کو ایسی بیماری ہوتی ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کی موت پر بھی ہنستے رہتے ہیں مگر مَیں کہتا ہوں کہ اگر میں بھی خدا کی راہ میں مارا جاؤں تو میرے لئے عین خوشی کا باعث ہو گا۔

مَیں جانتا ہوں کہ ریا اور نمود ہلاکت کی باتیں ہیں اس لئے مَیں حضور سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے دل کو ریا اور عُجب سے کہ ایمان کے لئے زہر ہیں بچائے اور مجھے اخلاص عطا فرمائے۔ بنگالی لوگ دل کے مضبوط نہیں ہوتے مگر مسیح موعود پر ایمان لانے سے ہم لوگوں کے قلوب قوی ہو گئے ہیں

اور ایمان نے ہماری کمزوری کو دُور کر دیا ہے ۔"[1]

ایسی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ جن کے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے مکان یا زمین یا اثاثے بیچ کر اس جہاد میں حصّہ لیا۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے پاس صرف ایک بھینس تھی وہی اونے پونے پر بیچ دی اور اگرچہ سودا گھاٹے کا تھا مگر بڑی خوشی سے اس کا ذکر کرتے تھے کہ وقت پر گاہک تِل گیا۔ بعض غرباء نے خطوط کے ذریعہ اجازت طلب کی کہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہے فروخت کرکے زادِ راہ بنائیں اور میدانِ جہاد میں پہنچ جائیں۔ زیرہ فیروز پور کے ایک غریب دوست علی شیر صاحب نے حضور کی خدمت میں لکھا :۔

"آپ کا حکم سُنا۔ مَیں ایک غریب آدمی ہوں حضور کی شرائط قبول کرنےکے ناقابل ہوں جس کا مجھے افسوس ہے۔ چالیس روپے کا مقروض ہوں مگر ایک مکان ہے اگر حکم ہو تو اس کو فروخت کرکے یا رہن رکھ کے میدانِ ارتداد میں جلدی چلا جاؤں۔

خاکسار علی شیر۔ زیرہ فیروز پور۔"[2]

عورتوں میں بھی مسجد برلن کے چندہ کی ذمہ داری کے باوجود بے حد جوش تھا وہ اپنے کپڑے اور ڈوپٹے وغیرہ اپنی ملکانہ بہنوں کے لئے تحفے کے طور پر بھجوا رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی اس کارِ خیر میں حصہ لے رہی تھیں۔ ہماری ہمشیرہ امۃ القیوم بیگم جو ہمارے عم زاد ایم ایم احمد سابق وزیر خزانہ حکومت پاکستان کی اہلیہ ہیں۔ ان دنوں چھ سال کی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنا ایک چھوٹا سا ڈوپٹہ پیش کر دیا کہ کسی چھوٹی ملکانی کو دے دیا جائے عموماً دوسری احمدی بچیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ملکانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ احمدی خواتین کی جہاد کی تمنا صرف اسی بات میں محدود نہ تھی کہ مال و زر کے ذریعہ مجاہدین کی مدد کریں بلکہ سخت بے قرار تھیں کہ کسی طرح میدانِ کارزار میں خود پہنچ کر اس عظیم اسلامی جہاد میں حصّہ لے سکیں۔ بہن عمر بی بی نے آگرہ سے حضور کی خدمت میں لکھا :۔

"حضور مَیں صرف قرآن مجید جانتی ہوں اور تھوڑا سا اُردو۔ اپنے بیٹے سے سُنا ہے کہ مسلمان مرتد ہو رہے ہیں اور حضور نے وہاں جانے کا حکم دیا ہے مجھے بھی اگر حکم ہو تو فوراً تیار ہو جاؤں۔ بالکل

---

[1] اخبار الفضل ۱۵ مارچ ۱۹۲۳ء صلا۔ [2] کارزار شدھی مصنفہ ماسٹر محمد شفیع صاحب اسلم ص۴۵

دیر نہ کروں گی۔ خدا کی قسم اٹھا کر کہتی ہوں۔ ہر تکلیف اُٹھانے کو تیار ہوں۔" [۱]

امۃ الرحمٰن صاحبہ مڈوائف بھیرہ ہسپتال نے اس طرح اپنے جذبۂ شوق کا اظہار کیا۔

"حضور میرا باپ عاشقِ مسیح موعود تھا۔ دنیا میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ گیا۔ میرے دونوں بھائی عبدالرحیم و عبداللہ سرفروشوں میں حضور کے حکم سے کام کر رہے ہیں۔ اس عاجزہ کا بھی دل تڑپ رہا ہے یہ بھی تین ماہ کے لئے زندگی وقف کرتی ہے۔" [۲]

تحریکِ شدّھی کے دَوران جماعت احمدیہ نے جس والہانہ انداز میں قربانیاں پیش کیں اور یو پی کے کئی متاثرہ اضلاع میں جس کامیابی کے ساتھ آریہ سماج کا مقابلہ کیا اور ہر میدان میں ان کو شکستِ فاش دی۔ ایک طویل اور دلچسپ داستان ہے جس کا اصل تعلق تاریخِ احمدیّت کے ساتھ ہے اور کسی حد تک تاریخِ احمدیت میں اس پر روشنی ڈالی بھی جا چکی ہے۔ ہماری نظر اس وقت اس تحریک کے ان پہلوؤں پر ہے جس کا تعلق براہِ راست حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی شخصیت۔ کردار اور صلاحیتوں سے ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلّق ہے کہ آپ نے ایک فتح نصیب جرنیل کے طور پر اس تحریک کی قیادت کی اور ہر میدان میں مظفّر و منصور ہوئے۔ اس کا کچھ ذکر آئندہ کیا جائے گا یہاں فی الوقت صرف اسی پر اکتفا کی جاتی ہے کہ تحریکِ خلافت کے دَوران آپ کے کردار اور تحریکِ شدّھی کے دَوران آپ کے کردار میں جو فرق نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ اگرچہ اُس وقت آپ نے بروقت تنبیہہ اور نہایت قیمتی مشورے دے کر اپنے فرض کو ادا کر دیا۔ لیکن حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ عملی جدوجہد کے میدان میں ایک کامیاب جرنیل کے طور پر اُمّتِ مسلمہ سے آپ کا تعارف نہ ہو سکا۔ شدّھی کی تحریک نے وہ موقع فراہم کر دیا اور آپ کو ربّ العزت سے یہ توفیق ملی کہ اپنے مشوروں کی صداقت اور قدر و قیمت کو عمل کے میدان میں بھی درست ثابت کر دکھائیں۔ دنیا نے ایک نئے اندازِ فکر کے ساتھ عوامی جذبات اور جوشوں کی تسخیر ہوتی ہوئی دیکھی۔ اس موقع پر ایک اور پہلو آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا یہ سامنے آیا کہ ایسے وقت میں جبکہ جماعت شدید اقتصادی بحران کا شکار تھی آپ اس پر مزید مالی بوجھ ڈالنے سے نہ ہچکچائے بلکہ پے در پے ایسی تحریکات کیں جن کا پورا ہونا بظاہر محال دکھائی دیتا تھا۔

---

[۱] کارزارِ شدّھی صفحہ ۴۶ [۲] کارزارِ شدّھی صفحہ ۴۶-۴۷

وہ جماعت جو اپنے کارکنوں کی ماہانہ تنخواہ دینے کی بھی طاقت نہ رکھتی تھی صرف اس کی مستورات ہی سے پچاس ہزار روپے کی گرانقدر رقم کا مطالبہ کرنا اور بغیر کسی انتظار کے فوراً بعد ہی مزید پچاس ہزار روپے کی ایک اور تحریک جاری کر دینا یقیناً بہت بڑی ہمّت کا کام تھا بظاہر تو اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے تھا کہ جماعت ان مطالبات کو پورا کرنے میں ناکام رہے بلکہ آئندہ چندوں کی ادائیگی میں کوتاہی کرے۔ لیکن واقعۃً نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ جماعت کے مالی نظام کی بنیادیں دراصل اسی دَور میں مضبوط اور مستحکم ہوئیں۔ اور اسی بُحران میں ان دونوں تحریکات کے نتیجہ میں اور انہی کی برکت سے جماعت میں مالی قربانی کی صلاحیتیں پوری طرح بیدار ہوئیں۔ نئی اُمنگیں اُبھریں اور حوصلوں کو نئی وسعتیں عطا ہوئیں۔ اور جماعت مِن حَیثُ المجمُوع مالی قربانی کے ایک ایسے بلند معیار پر قائم ہو گئی کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے مبارک دَور کے سوا دنیا کے پردے پر اس کی کوئی دوسری مثال نظر نہ آئے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ ۱۹۲۳ء ہی دراصل وہ سال ہے جبکہ ملکانہ کے جہاد اور چندہ مسجد برلن کی تحریکات کی برکت سے جماعت احمدیّہ پہلی مرتبہ مالی لحاظ سے مستحکم ہوئی اور اس کی ایسی کایا پلٹ گئی کہ گویا منصۂ شہود پر ایک نئی جماعت اُبھری ہے ۞

تحریکِ شُدھی اور اس کا پیشگوئی مُصلح موعُود کے ساتھ ایک خاص تعلق

شدھی کے معرکے میں اگرچہ دوسرے مسلمانوں نے بھی کسی حد تک کام کیا۔ لیکن جماعت احمدیہ کے لئے یہ مقابلہ ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ آریہ سماج، ہندومت کے احیائے نَو کی ایک ملک گیر اور طاقتور تحریک تھی جو خصوصًا اہلِ اسلام کے خلاف بڑے جارحانہ اور خوفناک عزائم رکھتی تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کی طرف سے اگر اس تحریک کے مقابلے کی کوئی طاقت رکھتا تھا تو وہ جماعت احمدیہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی اس حد تک منظم تھا نہ کسی کو ایسا باخدا اور مدبّر رہنما میسّر تھا نہ کسی کو اپنے وسائل مجتمع کرکے بروئے کار لانے کی قدرت تھی۔ نہ تنظیم تھی نہ مرکزیّت نہ سلیقہ نہ کام کو مستقل مزاجی کے ساتھ چلانے کی صلاحیت تھی۔ پس جماعت احمدیہ ہی وہ مسلمان فرقہ تھا جسے اس دَور میں فی الحقیقت تمام عالمِ اسلام کی نمائندگی کا موقع ملا۔ اور ہر میدانِ مقابلہ میں اس نے اپنے دشمن کو شکست پر شکست دی۔ یہاں تک کہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر اسے میدانِ مقابلہ سے فرار کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن کسی کا خیال اس طرف نہ گیا کہ دراصل یہ اسی مقابلہ کی ایک نئی شکل ہے جو ایک لمبا عرصہ پہلے حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السّلام اور آریہ رہنما پنڈت لیکھرام کے مابین ہوا تھا۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ لیکھرام بڑی تعلّی کے ساتھ جس موعود بچّے کے خلاف ایک منحوس پیشگوئی کر رہا ہے خود اس کی اپنی قوم ہی ایک دن اس کی برتری اور عظمت کا ڈھنڈورا پیٹے گی؟ اس وقت جب لیکھرام یہ اعلان کر رہا تھا کہ آریہ سماج کے خدا نے اسے مطلع کیا ہے کہ اگر یہ بچہ پیدا ہو بھی گیا تب بھی تین سال کے اندر اندر اس کا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ قادیان سے باہر اس کا شہرت پانا تو درکنار خود قادیان میں بھی اس کے نام سے کوئی آشنا نہ رہے گا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہی بچّہ ایک دن آریہ سماج کے مقابلے پر قرآن کی تلوار لے کر اس شان کے ساتھ

نکلے گا۔ کہ ہر طرف اس کے نام کی دھوم مچ جائے گی۔ اور غیر تو غیر خود آریوں کو اس بات کا برملا اقرار کرنا پڑے گا کہ اس عظیم رہنما کی قیادت میں تحریکِ احمدیت آریہ سماج کے لئے ایک انتہائی مہلک خطرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کون اس وقت یہ کہہ سکتا تھا کہ جس بچے کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ خود اس کے اپنے گاؤں میں بھی اس کے نام سے کوئی واقف نہیں رہے گا۔ وہ دن دُور نہیں کہ وہ صرف ایک گاؤں یا ضلع یا صوبہ میں ہی نہیں بلکہ تمام برِصغیر ہندوستان میں شہرت پائے گا۔ اور اس پیشگوئی کرنے والے کے متبعین ہی خود اس شہرت کا ذریعہ بنائے جائیں گے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کہ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں تو حضرت مرزا محمود احمد کارزارِ شدھی سے پہلے بھی روشناس تھے لیکن ہندوستان میں بسنے والے ہندوؤں کی اکثریت آپ کے نام سے ناآشنا تھی بلکہ جماعت احمدیہ کے وجود سے بھی ناواقف تھی۔ تحریک شدھی ہی ملک گیر شہرت کا وہ پہلا زینہ ثابت ہوئی جسے طے کرتے ہوئے تمام ہندوستان میں آپ کا شہرہ بامِ عروج پر جا پہنچا۔ اور دشمن بھی آپ کی عظیم قیادت کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا۔

تحریکِ شدھی اس پہلو سے بھی ایک دلچسپ مطالعہ کا مواد پیش کرتی ہے کہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ولادت سے قبل آریہ سماج اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مابین ایک فیصلہ کن مجادلہ ہوا۔ اس موقع پر بدقسمتی سے خود مسلمان علماء اور مشاہیر بھی احمدیت کے مقابل پر آریہ سماج کا ساتھ دے رہے تھے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرزندِ موعود کی پیشگوئی فرمائی تو آریوں کی طرف سے اس پیشگوئی پر جب بھی کوئی پھبتی کسی جاتی مسلمان علماء آریوں کے ساتھ مل کر آپ پر ہنستے اور پھبتیاں اُڑاتے۔ جب بھی لیکھرام کوئی تعلّی کرتا تو قہقہوں کی آوازوں میں مسلمان علماء کی آوازیں نمایاں ہو کر سنائی دیتیں جب بھی وہ آپ کی تکذیب میں اخبارات و رسائل کے چہرے سیاہ کرتا۔ مسلمان صحافیوں کے قلم اس کی تائید میں رواں دواں نظر آتے۔ اور ہر ایسے موقع پر ہندوستان کی فضا میں آریوں کی طرف سے بھی اور مسلمانوں کی طرف سے بھی یہ شور بلند ہوتا کہ (نعوذ باللہ) مرزا قادیانی کی پیشگوئی جھوٹی نکلی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور ایک ایسا بھی وقت آنا تھا کہ خود اسی موعود بیٹے کے ہاتھوں زک اٹھا کر آریوں نے بھی بزبانِ حال یہ گواہی دینی تھی کہ لیکھرام اپنی ہر بات میں جھوٹا نکلا اور مرزا غلام احمد اپنے ہر قول

میں صادق و مصدوق ثابت ہوا۔ اور مسلمان راہنماؤں نے بھی اس موعود بیٹے کی تائید میں کھڑے ہو کر اعلان پر اعلان کرتا تھا کہ اسلام کا یہ بطلِ جلیل ہر میدانِ مقابلہ میں آریہ دشمن کو مات دے گیا۔ اور لیکھرام کے مذہب کی ذلت اور رسوائی اُسی بیٹے کے ہاتھوں ہوئی جس کے نابود ہونے کی حسرت لئے وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہوئے زمیندار اخبار نے اپنی ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"جو حالات فتنۂ ارتداد کے متعلق بذریعہ اخبارات علم میں آچکے ہیں ان سے صاف واضح ہے کہ مسلمانانِ جماعت احمدیہ اسلام کی انمول خدمت کر رہے ہیں۔ جو ایثار اور کمر بستگی نیک نیتی اور توکّل علی اللہ ان کی جانب سے ظہور میں آیا ہے وہ اگر ہندوستان کے موجودہ زمانے میں بے مثال نہیں تو بے اندازہ عزّت اور قدردانی کے قابل ضرور ہے۔ جہاں ہمارے مشہور پیر اور سجادہ نشین حضرات بے حس و حرکت پڑے ہیں اس اولوالعزم جماعت نے عظیم الشان خدمت کر کے دکھا دی۔"

(زمیندار لاہور ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء)

(بیان شیخ نیاز علی ایڈووکیٹ ہائیکورٹ لاہور)

پھر ۲۹ر جون ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں یہ اعتراف کیا کہ:۔

"قادیانی احمدی اعلیٰ ایثار کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا قریبًا ایک سو مبلّغ امیرِ وفد کی سرکردگی میں مختلف دیہات میں مورچہ زن ہے۔ ان لوگوں نے نمایاں کام کیا ہے۔ جملہ مبلّغین بغیر تنخواہ یا سفر خرچ کے کام کر رہے ہیں۔ ہم گو احمدی نہیں لیکن احمدیوں کے اعلیٰ کام کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جس اعلیٰ ایثار کا ثبوت جماعتِ احمدیہ نے دیا ہے اس کا نمونہ سوائے متقدّمین کے مشکل سے ملتا ہے۔ ان کا ہر ایک مبلّغ غریب ہو یا امیر، بغیر مصارفِ سفر و طعام حاصل کئے میدانِ عمل میں گامزن ہے۔ شدید گرمی اور لوؤں میں وہ اپنے امیر کی اطاعت میں کام کر رہے ہیں۔" [1]

---

[1] زمیندار لاہور۔ ۲۹ر جون ۱۹۲۳ء۔

اخبار "مشرق" گورکھپور نے لکھا:۔

"جماعت احمدیہ نے خصوصیت کے ساتھ آریہ خیالات پر بہت بڑی ضرب لگائی ہے اور جماعت احمدیہ جس ایثار اور درد سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی کوشش کرتی ہے وہ اس زمانے میں دوسری جماعتوں میں نظر نہیں آتی"۔[1]

چند دن بعد پھر اسی اخبار نے یہ اعترافِ حقیقت کیا کہ:۔

"جماعت احمدیہ کے امام و پیشوا کی لگاتار تقریروں اور تحریروں کا اثر ان کے تابعین پر بہت گہرا پڑا۔ اور اس جہاد میں اس وقت سب سے آگے یہی فرقہ نظر آتا ہے۔ اور باوجود اس بات کے کہ احمدی فرقہ کے نزدیک اس گروہ نومسلم کی تائید کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اس فرقے سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر اسلام کا نام لگا ہوا تھا اس لئے اس کی شرم سے امام جماعت احمدیہ کو جوش پیدا ہو گیا ہے۔ اور آپ کی بعض تقریریں دیکھ کر دل پر بہت ہیبت طاری ہوتی ہے۔ کہ ابھی خدا کے نام پر جان دینے والے موجود ہیں۔ اور اگر ہمارے علماء کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ جماعت احمدیہ اپنے عقائد کی تعلیم دے گی تو وہ اپنی متفقہ جماعت میں .... ایسا خلوص پیدا کر کے آگے بڑھیں کہ ستو کھائیں اور چنے چبائیں اور اسلام کو بچائیں۔ جماعت احمدیہ کے ارکان میں ہم یہ خلوص بیشتر دیکھتے ہیں۔ دیانت، ایفاء عہد، اپنے امام کی اطاعت میں یہ جماعت فرد ہے۔ جناب مرزا صاحب اور ان کی جماعت کی عالی حوصلگی اور ایثار کی تعریف کے ساتھ ہم مسلمانوں کو ایسے ایثار کی غیرت دلاتے ہیں۔ دیانت اور امانت جو مسلمانوں کی امتیازی صفتیں تھیں آج وہ ان میں نمایاں ہیں۔ جماعت احمدیہ کی فیاضی اور ایثار کے ساتھ ان کی دیانت اور آمد و خرچ کے ابواب کی درستگی اور باقاعدگی سب سے زیادہ قابلِ ستائش ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود آمدن

---

[1] اخبار "مشرق" گورکھپور ۱۵ مارچ ۱۹۲۳ء

کی کمی کے یہ لوگ بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔" [1]

اسی طرح اخبار "وکیل" امرتسر نے لکھا۔

"احمدی جماعت کا طرزِ عمل اس بات میں نہایت قابلِ تعریف ہے جو باوجود چھیڑ چھاڑ کے محض اس خیال سے کہ اسلام کو چشمِ زخم سے محفوظ رکھا جائے ان خانہ جنگیوں کے انسداد کی طرف خود مسلمانوں کے لیڈروں کو توجہ دلاتے ہیں اور ہر طرح کام کرنے کو تیار ہیں۔

...... ہم علیٰ وجہ البصیرت اعلان کرتے ہیں کہ قادیان کی احمدی جماعت بہترین کام کر رہی ہے۔" [2]

مولوی ممتاز علی صاحب ایڈیٹر اخبار "تہذیب النسواں" لاہور نے لکھا۔

"مَیں نے سُنا ہے کہ میدانِ ارتداد میں ہر فرقۂ اسلام نے تبلیغ کے لئے اپنے نمائندے بھیجے ہیں۔ مناسب جانا کہ مَیں جس گروہ کے مبلّغین کو زیادہ کامیاب دیکھوں ان میں سے ایک اپنے لئے منتخب کر لوں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے کام میں سب سے زیادہ کامیابی احمدی مبلّغوں کو ہوئی ہے۔ اس لئے مَیں نے چاہا کہ اگر تہذیبی بہنوں کو اعتراض نہ ہو تو وہ ان میں سے کسی ایک مبلّغ کا خرچ اپنے ذمہ لیں۔ مگر اسی اثناء میں ہمارے علماء نے اعلان شائع کیا کہ احمدی فرقہ کے لوگ سب کافر ہیں۔ ان کا کفر ملکانہ راجپوتوں کے کفر سے بھی زیادہ شدید ہے۔" [3]

یہ تو مسلمان اخبارات کی شہادت تھی۔ ہندو اخبارات کے بعض اعترافات بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ اسلام کے دفاع میں کون سب سے بڑھ کر ان پر چوٹیں لگاتا رہا ــــ یہ انہی کا دل جانتا تھا۔ اور کس کے وار ان کے سینے چھلنی کرتے رہے ــــ یہ بھی وہی بہتر بیان کر سکتے تھے۔ لیجئے سنیئے :۔

دیو سماجی اخبار "جیون نت" لاہور نے لکھا۔

"ملکانہ راجپوتوں کی شدھی کی تحریک کو روکنے اور ملکانوں میں

---

[1] اخبار "مشرق" گورکھپور ۲۹ مارچ ۱۹۲۳ء۔ [2] اخبار "وکیل" امرت سر ۱۳ مئی ۱۹۲۳ء

[3] رسالہ "تہذیب النسواں" لاہور ۲ مئی ۱۹۲۵ء۔

اسلامی مت کا پرچار کرنے کے لئے احمدی صاحبان خاص جوش کا
اظہار کر رہے ہیں ۔ چند ہفتے ہوئے قادیانی فرقہ کے لیڈر مرزا محمود احمد
صاحب نے ڈیڑھ سوایسے کام کرنے والوں کے لئے اپیل کی تھی جو
تین ماہ کے لئے ملکانوں میں جا کر مفت کام کرنے کے لئے تیار ہوں
جو اپنا اور اپنے اہل وعیال کا وہاں کے کرایہ وغیرہ کا کل خرچہ برداشت
کر سکیں ۔ اور انتظام میں جس لیڈر کے ماتحت جس کام پر انہیں
لگایا جاوے اسے وہ خوشی خوشی کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ بیان
کیا جاتا ہے کہ اس اپیل پر چند ہفتوں کے اندر چار سو سے زیادہ
درخواستیں ان شرائط پر کام کرنے کے لئے موصول ہو چکی ہیں ۔
اور تین پارٹیوں میں نوّے احمدی صاحبان آگرہ کے علاقہ میں پہنچ
چکے ہیں اور بہت سرگرمی سے ملکانوں میں اپنا پرچار کر رہے ہیں
اس نئے علاقہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے ان میں سے بعض
نے جن میں گریجویٹ نوجوان بھی شامل تھے اپنے بستر کندھوں پر
رکھ کر اور تیز دھوپ میں پیدل سفر کر کے سارے علاقہ کا دورہ کیا
ہے ۔ اپنے مت کے پرچار کے لئے ان کا جوش اور ایثار قابلِ
تعریف ہے ۔" [1]

"آریہ پتریکا" بریلی نے یکم اپریل ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں لکھا :۔

"اس وقت ملکانے راجپوتوں کو .... اپنی پرانی راجپوتوں
کی برادری میں جانے سے باز رکھنے کے لئے (یعنی مرتد ہونے سے
بچانے کے لئے ۔ ناقل) جتنی اسلامی انجمنیں اور جماعتیں کام کر رہی
ہیں ان میں احمدیہ جماعت قادیان کی سرگرمی اور کوشش فی الواقع
قابلِ داد ہے ۔"

"ہندو دھرم اور اصلاحی تحریکیں" کے مصنف نے اعتراف کیا :۔

"آریہ سماج نے شدھی یعنی پاک کرنے کا طریقہ جاری کیا ۔ ایسا کرنے
سے آریہ سماج کا مسلمانوں کے ایک تبلیغی گروہ یعنی قادیانی فرقہ سے

---

[1] اخبار "جیون تت" لاہور ۲۴ / اپریل ۱۹۲۳ء ۔

تصادم ہو گیا۔ آریہ سماج کہتی تھی کہ وید الہامی ہے اور سب سے
پہلا آسمانی صحیفہ ہے اور مکمّل گیان ہے .... قادیانی کہتے
تھے کہ قرآن شریف خدا کا کلام ہے اور حضرت محمّد خاتم النبیّین ہیں
اس کدو کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عیسائی یا مسلمان اب مذہب
کی خاطر آریہ سماج میں داخل نہیں ہوتا۔" [1]

کارزارِ شدّھی کے اثرات اتنے گہرے اور دُور رس تھے کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی عظیم قیادت کا رُعب آریہ سماج کے راہنماؤں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ شدّھی کی تحریک چلی اور گذر گئی لیکن سالہا سال تک آریہ راہنماؤں کے دلوں میں اس تلخ اور ہولناک تجربے کی یادیں باقی رہیں جو کارزارِ شدّھی میں جماعت احمدیہ سے ٹکّر لینے کے نتیجے میں انہیں حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ چار سال کے بعد اخبار "تیج" دہلی نے یہ اعتراف کیا کہ:۔

"میرے خیال میں تمام دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ ٹھوس مؤثر اور مسلسل کام کرنے والی جماعت، جماعت احمدیہ ہے۔ اور مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ ہم سب سے زیادہ اس کی طرف سے غافل ہیں اور آج تک ہم نے اس خوفناک جماعت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔" [2]

پھر اسی اخبار نے مزید لکھا:۔

آج سے تیس چالیس سال پہلے پیچھے ہٹ جائیے جبکہ یہ جماعت اپنی ابتدائی حالت میں تھی۔ اور دیکھئے اس زمانے میں ہندو اور مسلمان دونوں اس جماعت کو کس قدر حقیر اور بے حقیقت سمجھتے تھے ہندو تو ایک طرف رہے خود مسلمانوں نے ہمیشہ اس کا مذاق اُڑایا اور اس پر لعنت اور ملامت کے تیر برسائے۔ اس جماعت نے اپنے ابتدائی حالات میں جن جن کاموں کے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا آج ان میں سے اکثر انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ اس زمانہ میں جب احمدیوں نے ان کاموں کی ابتداء کی تھی، ان کو پاگل سمجھا جاتا تھا اور ان کی حماقت پر ہنسی اُڑائی جاتی تھی۔ مگر واقعات یہ کہہ رہے

---

[1] "ہندو دھرم اور اصلاحی تحریکیں" صفحہ ۴۳-۴۴ [2] اخبار "تیج" دہلی ۲۵ جولائی ۱۹۲۷ء۔

ہیں کہ ان پر ہنسی اُڑانے والے خود بے عقل اور احمق تھے اس بارے
میں عیسائی مشنریوں نے نہایت عقلمندی سے کام لیا . . . .
احمدیوں نے ابھی یورپ اور امریکہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ تمام پادری
ان کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے ۔"[1]

ضمناً یہاں یہ امر بھی ذکر کے لائق ہے کہ ایسی جماعت جو تن تنہا عیسائی دنیا پر بڑی جرأت اور دلیری سے اور مومنانہ شان کے ساتھ حملہ آور ہے اور پادری اس کے مقابلہ کے لئے صف آرا ہو رہے ہیں ایسی جماعت پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ یہ عیسائی حکومتوں کا خود کاشتہ پودا ہے۔ حق پوشی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ یا بعضوں کے نزدیک شاید اس کی کوئی حد نہیں!!!
تحریک شدھی کے چھ سال بعد جماعت احمدیہ کی تبلیغی مساعی کو ہندو ازم کے لئے ایک شدید خطرہ تصور کرتے ہوئے مہاشہ کرشن نے یوں خطرے کا الارم بجایا۔

"مشکل یہ ہے کہ ہندوؤں کو اپنے ہی ہموطنوں کی ایک جماعت کی
طرف سے خطرہ ہے اور وہ خطرہ اتنا عظیم ہے کہ اس کے نتیجہ کے
طور پر آریہ جاتی صفحۂ ہستی سے مٹ سکتی ہے۔ وہ خطرہ ہے تنظیم
و تبلیغ کا۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ کام اِس تیزی سے ہو رہا ہے
کہ ہندوؤں کے پاؤں اُکھڑ رہے ہیں۔ ان کی تعداد سال بہ سال
کم ہو رہی ہے۔ اگر اسے کسی طرح روکا نہ گیا تو ایک وقت ایسا
آسکتا ہے جب کہ آریہ دھرم کا کوئی بھی نام لیوا نہ رہے ۔"[2]

غور فرمایئے! چند ہی سال پہلے آریہ سماج کا کیا دعویٰ تھا اور کیا طنطنہ تھا۔ مسلمانوں کو نہتا اور بے بس سمجھ کر وہ اپنی پوری قوّت سے ان پر حملہ آور تھی۔ اور اپنی طاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر یہ اعلان کر رہی تھی :۔

کام شدھی کا کبھی بند نہ ہونے پائے
ہندو! تم میں ہے اگر جذبۂ ایماں باقی
بھاگ سے قوموں کو یہ وقت ملا کرتے ہیں
رہ نہ جائے کوئی دنیا میں مسلماں باقی

لیکن جونہی جماعت احمدیہ نے میدانِ جہاد میں قدم رکھا آریہ سماج نے اس کو اپنی ہستی

---

[1] اخبار "تیج" دہلی ۲۵ر جولائی ۱۹۲۷ء۔ [2] "پرتاپ" لاہور ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء۔

کے لئے خطرہ قرار دیا۔ اور خطرہ بھی کوئی معمولی خطرہ نہیں بلکہ اتنا عظیم کہ اس کے باشعور رہنما یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے کہ:۔

"اس کے نتیجہ کے طور پر آریہ جاتی صفحۂ ہستی سے مٹ سکتی ہے۔"

کس قدر حیرت انگیز ہے یہ موازنہ کہ جس بچے کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کی خبر لیکھرام نے دی وہی بچہ اس کی قوم کے لئے ایک ایسا عظیم خطرہ بن گیا کہ ساری کی ساری قوم اس کے نتیجہ میں صفحہ ہستی سے مٹ سکتی ہے۔

کیا اس اعترافِ حق میں اہلِ بصیرت کے لئے عبرت کا کوئی سامان نہیں؟ کیا آریہ سماج کے اس اعترافِ شکست میں ان لوگوں کے لئے کوئی نشان نہیں جو غور و فکر کی عادت رکھتے ہیں؟

اسلامی معاشرہ میں عورت کو اسکا مقام دلوانے کی جدوجہد

انسانی تمدن اور سوسائٹی میں عورت کا مقام ایک ایسا اہم سوال ہے جو دن بدن زیادہ سنجیدگی اور اہمیت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے اور بعض ترقی یافتہ ملکوں میں تو وسیع پیمانے پر عورتوں کی آزادی کی مہم کے نام پر بڑی مضبوط تنظیمیں قائم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی تہذیب کے آغاز ہی سے عورت مظلوم رہی ہے اور کسی نہ کسی حیثیت سے مرد نے ہمیشہ اُسے غلام بنائے رکھا ہے۔ لامذہب طبقہ کی طرف سے یہ وسوسہ بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ مذہب نے بیجا طور پر مرد کے ہاتھ مضبوط کئے اور عورت کو مزید غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس خیال کے حامی اس مفروضے کی بناء پر یہ نظریہ بھی پیش کرتے ہیں کہ دراصل عورت کے بارہ میں مذہبی تعلیم خدا کی طرف سے نہیں بلکہ محض عورت پر اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لئے جابر مردوں کی ایجاد ہے۔ ان نظریات اور خیالات کے پیشِ نظر اسلام میں عورت کے صحیح مقام کا مسئلہ اس زمانہ میں غیر معمولی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

حضرت مصلح موعودؓ رضی اللہ عنہ پر اسلامی تعلیمات کے صحیح نقوش اُجاگر کرنے کی دُہری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ بحیثیت امام جماعت احمدیہ اور خلیفۃ المسیح کے یہ ایک مستقل فرضِ منصبی تھا جو دوسرے خلفاء راشدین کی طرح آپ کو بھی سونپا گیا۔ اس کے علاوہ بحیثیت مصلح موعودؓ دُنیا پر اسلامی تعلیمات کی برتری اور کلام اللہ کا مرتبہ ظاہر کرنا بھی آپ کا ایک اہم مشن تھا۔ اس لحاظ سے اسلام میں عورت کے صحیح مقام کو واضح کرنا اور اسلامی معاشرہ میں اس کی عملی تصویر اُتارنے کا کام آپ کے اوّلین فرائض میں داخل تھا۔ جب ہم تفصیلاً آپ کی زندگی کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس فریضہ کو بھی دیگر فرائض کی طرح نہایت احسن رنگ میں انجام دیا۔

اسلامی سوسائٹی میں عورت کے صحیح مقام، حقوق اور فرائض کے مسئلہ پر آپ نے اپنی مختلف تقاریر اور تحریرات میں ہر پہلو سے روشنی ڈالی ہے اور محض

نظریات کی بحث پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ عملاً احمدی مستورات کو اس راہِ عمل پر گامزن بھی کر دیا جو اسلامی تعلیم کی روشنی میں آپ نے ان کے لئے تجویز کی۔

آپ آزادی کے نئے رجحانات اور اس ضمن میں نئی تحریکات سے متاثر ہوئے بغیر محض اس امر کی لگن رکھتے تھے کہ اسلام نے عورت کا جو مقام مقرر فرمایا ہے اس کو اُجاگر کیا جائے آپ یہ یقین رکھتے تھے کہ نہ صرف عورت کی حقیقی خوشی اور طمانیتِ قلب کا مدار اس تعلیم پر عمل پیرا ہونے میں ہے بلکہ بحیثیتِ مجموعی انسان کی خوشیوں اور مسرتوں کا انحصار بھی اِس امر پر ہے کہ انسانی تمدّن میں عورت وہ کردار ادا کرے جس کا قرآن کریم اس سے تقاضا کرتا ہے۔

اِس مسئلہ میں آپ کی طرزِ فکر اور طرزِ عمل ان دوسرے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں سے بالکل مختلف تھی جو یا تو مغربیت سے مغلوب ہو کر عورت کی بے سروپا آزادی کے نعرے بلند کرنے لگے تھے اور یا قدامت پسندی کی پناہ گاہوں میں قلعہ بند ہو کر مذہب کے نام پر عورت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنے پر مُصر تھے۔ آپ نے جب اس بارے میں لب کشائی کی تو اسلامی ضابطۂ اخلاق اور مذہبی قدروں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے عورت کے حقوق و فرائض کو متعیّن کیا۔ آپ نے مغربی تعلیم کا رُعب قبول نہیں کیا۔ جدید مغربی نظریات کے مقابل پر آپ کا اندازِ فکر ؏

"نہ آئے ان کے گھر تک رُعبِ دجّال"

کی تصویر تھا۔ آپ نے جب بھی مغربی رجحانات کے مقابل پر اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی اس میں کہیں بھی معذرت کا رنگ نظر نہیں آتا بلکہ ایک نمایاں احساسِ فوقیت پایا جاتا ہے اور آپ ہمیشہ اس یقین اور ایمان سے پُر نظر آتے ہیں کہ جدید مغربی رجحانات آزادی کے نام پر عورت کے حقوق کی بحالی سے زیادہ اس کی ہلاکت کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مشرقی تصوّرات اور قدامت پسند رجحانات سے بھی آپ ہرگز متاثر نظر نہیں آتے۔ مشرقی تصوّرات کو آپ نے مذہب کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا اور جہاں جہاں بھی یہ دیکھا کہ قومی اور مُلکی رواج کے نتیجہ میں عورت کے وہ حقوق تلف کئے جا رہے ہیں جو قرآن اُسے دیتا ہے تو بڑی جرأت اور پامردی کے ساتھ اُن کی بحالی کی کوشش کی۔

آپ نے عورت کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ چنانچہ اس موضوع پر آپ کے ارشادات میں ایک دلکش توازن نظر آتا ہے جو اسلامی تعلیم کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

آپ نے احمدی مستورات کو ایک مثبت پروگرام دیا۔ تاکہ اُن کی توجہات کا رُخ تعمیری مشاغل کی طرف پھر جائے اور اُنھیں یہ احساس دلایا کہ وہ معاشرہ کا ایک مفید اور لازمی جزو ہیں اور قومی تعمیر کے عظیم منصوبوں میں اُن کا ایک مخصوص مقام ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

مشرقی عورت قومی کاموں میں حصہ نہ لینے کی بناء پر احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو چکی تھی جس کے نتیجہ میں بہت سے غلط رجحانات پیدا ہو رہے تھے۔ اور آزادی کا مطلب محض یہ لیا جانے لگا تھا کہ ہر قسم کی پابندیوں سے بغاوت کرتے ہوئے عورت باہر گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ اور مردوں کے شانہ بشانہ ہر وہ کام کرنے لگے جس سے قبل ازیں وہ محروم کی جا رہی تھی۔ اس بے محابا اور غیر محدود آزادی کے نتیجہ میں بہت سی معاشی اور تمدنی برائیاں جنم لینے لگی تھیں اور مغربی تہذیب کا وہ پہلو سوسائٹی کے ایک ایسے حصہ پر غالب آ رہا تھا جس میں آزادی اور بے راہ روی ایک ہی چیز کے دو نام بن جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ عملاً صرف اسی طریق سے ہو سکتا تھا کہ عورتوں میں تعمیری کاموں کا ذوق پیدا کیا جائے۔ اور انہیں اس دائمی اور سچی لذت سے آشنا کیا جائے جو محض نیکی اور خدمت کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

پس آپ ہمیشہ عورتوں کے لئے خدمت اور قربانی کی نئی راہیں متعین کرتے رہے اور اپنے پُرجوش اور ولولہ خیز خطابات سے ان کے دلوں میں خدمت کی ایسی لگن پیدا کر دی جس کی نظیر اس زمانہ کی کسی دوسری تنظیم میں نظر نہیں آتی۔ آپ کی اس عظیم اور حکیمانہ رہنمائی کے نتیجہ میں احمدی مستورات نے میدانِ عمل میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو تاریخِ احمدیت کے آسمان پر ہمیشہ روشن ستاروں کی طرح چمکتے رہیں گے۔ احمدی عورت میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اس کا مقام محض گھر کی چار دیواری نہیں بلکہ اسلام اُسے قومی خدمت کے ہر میدان کی طرف بُلاتا ہے

اور وہ محض مردوں کے پیچھے چلنے کے لئے نہیں بنائی گئی بلکہ اگر وہ چاہے تو نیکی کی دوڑ میں مردوں کو پیچھے چھوڑ سکتی ہے۔

ان تمام امور کو آپ نے کس طرح سرانجام دیا یہ ایک دلچسپ اور طویل حکایت ہے۔ جو آپ کے باون سالہ دَورِ خلافت میں ورق ورق پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ حتی المقدور اختصار کے ساتھ آپ کے نظریات اور کوششوں کا ایک ایسا جامع مرقع پیش کر سکیں جس میں کوئی قابلِ ذکر امر نظر انداز نہ ہو۔

عورتوں کے حقوق کی حفاظت

اسلامی سوسائٹی میں عورت کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں آپ نے ہمیشہ ہر جہت سے کوشش فرمائی اور کوئی پہلو نظر انداز نہ ہونے دیا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی قومی روایات کے نتیجہ میں مسلمان عورت اپنے بہت سے اسلامی حقوق سے محروم ہو چکی تھی اور بحیثیت بیوی بھی اس کے جذبات اور حقوق کو عموماً گھروں میں پامال کیا جاتا تھا۔ چونکہ جماعت احمدیہ میں شامل ہونے والے افراد شروع میں اسی سوسائٹی سے نکل کر آتے تھے۔ اس لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو ان کی تربیت کرنے اور غلط رسُوم سے آزاد کرانے میں غیر معمولی جدوجہد کرنی پڑی اور بار بار نصائح اور انتظامی اقدامات کے ذریعہ آپ نے اُنہیں عورت کے حقوق کی ادائیگی کی عادت ڈالی تاہم یہ مسئلہ آج بھی قابلِ توجہ ہے اور مسلسل کاوش کا محتاج ہے۔

عورت کے حقوقِ وراثت کی بحالی

ہندوستانی معاشرہ کی رُو سے عورت کو جائیداد کے ورثے سے عام طور پر محروم کر دیا جاتا تھا اور چونکہ مغربی روایات بھی اس رسم کو تقویت دے رہی تھیں۔ اس لئے اس پہلو سے جماعت کی تربیت پر آپ نے خاص زور دیا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

"سلسلہ کو قائم ہوئے پچاس سال ہو چکے ہیں۔ کیا ہماری جماعت کے تمام لوگ لڑکیوں کو ترکہ میں سے اُن کا حق دیتے ہیں؟ ہماری جماعت میں اسّی فیصدی پنجاب کے لوگ زمیندار ہیں جن کے

نمائندے اس وقت یہاں بیٹھے ہیں وہ اپنے آپ سے پوچھ لیں۔ کیا
ان میں سے سب نے اپنی بہنوں کو ورثہ میں سے حصّہ دیا۔ یہ کوئی
ایسا حکم نہیں جس کے متعلق کسی قسم کا اختلاف ہو یا کسی اجتہاد کی
ضرورت ہو۔ سب فرقوں کے لوگ اسے درست تسلیم کرتے ہیں
اور نسلاً بعد نسلٍ اسے پہنچایا گیا ہے۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۶ء صٓ)

پھر اس معاملہ میں خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے آپ
نے فرمایا:۔

"حضور (حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السّلام۔ناقل) کی
وفات کے بعد اپنے خاندان کے لحاظ سے ہم نے سب سے پہلا کام یہ
کیا کہ بہنوں کو حصّہ دیا اور والدہ صاحبہ کا حصّہ نکالا۔ اس وقت ایک
سرکاری افسر آیا جس نے آکر کہا کہ آپ قانون کی رُو سے ایسا نہیں
کر سکتے۔ مَیں نے اُسے کہا۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ہم ایسی جائداد
اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں اور اسے لعنت سمجھتے ہیں۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۶ء ص۸-۹)

بعد ازاں ایک اور مجلس مشاورت پر نظارت اصلاح و ارشاد کو اس طرف توجہ
دلاتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"اصلاح و ارشاد کے محکمہ کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے تمام دوستوں
کو اس امر کی تحریک کرتا رہے کہ وہ اپنی جائیداد سے شریعت کے
مطابق اپنی لڑکیوں کو حصّہ دیا کریں .... زمینداروں کو
مَیں نے ایک دفعہ نصیحت کی تھی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو اور بیویوں
کو اپنی جائیداد سے حصّہ دیا کریں اور مجھے یاد ہے کہ اس وقت
بعض دوستوں نے اس پر عمل بھی کیا تھا مگر پھر وہ بھول گئے
انہوں نے سمجھا کہ شاید خدا تعالیٰ کی خوشنودی صرف ایک سال
کیلئے ہی ضروری ہے پھر اس کی ضرورت نہیں۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۷ء ص۴۵ تا ص۴۶)

بیاہ شادی میں عورت کی رضامندی کا حق

بیاہ شادی کے معاملہ میں بھی عموماً مسلمانوں میں غیر اسلامی رسم و رواج راہ پا گئے تھے۔ لڑکی کی رضامندی حاصل کرنا تو ایک دُور کی بات تھی بعض اوقات لڑکیوں سے پوچھا تک نہ جاتا تھا بلکہ ماں باپ اپنی مرضی سے جہاں چاہتے اپنی اولاد کی شادیاں رچاتے تھے۔ آپ نے اس دستور کو بھی توڑ دیا اور جماعت میں یہ عادت ڈالی کہ لڑکوں ہی سے نہیں لڑکیوں سے بھی باقاعدہ اجازت حاصل کی جایا کرے اور اگر کوئی لڑکی ناپسند کرے تو اس کی مرضی کے خلاف شادی نہ کی جائے۔ ایسی صُورتیں بھی بعض اوقات پیدا ہو جاتی ہیں کہ ماں باپ کسی ایک رشتے پر راضی ہوں لیکن لڑکی وہاں رضامند نہ ہو یا اس کے برعکس لڑکی کسی اور جگہ شادی کرنا چاہے اور ماں باپ کو اس پر تسلی نہ ہو۔ ایسی صورت میں آپ نے اسلامی تعلیم کے مطابق یہ طریق جماعت میں رائج فرمایا کہ ماں باپ کی طرح لڑکی کو بھی یہ حق ہوگا کہ وہ خلیفۂ وقت یا قضاء کی طرف رجوع کرے۔

چنانچہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایسے اختلافات کا فیصلہ خلیفۂ وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا اور خود آپ نے یا آپ کی نمائندگی میں قضاء نے دونوں طرف کے حالات پر غور کرنے کے بعد لڑکی اور خاندان کی بہبود کو مدِّ نظر رکھ کر فیصلہ دیا۔

طلاق کی حوصلہ شکنی

بایں ہمہ آپ ہرگز یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اس جماعت میں طلاق کا رواج عام ہو جس میں شادی سے قبل ہر قسم کی چھان بین اور رضامندی حاصل کرنے کے متعلق ایسا معقول اور سلجھا ہُوا طریق رائج ہو اور فریقین کو شادی سے قبل بشرح صدر فیصلہ کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۵۴ء کی مجلس شوریٰ میں جماعت کو اس طرف توجہ دلاتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں پُرزور نصیحت فرمائی:۔

> "شادی کے وقت کوئی شخص تمھیں مجبور نہیں کرتا کہ تم ضرور فلاں عورت سے شادی کرو۔ شریعت نے تمھیں یہ حق دیا ہے کہ شادی سے قبل تم لڑکی کو دیکھ لو اور اس کے متعلق تحقیقات کر لو۔ اور

عورت کو بھی شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ خاوند کو دیکھ لے اور اس کے متعلق تحقیقات کر لے۔ لیکن جب تعلق قائم ہو جاتا ہے تو تمہیں ایک دوسرے کی ایسی باتیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ جماعت کے بعض افراد بڑی آزادی کے ساتھ اس تعلق کو توڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی انصاف ہے؟ یہ تو عورت کو ذلیل کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن کریم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لوگوں کو توجہ دلائی ہے۔ کہ تم عورتوں کے ساتھ لیٹتے ہو اور پھر ان کے حقوق ادا نہیں کرتے یہ کتنی قابلِ شرم بات ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اگر تم مجبور ہو کر کسی عورت کو اپنے ازدواجی تعلق سے علیحدہ بھی کرنا چاہو تو اسے احسان کے ساتھ علیحدہ کرو۔ لیکن یہاں ایک مقدمہ دکھاؤ جہاں خاوند یہ کہتا ہو کہ مَیں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہوں۔ اور مقرر کردہ مہر اُسے دیتا ہوں ...... اگر مجبور ہو کر بیوی خلع بھی کرالے تو قاضی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے خاوند سے مہر دلائے کیونکہ خاوند طلاق دینا چاہتا ہے لیکن مہر دینے پر راضی نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بیوی کو خلع لینے پر مجبور کر دیا قاضی کا یہ حق ہے کہ وہ اس قسم کے خلع کو طلاق قرار دے کر بیوی کو اس کا مہر دلائے۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۴ء صفحہ ۷۲-۷۳)

عورتوں کی تربیت

حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کو مستورات کی تربیت اور ترقی کا خاص طور پر خیال رہتا تھا۔ یہاں تک کہ منصبِ خلافت پر فائز ہونے سے قبل بھی آپ حتی المقدور اس امر میں کوشاں رہے کہ احمدی مستورات اپنے مقام کو سمجھیں اور علم وفضل میں ہر جہت سے ترقی کریں۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں الفضل کے سب سے پہلے پرچے میں آپ نے خصوصیت

کے ساتھ مستورات کے لئے دو الگ کالم مقرر فرمائے اور ساتھ ہی اس احساس کا بھی ذکر کیا کہ اگرچہ دو کالم بہت کم ہیں لیکن عورتوں میں علمی دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔

عورتوں کا اوّلین مقام

مشرقی سوسائٹی میں یہ مقولہ آپ نے اکثر سُنا ہوگا کہ "عورت کا اوّلین مقام گھر کی چار دیواری ہے۔" اس مقولہ میں جو لفظ مقام آتا ہے اگر تو اس کے معنی حقیقت میں مقام ہی لیا جائے۔ جس میں فرضِ منصبی کے علاوہ عزّت و احترام کے معنی بھی پائے جاتے ہیں تو ہرگز یہ مقولہ کوئی قابلِ اعتراض مقولہ نہیں بلکہ قوموں کی تعمیر اور ترقی کے لئے حکمت اور معرفت سے لبریز ایک بیش بہا اصول پیش کرتا ہے لیکن افسوس کہ مشرقی سوسائٹی میں "مقام" کے معنے زیادہ تر اسی قدر لئے جاتے ہیں کہ گویا گھر کی چار دیواری عورت کا قید خانہ ہے جہاں ایک جابر خاوند کے استبداد کے تحت لونڈیوں کی طرح زندگی بسر کرنا ہی عورت کا مقام ہے۔ لیکن حضرت مصلح موعودؓ کے نزدیک مقام کے یہ معنی نہ تھے بلکہ اس سے آپ عورت کی اہم اور وسیع تر قومی نوعیت کی ذمہ داریاں مراد لیتے تھے جن کی ادائیگی کی صورت میں عورت ایک نہایت بلند اور رفیع الشان مقام کو پا لیتی ہے۔ آپ کے نزدیک عورت کا اصل مقام محض بچے پیدا کرنا اور پالنا ہی نہیں بلکہ بچوں کے کردار کی تعمیر ہے۔ نئی نسلوں کی استعدادوں کی بہترین نشوونما میں بھرپور حصّہ لیتا ہے ان کی ذہنی اور فکری اور عملی صلاحیتوں کو حسین سانچوں میں ڈھالنا ہے گویا اسلامی سوسائٹی میں عورت کو ویسا ہی کردار ادا کرنا ہے جیسے ایک انجینئر ایک آرکیٹیکٹ کے بنائے ہوئے نقشے کو عملی جامہ پہنانے میں ادا کرتا ہے۔ قرآن و سنّت نے انسانی سوسائٹی کا جو حسین اور دلکش نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق آپ اگلی نسلوں کی تعمیر و تشکیل کی اوّلین ذمہ دار عورت ہی کو سمجھتے تھے خلافت پر فائز ہونے سے قبل بھی آپ کو اس امر کا بہت خیال رہتا تھا۔ چنانچہ بحیثیت مدیر الفضل آپ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا اُس میں سے چند اقتباسات ھدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں :-

"اس وقت مسلمانوں کی حالت کیوں خراب ہے وہ دن بدن دین کو کیوں چھوڑ رہے ہیں اس لئے کہ جب وہ بچّہ تھے تو ماؤں سے انہیں دین کی تعلیم نہیں ملی اور جب مدارس میں گئے تو پھر تو دہریت کی صدائیں کان میں آنے لگیں ......"

(الفضل ۱۹ر جون ۱۹۱۳ء صا۱۱)

اور پھر فرماتے ہیں :-

"جو ماں اپنے بچّے کو صبح کے وقت نہیں اُٹھانے دیتی اور اس کی نیند کو نماز سے افضل سمجھتی ہے - جو روزہ سے اُسے اس لئے روکتی ہے کہ لڑکے کو تکلیف نہ ہو - جو اپنے بچّے کے کان میں قرآن شریف کی مبارک آواز کبھی نہیں پہنچاتی - جس کی زبان پر اسلام کا نام بھی کبھی نہیں آتا - اگر اس کی اولاد دین سے بے بہرہ رہے تو اس میں کیا تعجّب ہے - اس پر حیرت کی کیا وجہ ہے - بلکہ اس کا بچّہ دیندار ہو تو ایک غیر معمولی بات ہے ۔"

(الفضل ۱۹ر جون ۱۹۱۳ء)

لیکن اس خستہ حالت کی اصل ذمہ دار عورت نہیں تھی بلکہ اس صورتِ حال کے اصل ذمہ دار مرد تھے - جنہوں نے مناسب رنگ میں اپنی عورتوں کی طرف توجّہ کرنے کی بجائے ایک غیر اسلامی جابرانہ رویّہ اختیار کئے رکھا - اس ضمن میں آپ نے فرمایا :-

"مرد عورتوں کی غلطی پر لٹھ لے کر مارنے پر تو تیار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی اصلاح کی فکر بالکل نہیں کرتے حالانکہ ان کی اصلاح کی ذمہ داری خدا نے ان پر رکھی تھی اور اب عورتوں کی گری ہوئی حالت اور نئی نسلوں کی دین سے بے تعلقی کے یہی ذمہ دار ہیں ۔"

(الفضل ۱۹ر جون ۱۹۱۳ء)

عورت کا منصب آپ کے اپنے الفاظ میں

۱۹۱۴ء میں جب آپ مسندِ خلافت پر متمکّن ہوئے تو پہلے جلسہ سالانہ کے موقع پر

مستورات سے جو آپ نے خطاب فرمایا وہ عورت کے مقام کے بارہ میں آپ کے نظریات اور عورت کی ترقی کے سلسلہ میں آپ کی دلی تڑپ اور تمناؤں کا آئینہ دار ہے آپ نے فرمایا۔

"عورتوں نے اپنے آپ کو خود ہی ذلیل اور کم درجہ سمجھ لیا ہے۔ ورنہ اللہ تعالےٰ نے تو ان کو بھی آدمی پیدا کیا تھا۔ ... کان دل، زبان جو علم کے حصول کے لئے ہیں ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ویسے ہی دیئے ہیں جیسے مردوں کو۔ انہوں نے خود ہی سمجھ رکھا ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتیں۔ کم علم ہیں۔ ناقص العقل ہیں یہ خیالات غلط ہیں۔ تم اپنی اولادوں پر رحم کرو انہیں دینِ اسلام سکھاؤ۔ کیونکہ پہلا مدرسہ والدہ کی گود ہے۔ اپنے خاوندوں۔ اپنے بھائیوں۔ اپنے بیٹوں کو مجبور کرو کہ وہ تمہیں اللہ کی کتاب سکھائیں۔ اسلام کے لئے دل میں درد پیدا کرو ..... کیا تم سُکھ کی نیند سوؤ گی اگر تمہارا کوئی بچہ پڑا تڑپ رہا ہو۔ اسی طرح اسلام پیاسا بھوکا تڑپتا ہے۔ اس کی خبرگیری کرو...... تم خدا کے لئے اپنے اندر اسلام کے لئے درد پیدا کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت عورتوں نے ایسی نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں کہ بڑے بڑے مرد ان پر فخر کرتے تھے۔ قریبًا نصف احادیث کی بیان کرنے والی عورتیں ہی ہیں۔ سو اگر تم کرنے لگو تو بڑے بڑے عظیم الشان کام اب بھی کر سکتی ہو۔" (الفضل ۳ جنوری ۱۹۱۵ء ص۵ کالم ۳)

پھر ایک اور موقع پر فرمایا۔

"یاد رکھو کہ کوئی دین ترقی نہیں کر سکتا جب کہ عورتیں ترقی نہ کریں۔ پس اسلام کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ تم بھی ترقی کرو۔ عورتیں کمرہ کی چار دیواروں میں سے دو دیواریں ہیں اگر کمرہ کی دو دیواریں گر جائیں تو کیا اس کمرہ کی چھت ٹھہر سکتی ہے۔"

(الفضل ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء)

مساوات کے نتیجہ میں عاید ہونیوالی ذمّہ داریاں

عورت اور مَرد کے درمیان مساوات کے کیا معنے ہیں اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے عورتوں کو ان ذمّہ داریوں کی طرف متوجّہ کیا جو اس نظریۂ مساوات کے نتیجہ میں ان پر عاید ہوتی ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

"دین کے معاملہ میں مرد اور عورتیں دونوں یکساں جوابدہ ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دین کی اشاعت میں دونوں حصّہ لیں اور جب تک دونوں حصّہ نہ لیں اس وقت تک خدا تعالےٰ کی پوری برکت ان پر نازل نہیں ہوسکتی۔ ....

پھر مَیں کہتا ہوں مرد مردوں میں اور عورتیں عورتوں میں تبلیغِ دین کریں۔ وقت گزر رہا ہے۔ مگر کام جس رفتار سے ہونا چاہیئے اس سے نہیں ہو رہا .... پس عورتیں اور مرد پہلے اپنی درستی کریں اور پھر دوسرے لوگوں تک دین کو پہنچائیں"

(الفضل ۱۵ ر مارچ سنہ ۱۹۲۰ء)

ایک خطبہ جمعہ کے دَوران آپ نے اس مضمون پر مزید روشنی ڈالی اور مغربی طرز کی آزادی کی مذمّت کرتے ہوئے اسے اشاعتِ دین کی راہ میں روک قرار دیا۔ اور احمدی عورت کو اس ذمّہ داری کی طرف متوجّہ کیا جو اسلام اس پر عاید کرتا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

"چند مہینوں سے مَیں غور کر رہا تھا کہ ہماری تبلیغ کے راستے میں بہت سی مشکلات نظر آرہی ہیں۔ ہماری اندرونی اور بیرونی تبلیغ بہت سُست ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ مَیں نے غور کرکے سمجھا کہ اس کی زیادہ تر وجہ عورتوں میں اس آزادی اور بے دینی کا پیدا ہونا ہے جو ان میں مغرب کے اثر کی وجہ سے آگئی ہے ویسے تو اسلام نے بھی عورتوں کو آزادی دی ہے لیکن ان کی مغربی رنگ کی آزادی اُن کے احمدیّت قبول

کرنے میں مانع ہے اور جب آزادی عورت کے احمدیت قبول
کرنے میں مانع ہوتی ہے تو ماں کے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اسے
بھی وہ احمدیت کے قبول کرنے سے روکتی ہے۔ اس طرح وہ
اپنے خاوند کو بھی احمدیت کے قبول کرنے سے روکے گی کیونکہ
اگر وہ احمدیت کو قبول کرے تو اس کی آزادی میں فرق
آجائے گا۔ غرض عورتیں ہماری تبلیغ میں روک بن رہی ہیں۔
..... اس کا ایک ہی علاج ہو سکتا ہے وہ یہ کہ عورتیں مبلغ
بنیں اگر وہ عورتوں میں تبلیغ کریں گی تو ہمارے رستے سے یہ
روک یقیناً ہٹ جائے گی"

(خطبہ جمعہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۹ء مطبوعہ الفضل ۲۶ر اپریل ۱۹۵۰ء)

احمدی عورت سے آپ کی توقعات

آپ احمدی خاتون سے صرف یہی توقع نہیں رکھتے تھے کہ وہ خود اسلامی ضابطۂ اخلاق کی پابندی کرے بلکہ مردوں سے بڑھ کر اس پر یہ ذمہ داری عاید کرنا چاہتے تھے کہ وہ از خود دوسری مستورات سے بھی اسلامی ضابطۂ اخلاق کی پابندی کروائے۔ اس ضمن میں حسب ذیل اقتباس احمدی عورت سے آپ کی توقعات کا مظہر ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"عورتوں سے مصافحہ کرنے کی رسم کو اب چھوڑنا چاہیئے اور خود
عورتوں کے اندر یہ احساس پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ اس سے بچیں
جب عورتوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے گی تو وہ خود
دوسروں کو سنبھال لے گی۔ یاد رکھیں کہ عورتوں کے اندر ایمان
کی ایک خاص مناسبت ہے۔ ایک دو مخلص عورتوں کو خوب
سمجھا کر وہ باتیں جو عورتوں سے متعلق ہیں ان کے دلوں میں
خوب رچا دیں۔ پھر دیکھیں کہ وہ کس طرح سیفِ مسلول بن کر
دوسری عورتوں کو اپنا ہم خیال بنا لیتی ہیں۔ یہ کام بغیر عورتوں
کی مدد کے نہ ہو گا"   (الفضل ۲۵ر جنوری ۱۹۲۳ء صفحہ ۵)

اندازِ تربیت اور ٹھوس عملی پروگرام

آپ کا طریقِ تربیت پُر حکمت اور پُر سوز تھا۔ آپ کی نصائح میں درد بھی تھا اور گہری حکمت بھی پائی جاتی تھی۔ آپ محض نصیحت ہی نہ کرتے بلکہ ٹھوس اور واضح استدلال کے ساتھ اس کی حکمت اور افادیت بتا کر ذہنوں کو قائل کرتے۔ آپ کی باتیں خلوص میں ڈوبی ہوئی ہوتیں جو قلوب کو متأثر کرتیں اور جذبات میں ایک نیک ہیجان پیدا کر دیتی تھیں ؎

سخن کز دل بروں آید نشیند لاجرم بر دل

آپ نے احمدی عورت کے اخلاق کی تعمیر کے لئے محض زبانی نصائح پر انحصار نہ کیا بلکہ ایسے عملی پروگرام دیئے اور ان پر عمل کروایا جس کے نتیجہ میں انہیں نیک کاموں سے ذاتی محبت پیدا ہو گئی اور وہ اس ابدی صداقت سے اچھی طرح آشنا ہو گئیں۔ کہ حقیقی اور دائمی اور غیر فانی پاکیزہ لذّت خدمتِ دین اور خدمتِ خلق کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

احمدی خواتین سے ایک منفرد قربانی کی تحریک

عورتوں میں خدمتِ دین کا جذبہ پیدا کرنے کے بعد آپ نے اُن پر خدمتِ دین کی بھاری قومی ذمہ داریوں کا بوجھ اس توقع اور یقین کے ساتھ ڈالا کہ وہ اسے بشاشتِ قلب کے ساتھ قبول کریں گی اور تمام توقعات پر پوری اُتریں گی۔ چند سالہ تربیت کے بعد ہی آپ نے جان لیا تھا کہ اب وقت آچکا ہے کہ احمدی عورت کے کردار کو یورپ کی آزاد قوموں کے سامنے اسلام کی نمائندگی میں ایک نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جب جرمنی میں پہلا خدا کا گھر بنانے کا سوال پیدا ہوا تو آپ نے مستورات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> "میرا یہ منشاء ہے کہ جرمنی میں مسجد عورتوں کے چندہ سے بنے کیونکہ یورپ میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم میں عورت جانوروں کی طرح سمجھی جاتی ہے۔ جب یورپ کو یہ معلوم ہو گا کہ اس وقت اس شہر میں جو دنیا کا مرکز بن رہا ہے اس میں مسلمان عورتوں نے

جرمنی کے نومسلم بھائیوں کے لئے مسجد تیار کروائی ہے تو یورپ کے لوگ اپنے اس خیال کی وجہ سے جو مسلمان عورتوں کے متعلق ہے کس قدر شرمندہ اور حیران ہوں گے اور جب وہ اس مسجد کے پاس سے گزریں گے تو اُن پر ایک موت طاری ہوگی اور مسجد باآوازِ بلند ہر وقت پکارے گی کہ پادری جھوٹ بولتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ عورت کی اسلام میں کچھ حیثیت نہیں "

(الفضل ۸ر فروری ۱۹۲۳ء صہ)

احمدی عورت ان توقعات پر کس طرح پوری اُتری، یہ ایک طویل ایمان افروز داستان ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں تاہم قارئین کے سامنے محض ایک دو جھلکیاں پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے تاکہ وہ اندازہ کرسکیں کہ آپ کے خطابات کے نتیجہ میں احمدی خاتون کس قوت اور جذبہ کے ساتھ خدمتِ دین پر کمربستہ ہوچکی تھی۔ تحریک مسجد برلن کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے ایک خطبہ جمعہ میں فرمایا:۔

" مَیں نے اس مسجد کی تحریک کے لئے یہ شرط رکھی تھی کہ احمدی عورتوں کی طرف سے یہ مسجد ہوگی جو ان کی طرف سے نومسلم بھائیوں کو بطور ہدیہ پیش کی جائے گی اب بجائے اس کے کہ وہ عورتیں جنہیں کمزور کہا جاتا ہے اس تحریک کو سُنکر پیچھے ہٹتیں عجیب نظارہ نظر آیا اور وہ یہ کہ اس تحریک پر اس وقت تک گیارہ عورتیں احمدیت میں داخل ہوچکی ہیں تاکہ وہ بھی اس چندہ میں شامل ہو سکیں۔ . . . . . مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ عورتیں پہلے ہی احمدی تھیں کوئی اس لئے مذہب نہیں بدلا کرتا کہ چندہ دے۔ وہ پہلے احمدی تھیں مگر ان میں احمدیت کے اظہار کی جرأت نہ تھی۔ اب انہوں نے دیکھا کہ اگر اب بھی جرأت نہ کی تو اس ثواب سے محروم رہ جائیں گی۔ گویا اس طرح اس تحریک نے گیارہ روحوں کو ہلاکت سے بچا لیا اور یہ پہلا پھل ہے جو اس تحریک سے ہم نے چکھا ہے"

اسی خطبہ کے تسلسل میں حضور رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

پھر یہ بھی ایمان کی علامت ہے کہ کئی لوگ لکھ رہے ہیں آپ
دُعا فرمائیں میری بیوی چندہ دینے میں کمزوری نہ دکھائے.....
پھر بعض لکھ رہے ہیں کہ وفات یافتہ بیوی کی طرف سے چندہ
دینے کی اجازت دی جائے۔ غرض یہ ایسا نظارہ ہے کہ جو اپنی
نظیر نہیں رکھتا اور جس کا نمونہ صحابہ کے زمانہ میں ہی پایا جاتا
ہے" (الفضل ۸ مارچ ۱۹۲۳ء)

قادیان کی مستورات کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے ایک غریب عورت کی قربانی کی ایک ایسی مثال پیش کی جس پر ہمیشہ امراد بھی رشک کرتے رہیں گے۔ فرمایا:-

"قادیان کی عورتوں کا چندہ پہلے ہی جلسہ میں ساڑھے آٹھ ہزار
تک پہنچ گیا ہے اور ابھی بڑھ رہا ہے اور غالباً کچھ تعجب نہیں
کہ دس ہزار تک پہنچ جائے۔ جس اخلاص اور جوش سے انہوں
نے چندہ دیا ہے۔ اس کا اندازہ غریب عورتوں کے چندہ سے
کیا جا سکتا ہے جن کی آمد کا کوئی ذریعہ نہیں........

ایک اور پٹھان عورت جو نہایت ضعیف ہے اور چلتے وقت
بالکل پاس پاس قدم رکھ کر چلتی ہے میرے پاس آئی اور اس نے
دو روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے........ اس کی زبان پشتو
ہے اور وہ اُردو کے چند الفاظ ہی بول سکتی ہے اپنی ٹوٹی پھوٹی
زبان میں اپنے ایک ایک کپڑے کو ہاتھ لگا کر کہنا شروع کیا۔ یہ
دوپٹہ دفتر کا ہے یہ پاجامہ دفتر کا ہے۔ یہ جوتی دفتر کا ہے۔ میرا
قرآن بھی دفتر کا ہے یعنی میرے پاس کچھ نہیں۔ میری ہر ایک چیز
بیت المال سے مجھے ملی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ایک طرف
تو میرے دل پر نشتر کا کام کر رہا تھا دوسری طرف میرا دل اس
محسن کے احسان کو یاد کر کے جس نے ایک مُردہ قوم میں سے ایسی
زندہ اور سرسبز رُوحیں پیدا کر دیں شکر و امتنان کے جذبات
سے لبریز ہو رہا تھا اور میرے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی خدایا

تیرا یہ مسیح کس شان کا تھا جس نے ان پٹھانوں کی جو دوسروں کا مال لوٹ لیا کرتے تھے اس طرح کایا پلٹ دی کہ وہ تیرے دین کے لئے اپنے ملک اور اپنے عزیز اور اپنے مال قربان کر دینے کو ایک نعمت سمجھتے ہیں "

(الفضل ۱۲ر فروری ۱۹۲۳ء صٓ)

اخلاص اور قربانی میں قادیان سے باہر کی مستورات بھی کسی طرح پیچھے نہ تھیں چنانچہ بیرون قادیان کی احمدی مستورات کے جذبۂ قربانی کی بعض مثالیں دیتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"قادیان سے باہر کے خاص چندوں میں سے سب سے اوّل نمبر پہ کپتان عبدالکریم صاحب سابق کمانڈر ان چیف ریاست خیرپور کی اہلیہ کا چندہ ہے جنہوں نے اپنا کُل زیور اور اعلیٰ کپڑے قیمتی ڈیڑھ ہزار روپیہ فی سبیل اللہ دے کر ایک نیک مثال قائم کی ہے۔ دوسری مثال اسی قسم کے اخلاص کی چوہدری محمد حسین صاحب صدر قانونگو سیالکوٹ کے خاندان کی ہے۔ ان کی بیوی، بھاوج بہو نے اپنے زیورات قریبًا سب کے سب اس چندہ میں دے دیئے جن کی قیمت اندازًا دو ہزار روپیہ تک پہنچتی ہے۔

تیسری مثال اسی قسم کے اخلاص کے نمونہ کی سیٹھ ابراہیم صاحب کی صاحبزادی کی ہے اس مخلص بہن نے بھی اپنے کُل زیورات جو اندازًا ایک ہزار روپے کی قیمت کے ہوں گے چندہ میں دے دیئے ہیں۔

چوتھی مثال اعلیٰ درجہ کے اخلاص کی خان بہادر محمد علی خانصاحب اسسٹنٹ پولیٹکل افسر چکدرہ کی اہلیہ صاحبہ اور دختر کی ہے جنھوں نے اپنا زیور جس کی قیمت اندازًا ایک ہزار روپیہ سے زائد ہو گی اس چندہ میں دے دیا بلکہ خان بہادر صاحب کی اہلیہ صاحبہ نے اپنی مرحومہ دختر کا ایک زیور بھی

جوانہوں نے بطور یادگار رکھا ہوا تھا مرحومہ کی طرف سے چندہ میں دے دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

پانچویں مثال میاں عبداللہ صاحب سنوری ریاست پٹیالہ کی بیوی، بیٹی اور بہو کی ہے۔ جنہوں نے نہایت محدود ذرائع آمدن کے باوجود دو سو روپے سے اوپر چندہ بصورت نقد اور زیور دیا" (الفضل یکم مارچ ۱۹۲۳ء۔ الحکم ۲۸ر فروری ۱۹۲۳ء)

مختلف احمدی دوستوں نے اپنے گھروں میں احمدی عورت کے اخلاص کے جو نظارے دیکھے ان کا ایک نمونہ ڈاکٹر شفیع احمد صاحب محقق دہلوی ایڈیٹر روزنامہ "انفاق" دہلی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

"جمعہ کی نماز جماعت دہلی خاکسار کے دفتر میں پڑھتی ہے جو لبِ سڑک واقع ہے۔ گزشتہ جمعہ کو خطیب نے حضرت اقدس کا خطبہ جو الفضل میں چھپا ہوا تھا سنایا۔ یہاں سوائے میری اہلیہ کے باقی تمام مرد تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ بیگم سے نماز کے بعد کہوں گا کہ مسجد کے لئے آپ اپنی پازیب دے دیں کہ اتنے میں دروازہ کی کھٹکھٹاہٹ میرے کان میں آئی اور میں گھر میں گیا۔ جہاں وہ مصلّے پر بیٹھی ہوئی خطبہ سن رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کچھ بات نہیں کی اور اپنے گلے سے پنج لڑا طلائی ہار جو غالباً تین سو روپے کا تھا مجھے دے دیا جو میں نے اسی وقت خطیب صاحب کو لا کر دے دیا"

(الفضل ۲۶ر فروری ۱۹۲۳ء صفحہ ۹)

عورت کو اس کا کھویا ہوا مقام دلوانے اور اس کے کردار کی از سرِ نو تعمیر کیلئے آپ نے یہ حکیمانہ طریق اختیار کیا کہ نیکی کی ہر تحریک میں مردوں کے ساتھ احمدی عورت کو بھی مخاطب فرماتے۔ سلسلہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیشِ نظر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ جماعت کے مالی وسائل بڑھانے کے بارہ میں بھی غور کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں جو مختلف تجاویز اور تحریکات آپ نے جماعت کے سامنے پیش کیں ان

میں سے ایک یہ بھی کہ ہر شخص خواہ اس کا ذریعۂ معاش کوئی بھی ہو اپنے روزمرّہ کے کام کے علاوہ کوئی ایسا چھوٹا سا کام محض اس نیّت سے کرے کہ اس کی ساری آمد تبلیغ اسلام کے لئے پیش کر دے۔ آپ کی اس تحریک پر بھی جماعت کے مَردوں اور عورتوں نے برابر جوش کے ساتھ حصّہ لیا۔ عورتوں نے جس اخلاص اور دلی جذبہ کے ساتھ اس تحریک پر لبّیک کہی اس کا اظہار حسبِ ذیل روایت سے ہوتا ہے۔ ایک خاتون جن کا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے حرمِ اوّل حضرت سیّدہ امّ ناصر رضی اللہ عنہا کے ہاں آنا جانا تھا، اس بارہ میں روایت کرتی ہیں:۔

حضرت خلیفۂ ثانیؓ کے وقت میں مستورات کو بھی چندہ کی تحریک کی جاتی اور مستورات بخوشی شامل ہوتیں۔ جب حضور خلیفۂ ثانی نے تحریک شروع کی کہ اپنے ہاتھ سے کام کرکے چندہ دیا جائے تو مَیں حضور کے گھر امّ ناصرؓ کے پاس بیٹھی تھی۔ حضور نے کہا "مَیں سُرمہ پیس کر فروخت کرکے چندہ دُوں گا اپنے ہاتھ سے کام کرکے"۔ مَیں نے کہا "حضور میں بھی ساتھ سرمہ پسوا دوں گی۔ ساتھ شامل ہو جاؤں گی"۔ فرمایا۔ نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ مَیں خود اپنے ہاتھ سے پیسوں گا اور تم خود کچھ کام کرو"۔ دو تین دن کے بعد امّ ناصر کے گھر پھر گئی اور امّ ناصر سے کہا "کیا کروں کام مجھے کوئی آتا نہیں۔ چندہ ضرور دینا ہے"۔ امّ ناصر نے کہا "مجھے بھی یہ بڑی سوچ ہے کیا کام کیا جائے۔ میاں رفیق وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے "اُمّی جان میرے بوٹوں کو پالش نہیں کروائی"۔ امّ ناصر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں "مَیں تیرے بوٹوں کو پالش کروں گی۔ تم مجھے ایک آنہ دے دیا کرو۔ مَیں وہ چندہ میں دے دُوں گی"۔ مَیں نے کہا "مَیں تو ایک مہینہ کسی کے گھر کام کروں گی"۔ امّ ناصر نے فرمایا "اور کسی کے پاس کیوں جاتی ہو۔ میرے پاس آؤ دونوں بہنیں بیٹھا کریں گی۔ حضور کے کپڑوں کی مرمت تم کر دیا کرنا۔ پھر ہنسنے لگیں اور کہا "مہینہ کیا لو گی؟" مَیں نے کہا ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔

دیکھو خدا جو سامان بنائے۔ خدا کی حکمت سیرت النبی کا جلسہ آگیا۔ عورتیں دکانیں لگایا کرتی تھیں۔ مَیں نے کہا۔ مَیں تو پان بیچوں گی۔ امِ ناصر نے کہا۔ ہم دونوں بہنوں کا حصّہ ہوگا۔ مَیں پان منگوا دُونگی پان اور کتھّہ تو امِ ناصر نے دیا اور دوسری چیزیں چھالیہ الائچی وغیرہ مَیں نے اپنی ڈالیں۔ .... ہماری نیت چندہ دینے کی تھی۔ خدا کے فضل سے میرے پان خوب بکے۔ پچاس پان کیا چیز تھی۔ پان ہاتھوں ہاتھ بِک گئے۔ امِ ناصر بھی میرے پاس آئیں اور کہا۔ "مَیں کیا کام کرسکتی ہوں۔ مَیں نے کہا آپ جائیں مَیں خود یہ کام کرلوں گی۔ جب گھر میں آکر ڈبّہ میں ڈالی ہوئی نقدی کا حساب کیا تو اس میں چوبیس روپے نکلے۔ بارہ روپے امِ ناصر کے اور بارہ روپے میرے حصّے میں آئے۔ مَیں وہ بارہ روپے لے کر حضور خلیفۃ ثانی کی خدمت میں اسی وقت حاضر ہوگئی۔ اور عرض کیا حضور یہ لیں پیسے۔ مَیں تو اپنا کام کرکے آئی ہوں۔ آپ نے تو مجھ سے سُرمہ نہیں پسوایا تھا۔ میرا بھی خدا نے کام بنا دیا۔"

اس روایت سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہر اُس تحریک پر جو جماعت کے سامنے پیش کرتے تھے اوّل خود عمل فرماتے۔

نیکی کی عادت ڈالنا

جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے لجنہ اماءاللہ کی تنظیم قائم فرمائی۔ تو مستورات میں بنی نوع انسان کی سچی ہمدردی پیدا کرنے سے متعلق بعض ہدایات دیں فرمایا

"غرباء کی ہمدردی بھی ایک ضروری بات ہے اس کے دو طریق بہت عمدہ ہیں۔ بیوہ اور غریب عورتوں کی دعوت لجنہ کی طرف سے ہُوا کرے اور اپنے ہاتھوں سے سب کام کریں اور ان کے ہمراہ بیٹھ کر کھاویں تاکہ ان کے دل پر محبت کا اثر ہو۔ اس طرح تکبر کے کیڑے کو نکال دو۔ یتیم بچوں کو ٹی پارٹیاں دی جاویں۔ وہ محبت کے طالب

ہوتے ہیں۔ اُن سے محبت و شفقت کا سلوک کیا جاوے۔ اس
طرح سے مایوسی اور بداخلاقی دُور ہو جاوے گی۔"

(احمدی خاتون فروری ۱۹۲۳ء)

اسی سال مشاورت کے موقع پر اس حصۂ مضمون کو دُہراتے ہوئے آپ نے اپنی جماعت کے سامنے لجنہ کا جو پروگرام رکھا اس میں خدمتِ خلق کو خاص اہمیّت دی۔ آپ نے فرمایا۔

"اس کی (یعنی لجنہ اماء اللہ کی) ممبر مستورات خواہ وہ امیر ہوں یا
غریب مل کر کھائیں اور پھر یتامیٰ اور غرباء کو اپنے ہاتھ سے کھانا
کھلائیں اور ان کی خدمت کریں۔ یتیم بچے جو کسی جماعت کا اچھا حصّہ
بن سکتے ہیں جب وہ ہر طرف سے سختی اور بے مہری دیکھتے ہیں تو
ان کے دل سے محبت اور نرمی غائب ہو جاتی ہے۔ پس جب وہ
ان کو بلائیں گی ان کی خدمت کریں گی اور ان سے حسنِ سلوک سے
کام لیں گی تو ان میں بھی اچھے احساسات پیدا ہوں گے اور ان کی
آئندہ زندگی درست ہو جائے گی۔ دل پر اثر ڈالنے والی اس قدر
تقریر نہیں ہو سکتی جس قدر حُسنِ سلوک ہو سکتا ہے۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۷-۱۸)

آپ کی سیرت کا یہ خاص پہلو ہے کہ آپ محض ہدایات جاری کرنے پر اکتفا نہ فرماتے تھے بلکہ ہمیشہ اس کی نگرانی فرماتے کہ ان ہدایات پر باحسن طریق عمل شروع ہو چکا ہے یا نہیں۔ چنانچہ لجنہ کو یہ ہدایت دینے کے بعد اس کا آغاز بھی خود اپنی نگرانی میں کروایا۔ اس واقعہ کا ذکر حضور کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:۔

"آج لجنہ کا ایک تمدّنی جلسہ مَیں نے کرایا ہے اس میں بیوہ عورتوں
کو دعوت دی گئی ہے اور لجنہ کی ممبروں ہی نے سب کام اپنے ہاتھ
سے کیا ہے کسی نے کھانا پکایا اور کسی نے ہاتھ دُھلائے۔ پھر سب
نے باہم مل کر کھانا کھایا.........
ایسا ہی اب میرا ارادہ ہے کہ ایک جلسہ لجنہ کی ممبروں سے
یتامیٰ کی دعوت کا کرائیں......... یتامیٰ کے اندر جو جذبات

محبّت اور پیار کے ہوتے ہیں وہ دب جاتے ہیں کیونکہ والدین کا سایہ سر پر نہیں ہوتا وہ کس سے محبّت کا اظہار کریں۔ اس لئے اس طریق پر جب یہ بیبیاں ان بچّوں کو اپنے پاس بٹھا کر ان سے محبّت اور پیار کا برتاؤ کریں گی اور ان کو بہلائیں گی تو وہ دبے ہوئے جذبات پھر زندہ ہو جائیں گے اور اس سے ان کی اخلاقی قوتوں پر بھی اثر پڑے گا۔" (الحکم ۷ فروری ۱۹۲۳ء صفحہ ۲)

لجنہ اماء اللہ کا قیام

احمدی مستورات کی تاریخ میں حضرت سیّدہ امۃ الحیؓ حرم ثانی حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا نام ہمیشہ سُنہری حروف میں لکھا جائے گا اور دل انہیں محبّت سے یاد کرتے ہوئے دُعائیں دیں گے کیونکہ احمدی خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے یہ ان ہی کی دِلی تڑپ تھی جو بالآخر عالمی تنظیم لجنہ اماء اللہ کی تشکیل کا محرّک بنی۔ اگرچہ اس میں شُبہ نہیں کہ حضرت مصلح موعودؓ قومی تعمیر و تنظیم کی وہ غیر معمولی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے کہ اگر اس جوہر قابل کے لئے خارجی محرک نہ بھی ہوتا تو وہ ماحول کو منوّر کر دینے کی استعداد رکھتا تھا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر خاص فضل تھا کہ آپ کو بکثرت ایسے رفیق اور مددگار عطا فرمائے جو خود بھی ایک طبعی جوش ان نیک کاموں کے لئے رکھتے تھے جن کو سرانجام دینے کے لئے آپ عالم وجود میں آئے۔

آپ کی رفیقۂ حیات حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی پیاری بیٹی حضرت سیّدہ امۃ الحیٔ بھی آپ کے لئے ایک ایسا سلطانِ نصیر ثابت ہوئیں۔ اپنے عظیم الشان باپ سے علم کی لگن ورثہ میں پانے والی سعید فطرت اور سعید روح رکھنے والی یہ عظیم خاتون اگرچہ بہت تھوڑی دیر اس عالمِ فانی میں زندہ رہیں اور اپنے محبوب آقا حضرت مصلح موعودؓ کے ساتھ انہیں محض گنتی کے چند سال رفاقت کے نصیب ہوئے لیکن ان چند سالوں میں ہی انہوں نے اپنی فطری سعادت اور خدمتِ دین کی بے پناہ لگن کے باعث حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے دل میں اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ خواتین میں حضرت خلیفۃ المسیح کے درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھوانے کا سہرا بھی آپ ہی کے سر تھا۔

اور احمدی مستورات کو ایک باقاعدہ تنظیم کی لڑی میں پرونے کی اوّلین محرّک بھی آپ ہی تھیں یہ آپ کی فانی زندگی کا ایک لافانی کارنامہ تھا جو آپ کی یاد کو زندہ و پایندہ رکھے گا۔ ؏

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

کا مصرعہ آپ پر خوب صادق آتا ہے۔ کیونکہ دینِ محمدؐ کے عشق نے آپ کو بھی ان لافانی وجودوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جن کا نقش جریدۂ عالم پر ہمیشہ ہمیش کے لئے ثبت ہو جاتا ہے۔ لجنہ اماءُ اللہ کی داغ بیل اس طرح پڑی کہ احمدی مستورات کی فلاح و بہبود اور ان کی دینی ترقی کے لئے حضرت سیّدہ امۃ الحیؓ کے والہانہ جذبہ سے متأثر ہو کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعودؓ نے سیّدہ موصوفہ کے ساتھ مشورہ کے بعد قادیان کی احمدی مستورات کے نام ۱۵ ردسمبر ۱۹۲۲ء کو ایک کھلی چٹھی لکھی جس کا مضمون حسبِ ذیل تھا:-

"ہماری پیدائش کی جو غرض و غایت ہے اس کو پورا کرنے کے لئے عورتوں کی کوششوں کی بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح مَردوں کی۔ جہاں تک میرا خیال ہے عورتوں میں اس کا احساس ابھی تک پیدا نہیں ہوا کہ اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہماری زندگی کس طرح صرف ہونی چاہیئے جس سے ہم بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کر کے مرنے کے بعد اسی دنیا میں اللہ تعالےٰ کے فضلوں کے وارث ہوسکیں۔ اگر غور کیا جائے تو اکثر عورتیں اس امر کو محسوس نہیں کریں گی کہ روزمرّہ کے کاموں کے سوا کوئی اَور بھی کام ان کے کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔

دشمنانِ اسلام میں عورتوں کی کوششوں سے جو رُوح بچوں میں پیدا کی جاتی ہے اور جو بدگمانی اسلام کی نسبت پھیلائی جاتی ہے اس کا اگر کوئی توڑ ہوسکتا ہے تو وہ عورتوں ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے اور بچوں میں قربانی کا مادہ پیدا کیا جا سکتا تو وہ بھی ماں ہی کے ذریعے سے کیا جاسکتا ہے۔ پس علاوہ اپنی رُوحانی وعلمی ترقی

کے آئندہ جماعت کی ترقی کا انحصار بھی زیادہ تر عورتوں کی کوشش پر ہے چونکہ بڑے ہو کر جو اثر بچے قبول کر سکتے ہیں وہ ایسا گہرا نہیں ہوتا جو بچپن میں قبول کرتے ہیں اس طرح عورتوں کی اصلاح بھی عورتوں کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے ان امور کو مدِ نظر رکھ کر میں ایسی بہنوں کو جو اس خیال کی مؤید ہوں اور مندرجہ ذیل باتوں کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ دعوت دیتا ہوں کہ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے وہ مل کر کام شروع کریں۔ اور مہربانی کر کے مجھے اطلاع دیں تا کہ اس کام کو جلد سے جلد شروع کر دیا جائے۔

۱۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ عورتیں باہم مل کر اپنے علم کو بڑھانے اور دوسروں تک اپنے حاصل کردہ علم کو پہنچانے کی کوشش کریں۔

۲۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے لئے ایک انجمن قائم کی جائے تا کہ اس کام کو باقاعدگی سے جاری رکھا جا سکے۔

۳۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس انجمن کو چلانے کے لئے قواعد ہوں جن کی پابندی ہر کسی پہ واجب ہو۔

۴۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ قواعد و ضوابط سلسلہ احمدیہ کے پیشکردہ اسلام کے مطابق ہوں اور اس کی ترقی اور اسکے استحکام میں ممد ہوں۔

۵۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ جلسوں میں اسلام کے مسائل خصوصًا ان پر جو اس وقت کے حالات کے مطابق ہوں مضامین پڑھے جائیں اور وہ خود اراکین انجمن کے لکھے ہوئے ہوں تا کہ اس طرح علم کے استعمال کرنے کا ملکہ ان میں پیدا ہو۔

۶۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ جماعت میں وحدت کی روح قائم رکھنے کے لئے جو بھی خلیفۂ وقت ہو اس کی تیار کردہ سکیم کے مطابق اور اس کی ترقی کو مدِ نظر رکھ کر تمام کارروائیاں ہوں۔

۷۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ پڑھانے کے لئے ایسے مضامین پر جنہیں انجمن ضروری سمجھے اسلام سے واقف لوگوں سے لیکچر کروائے جائیں۔

۸- اس امر کی ضرورت ہے کہ تم اتحادِ جماعت کو بڑھانے کے لئے ایسی ہی کوشاں رہو جیسے کہ ہر مسلمان کا فرض قرآن کریم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے مقرر فرمایا ہے اور اس کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار رہو۔

۹- اس امر کی ضرورت ہے کہ اپنے اخلاق اور رُوحانیت کی طرف ہمیشہ متوجّہ رہو اور صرف کھانے پینے پہننے تک اپنی توجّہ کو محدُود نہ رکھو۔ اس کے لئے ایک دوسرے کی پوری مدد کرنی چاہیئے ایسے ذرائع پر غور اور عمل کرنا چاہیئے۔

۱۰- اس بات کی ضرورت ہے کہ بچّوں کی تربیت میں اپنی ذمہ داری کو خاص طور پر سمجھو اور انہیں دین سے غافل بد دل اور سُست بنانے کی بجائے چست ہوشیار تکلیف برداشت کرنے والے بناؤ اور دین کے مسائل جس قدر ہیں۔ اس سے ان کو واقف کرو۔ اور خدا۔ رسولؐ مسیح موعودؑ اور خلفاءؓ کی محبّت۔ اطاعت کا مادہ ان کے اندر پَیدا کرو۔ اسلام کی خاطر اور اس کے منشاء کے مطابق اپنی زندگیاں خرچ کرنے کا جوش ان میں پیدا کرو اور اس کام کو بجا لانے کے لئے تجاویز سوچو اور ان پر عمل درآمد کرو۔

۱۱- اس امر کی ضرورت ہے کہ جب مِل کر کام کیا جائے تو ایک دوسرے کی غلطیوں سے چشم پوشی کی جائے اور صبر اور ہمّت سے اصلاح کی کوشش کی جائے نہ کہ ناراضگی اور خفگی سے تفرقہ بڑھایا جائے۔

۱۲- چونکہ ہر ایک کام جب شروع کیا جائے تو لوگ اس پر ہنستے ہیں اور ٹھٹھہ کرتے ہیں اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کی ہنسی اور ٹھٹھہ کی پرواہ نہ کی جائے اور بہنوں کو ہنسوں یا طعنوں یا مجالس کے ٹھٹھوں کو بہادری اور ہمّت سے برداشت کرنے کا سبق دیا جائے اور اس کی طاقت پَیدا کرنے کا مادہ پہلے ہی حاصل کیا جائے۔ تاکہ اس نمونہ کو دیکھ کر دوسری بہنوں کو اس کام کی طرف توجّہ پیدا ہو۔

۱۳۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس خیال کو مضبوط کرنے کے لئے اور ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے اپنی ہمخیال بنائیں اور یہ کام اس صورت میں چل سکتا ہے کہ ہر ایک بہن جو اس مجلس میں شامل ہو اپنا فرض سمجھے کہ وہ دوسری بہنوں کو بھی اپنا ہمخیال بنائے گی۔

۱۴۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کام کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے صرف وہی بہنیں اس انجمن کی کارکن بنائی جائیں جو ان خیالات سے پوری طرح متفق ہوں۔ اگر کسی وقت خدانخواستہ کوئی متفق نہ رہے تو وہ بہ طیبِ خاطر انجمن سے علیحدہ ہو جائے یا بصورتِ دیگر علیحدہ کی جائے۔

۱۵۔ کیونکہ جماعت کسی خاص گروہ کا نام نہیں۔ چھوٹے، بڑے، امیر غریب سب کا نام جماعت ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس انجمن میں غریب امیر کی کوئی تفریق نہ ہو۔ بلکہ غریب اور امیر دونوں میں مساوات اور محبت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک دوسرے کی تحقیر اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کا مادہ دلوں سے دور کیا جائے۔ کہ باوجود مدارج میں فرق کے اصل میں سب مرد بھائی بھائی اور سب عورتیں بہنیں بہنیں ہیں۔

۱۶۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ عملی طور پر خدمتِ اسلام کے لئے اور اپنی غریب بہنوں اور بھائیوں کے لئے بعض طریق تجویز کئے جائیں اور ان کے مطابق عمل کیا جائے۔

۱۷۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ چونکہ سب مدد اور سب برکت اور سب کامیابیاں اللہ تعالےٰ کی طرف سے آتی ہیں اس لئے دعا کی جائے اور کروائی جائے کہ ہمیں وہ مقاصد الہام ہوں جو ہماری پیدائش میں اس نے مدِنظر رکھے ہیں اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے بہتر سے بہتر ذرائع پر اطلاع اور پھر ان ذرائع کے احسن سے احسن طور پر پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا خاتمہ بخیر کرے۔ آئندہ آنیوالی

نسلوں کی بھی اپنے فضل سے راہ نمائی کرے اور اس کام کو اپنی مرضی کے مطابق ہمیشہ کے لئے جاری رکھے یہاں تک کہ اس دنیا کی عمر تمام ہو جائے۔ اگر آپ ان خیالات سے متفق ہوں اور ان کے مطابق اور موافق قواعد پر جو انجمن میں پیش کر کے پاس کئے جا رہے ہیں اور کئے جائیں گے عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تو مہربانی کر کے اس کاغذ پر دستخط کر دیں بعد میں ان قواعد پر ہر ایک بہن سے علیحدہ علیحدہ دستخط لے کر اقرار و معاہدے لئے جائیں گے۔" (الازہار لذوات الخمار ص۶۸ مطبوعہ ۱۹۶۴ء)

اس ابتدائی تحریک پر انجمن میں شمولیت کے لئے جو ابھی رضا کارانہ رنگ رکھتی تھی قادیان کی سترہ خواتین نے دستخط کئے۔ اس کے بعد حضور کے ارشاد پر ۲۵ دسمبر ۱۹۲۲ء کو یہ دستخط کرنے والی خواتین حضرت امّ المؤمنینؓ کے گھر میں جمع ہوئیں جہاں آپ نے نماز ظہر کے بعد ایک مختصر سی تقریر فرمائی۔ اس تقریر میں آپ نے مستورات کی انجمن کے قیام کا باقاعدہ اعلان فرماتے ہوئے اس کا نام "لجنہ اماء اللہ" رکھا۔ لجنہ اماء اللہ کے قواعد وضوابط بعد ترتیب رسالہ "تادیب النساء" میں شائع ہوئے۔

حضور کے افتتاحی خطاب کے بعد لجنہ اماء اللہ کی ممبرات نے متفقہ طور پر حضرت اُمّ المؤمنینؓ سے درخواست کی کہ وہ اس مجلس کی صدارت قبول فرماویں۔ چنانچہ حضرت اُمّ المؤمنین کی صدارت میں یہ تاریخی اجلاس شروع ہوا۔ لیکن آپ نے آغاز ہی میں حضرت سیدہ امّ ناصرؓ حرم اوّل حضرت خلیفۃ المسیح کا بازو پکڑ کر بڑی شفقت سے اپنی جگہ انہیں صدارت کی مسند پر بٹھا دیا اور بقیہ اجلاس انہیں کی صدارت میں ہوا۔ حضرت اُمّ المؤمنینؓ نے کمال محبت اور شفقت اور دعا کے ساتھ اپنی صدارت کی خلعت جو سیدہ اُمّ ناصرؓ کو عطا فرمائی وہ تازندگی آپ ہی کے پاس رہی۔ اور وفات کے دن تک یعنی ۳۱ جولائی ۱۹۵۸ء تک ۳۶ سال کے طویل عرصہ میں لجنات نے ہر بار آپ ہی کو اپنا صدر منتخب کیا۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت سیدہ مریم صدیقہ اُمّ متین حرم ثالث حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کے عہدۂ صدارت پر متمکن ہوئیں اور تا دم تحریر بفضل تعالیٰ آپ نہایت خوش اسلوبی سے یہ خدمت سرانجام دے رہی ہیں اور لجنہ کا قدم روز بروز ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ فالحمد للہ۔

لجنہ اماء اللہ کے پہلے تاریخی اجلاس میں منصبِ صدارت کا معاملہ طے ہوجانے کے بعد پہلی جنرل سیکرٹری حضرت سیّدہ امۃ الحیٔ مرحومہ منتخب ہوئیں۔ چنانچہ آپ بڑے انہماک اور جاں سوزی کے ساتھ اس خدمت میں مصروف ہوگئیں اور صدرِ مجلس کی رہنمائی میں اس نوزائیدہ مجلس کے تنظیمی ڈھانچے کو منظم اور مربوط کرنے میں شب و روز کوشاں رہیں۔ لیکن افسوس کہ آپ کی لاانتہاہی نیک تمنّاؤں کے مقابل پر اس دارِ فانی میں آپ کی زندگی کے بہت تھوڑے دن باقی تھے۔ سیکرٹری لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کا عہدہ سنبھالے ہوئے ابھی ایک سال بھی پورا نہ گزرا تھا کہ بچّے کی قبل از وقت پیدائش کے باعث آپ خطرناک طور پر بیمار ہوگئیں اور یہی بیماری آپ کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد خاکسار کی والدہ مرحومہ حضرت سیّدہ مریم بیگمؓ جو بعد میں اُمِّ طاہر کے نام سے جماعت میں معروف ہوئیں جنرل سیکرٹری لجنہ اماء اللہ منتخب کی گئیں آپ بھی ۵ مارچ ۱۹۴۴ء یعنی اپنی وفات کے دن تک مسلسل اس عہدہ پر فائز رہیں اور صدرِ مجلس کے ساتھ کامل اطاعت اور تعاون کی روح کو قائم رکھتے ہوئے خدمتِ دین کی توفیق پاتی رہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی ازواج کا ایک تنظیم کی لڑی میں منسلک ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے تابع ہوکر سالہاسال تک اس طرح خدمتِ دین بجالانا کہ تنظیمی ڈھانچہ میں ایک ادنیٰ سا رخنہ بھی نہ پڑا ہو اور اس نازک رشتہ کے باوجود تعاون کے شیشہ پر بال برابر بھی آنچ نہ آئی ہو یہ ایسی بات ہے جو ان مبارک خواتین کی عظمتِ کردار سے بڑھ کر اس عظیم شوہر کی عظمتِ کردار کا پتہ دیتی ہے جو نظم و نسق قائم رکھنے کی حیرت انگیز صلاحیتیں رکھتا تھا۔ آپ ایک ایسے عظیم الشان مربّی تھے کہ بسا اوقات ایک لفظ زبان سے کہے بغیر آپ کی شخصیت سے تربیت کا از خود ہونے والا ترشّح گردوپیش کو ریڈیائی لہروں کی طرح اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ کرلیتا تھا اور ماحول کی ہر چیز خود بخود ٹھیک اپنے مقام پر بیٹھ جاتی تھی۔ اور اپنے دائرۂ کار سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ بجلی کے بڑے بڑے ٹرانسمیٹر جس طرح اپنے ماحول کو ایسی طاقتور لہروں سے بھر دیتے ہیں کہ بسا اوقات اُن کا پیغام سننے کے لئے بجلی سے چلنے والے ریڈیو سیٹ کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور بہرے

سے بنا ہوا ایک سادہ سا آلہ جسے (CRYSTAL SET) کہا جاتا ہے براہِ راست اُن کی آواز پکڑ کر سُنانے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کو چلنے کی قوت اسی فضاء سے حاصل ہو جاتی ہے جس کو ٹرانسمیٹر نے طاقت سے بھر دیا ہوتا ہے۔

بہرکیف حضرت خلیفۃ المسیح کو اس امر کی حاجت نہ تھی کہ اپنی ازواج کو باہم تعاون کی تلقین کریں۔ دینی کاموں میں اختلاف اور جھگڑوں سے منع کریں یا آئے دن اُن کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو سلجھانے میں اپنا قیمتی وقت صرف کریں۔ نہیں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ جب سے مَیں نے ہوش سنبھالا اپنی والدہ کی وفات تک ایک مرتبہ بھی ایسا واقعہ نہ دیکھا نہ سُنا کہ ہماری بڑی والدہ حضرت اُمِّ ناصرؓ نے حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں یہ شکایت پیش کی ہو کہ مریم نے فلاں دینی معاملہ میں میرے ساتھ تعاون نہیں کیا یا اس کے برعکس کبھی میری والدہ نے کوئی شکوہ اس نوعیت کا حضور کی خدمت میں پیش کیا ہو کہ لجنہ اماء اللہ کے معاملات میں حضرت سیّدہ اُمِّ ناصرؓ نے میرے ساتھ یہ غیر مشفقانہ سلوک کیا ہے۔ سالہا سال تک لجنہ اماء اللہ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس ہمارے گھر میں منعقد ہوتے رہے۔ کبھی ایک مرتبہ بھی مَیں نے کوئی تکرار نہیں سُنی کوئی خلافِ ادب بات نہیں دیکھی۔ گویا رشتوں کی طبعی رقابت کو اس مقدس دائرے میں قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی جیسے کسی مقدس عامل نے اپنی جادو کی چھڑی سے ان اجلاسات کے ماحول میں ایک دائرہ سا کھینچ دیا ہو کہ یہ رقابت اس دائرہ کے اندر قدم رکھنے کی قدرت نہ پائے۔

یہ مزاج شناس بیویاں اپنے خاوند کے مزاج پر نظر رکھتی تھیں اور اُن کے دل اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دھڑکتے تھے۔

ابتداء میں اس تنظیم کو قادیان تک ہی محدود رکھا گیا تا کہ حضور کی براہِ راست تربیت کے تحت جب اس انجمن کا ایک اعلیٰ نمونہ تیار ہو جائے تو اسے ملکی اور پھر عالمی تنظیم کی شکل دی جائے۔ چنانچہ جب کچھ عرصہ کے بعد لجنہ کی تنظیم قادیان میں مستحکم ہو گئی اور مستورات میں تنظیمی امور عمدگی سے چلانے کی اہلیت پیدا ہو گئی، تو آپ نے اس تحریک کو بیرونی جماعتوں میں جاری فرما دیا۔ آج یہ تنظیم پھیل کر ایک عظیم الشان عالمی تنظیم بن چکی ہے جس میں سب دنیا کی احمدی مستورات شامل ہیں اور بڑے

زبردست جذبے کے ساتھ تعمیری کاموں میں مصروف ہیں۔ اس تنظیم کی غرض و غایت چند الفاظ میں یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ اسلامی تصوّر کے مطابق معاشرہ میں عورت کو وہ مقام حاصل ہو جس سے وہ ایک عرصہ سے محروم چلی آرہی تھی اور وہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنی ان تمام صلاحیتوں کو تعمیری کاموں کے لئے اسلامی تعلیم کے مطابق بروئے کار لاسکے۔ جو قبل ازیں نظر انداز ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اس غرض سے لجنہ اماء اللہ کی تنظیم کو مختلف شعبوں میں منقسم کر دیا گیا اور عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تبلیغی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر خصوصی زور دیا گیا۔ اسی طرح عورتوں میں مالی قربانی کی جو رُوح پائی جاتی تھی اس کو منظم طور پر بڑھاوا دینے کی کوشش کی گئی یہاں تک کہ چندوں کے معاملہ میں عورتیں مردوں کے مساوی اور متوازی ایسا عمدہ نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوگئیں کہ نہ صرف اپنی تنظیم کی ضروریات میں وہ مردوں کی محتاج نہ رہیں بلکہ اہم جماعتی چندوں میں بھی خالصتہً اپنے ہی ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی ہی تنظیم کے ذریعہ انہوں نے مالی قربانی کے میدان میں عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے۔ آپ نے لجنہ کو قدم قدم چلنا سکھایا اور ابتداء میں گہری اور تفصیلی دلچسپی لے کر اسے اعلیٰ نظم و نسق کے اصول سکھائے۔

اِصلاحی اُمور میں باریک بینی

فطرتِ انسانی تو ایک ہی ہے لیکن جب یہ مَرد اور عورت کے ظروف میں ڈھلتی ہے تو ان ظروف کی نسبت سے الگ الگ شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ تربیت کے دَوران حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی اس باریک فرق پر نظر رہتی تھی اور آپ جب عورتوں کو نصائح فرماتے تو خصوصیّت کے ساتھ ان عادات اور رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے جو طبعاً مَردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے فرمایا:-

> "اگر کسی بات پر اجتماع ہو جاوے اور بعد میں اس میں کوئی نقصان ہی ہو تو اس کا اظہار کرنا اور پھر بار بار اس کو دُہرانا کہ ہماری رائے مانتے یا یہ رائے مانتے تو ایسا نہ ہوتا، یہ نفاق ہے۔ پھر یہ کہ خلیفۂ وقت کی اطاعت کرو۔ انجمنیں تو سالہا سال

تک چلتی ہیں۔ اس لئے خلیفہ کی اطاعت چاہیئے۔ جو بھی خلیفہ ہو۔
خلیفہ کے لئے کسی خاندان، کسی دائرہ کی شرط کی ضرورت نہیں۔ جس
کو خدا بنا دے۔" (احمدی خاتون۔ فروری ۱۹۲۳ء صفحہ ۹۰)

اسی طرح ایک اور موقع پر جب یہ تجویز زیرِ غور تھی کہ مستورات کے ہوسٹل کے لئے صرف مستورات ہی چندہ دیں۔ اور اس کی اپیل بھی حضرت اُمّ المؤمنین نصرت جہاں بیگم رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہو تو حضور نے فوراً اس احتمال کو بھانپ لیا کہ اس تجویز کو قبول کرنے کے نتیجہ میں عورتوں میں ایسا خطرناک رجحان پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک ہی گاڑی کے دو متوازی پہیے بننے کی بجائے وہ اپنی علیحدہ ایک سمت متعین کرنے کی سوچنے لگیں اور یہ سمجھیں، کہ عورتوں کی قربانی میں چونکہ مَردوں کا کوئی دخل نہیں اس لئے کیوں نہ وہ مردوں کی رہنمائی سے کُلّیتہً مستغنی ہو جائیں۔ چنانچہ اس تجویز پر فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"اس بات کو قطعی طور پر ردّ کرتا ہوں کہ حضرت اُمّ المؤمنین کی طرف سے اس چندہ کے لئے اپیل ہو اور عورتیں چندہ دیں۔ یہ اپیل میری طرف سے ہو اور مرد چندہ دیں۔ اگر یہ چندہ عورتوں پر رکھا گیا تو یہ بات آئندہ ہماری ترقی میں حائل ہو جائے گی اور ہمارے گھروں کا امن برباد کر دے گی اور یہ احساس پیدا ہوگا کہ مرد عورتوں کے لئے کچھ نہیں کر رہے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ پس اس بات کو مَیں ردّ کرتا ہوں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ہی اس کام[1] کے لئے چندہ دیں اور عورتوں کو بتا دیں کہ ہم ان کی تعلیم و تربیت کے لئے انتہائی کوشش کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۸ء صفحہ ۵۹ تا ۶۱)

جہاں آپ اس بات کو ناجائز قرار دیتے تھے کہ مَردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ہو وہاں اس امر کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے کہ عورتیں اسلامی آداب کی حدود کے اندر رہتے ہوئے بے شک جلسوں اور اجتماعات میں مَردوں کی طرح بھرپور شمولیت کریں۔ چنانچہ اس غرض سے اکثر جلسوں میں مستورات کے لئے مسجد کی ایک طرف قناتیں لگوا کر علیحدہ انتظام کیا جاتا اور عورتیں بڑے شوق کے ساتھ بکثرت جمعہ کے علاوہ دیگر جلسوں

[1] لڑکیوں کے ہوسٹل کا اجراء

میں بھی شریک ہوئیں۔ اکثر مسجد اقصیٰ میں ایسے اجتماعات ہوتے اور بعض اوقات مستورات جگہ کی تنگی کے باعث ملحقہ احمدی گھرانوں کی چھتوں پر چڑھ کر جلسوں میں شرکت کرتیں۔ ہمارا گھر چونکہ مسجد اقصیٰ سے بہت قریب تھا اس لئے وہاں ہمیشہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ آواز پہنچانے کا انتظام کیا جاتا لیکن اس کے باوجود دینی مجالس میں شمولیت کے بارہ میں عورتوں کا ذوق و شوق ان زائد انتظامات پر بھی غالب آجاتا اور جگہ کی تنگی کا احساس برقرار رہتا۔

آپ اس بات کو بھی پسند فرماتے کہ مجاہدینِ اسلام کی روانگی اور واپسی کے وقت مستورات کی تنظیم کی طرف سے نہ صرف ان کو دعوت دی جائے بلکہ ایسے موقع پر ایڈریس بھی پڑھے جائیں تاکہ رفتہ رفتہ عورتوں میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ وہ عورتوں ہی کو نہیں بلکہ مردوں کو بھی خطاب کر سکیں۔ جو ایڈریس پڑھے جاتے اُن پر بھی آپ تبصرہ فرماتے اور جس طور سے پڑھے جاتے اس پر بھی کبھی تنقید اور کبھی حوصلہ افزائی کے کلمات فرما کر ہر رنگ میں عورتوں کی تربیت کی کوشش کرتے۔

حضرت مولانا جلال الدین شمس رضی اللہ عنہ جب دسمبر ۱۹۳۱ء میں بلادِ شام و فلسطین میں نہایت کامیابی سے فریضۂ تبلیغ ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں مستورات کی طرف سے بھی استقبالیہ دیا گیا جس میں انہوں نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اس پر جو تبصرہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ آپ کے اندازِ تربیت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

> "سب سے پہلے مَیں اس امر پر خوشی کا اظہار کرتا ہوں کہ جو ایڈریس لجنہ کی طرف سے پیش ہوا وہ اگلے ایڈریسوں سے بہت سی باتوں میں بہتر تھا۔ ایک تو اس لئے کہ ان حقیقی مطالب پر مشتمل تھا جو ایسے مواقع کے لئے ہوتے ہیں۔ دوسرے اس لحاظ سے بھی کہ اس کے مطالب نہایت ہی سادہ عبارت میں بغیر کسی تکلّف و بناوٹ یا غیر ضروری طوالت کے ظاہر کئے گئے ہیں اگر کمزوری تھی تو آواز میں۔ شاید ابھی عورتوں میں ہمت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ بغیر ہانپنے

اور کابینے کے مجالس میں اپنا مدّعا ظاہر کر سکیں۔ اس کے لئے ہمیں کچھ مدّت اور انتظار کرنا پڑے گا۔"
(مصباح یکم اپریل ۱۹۲۷ء صہ ۵)

تعلیمِ نسواں

عورتوں کی تعلیم کی طرف ابتداء ہی سے آپ کو بڑی گہری توجّہ تھی۔ لیکن آپ کے ذہن میں تعلیم کا اصل اور بنیادی تصوّر دینی تھا اور دُنیاوی تعلیم کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ خصُوصًا عورتوں کو چونکہ گھروں میں اپنی اولاد کی دینی تربیت کا اوّلین ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اس لئے ان کی دینی تعلیم کی طرف آپ کی خصوصی نظر تھی۔ چنانچہ آپ نے اس سلسلہ میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جس طرح تم (مرد) اپنے لئے پڑھنا ضروری سمجھتے ہو۔ اسی طرح ان کے لئے بھی پڑھنا ضروری سمجھ کر ان کو پڑھاؤ، تا تمہارے گھر ایسے نہ ہوں کہ صرف تم ہی قرآن جاننے والے ہو اور باقی جاہل۔ بلکہ تمہاری عورتیں بھی جانتی ہوں.....
ہماری جماعت کے وہ لوگ جنہوں نے اپنی عورتوں کو دین سے واقف نہیں کیا اُن کا تلخ تجربہ ہمارے سامنے موجود ہے کہ ان کے فوت ہو جانے کے بعد ان کے بیوی بچے غیر احمدی ہو گئے۔"
(الفضل ۵ ر اگست ۱۹۱۶ء)

اسی مضمون پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"دین کی تعلیم عورتوں کو بھی ضرور دینی چاہیئے۔ کیونکہ جب تک دونوں پہلو درست نہ ہوں اس وقت تک انسان خوبصُورت نہیں کہلا سکتا........ مَیں تو باوجود اس کے کہ اور بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ گھر میں ضرور پڑھاتا ہُوں۔ کیونکہ عورتوں کا پڑھانا بہت ضروری ہے........
میرا دل چاہتا ہے کہ ہماری نسلیں، ہم سے بھی زیادہ

احمدیت کا جوش لے کر اُٹھیں۔ تا خدا تعالیٰ کا دین اطراف
عالم میں پھیل جائے۔ اس لئے مَیں یہ نہیں کہتا کہ تم قرآن
پڑھو بلکہ یہ بھی کہتا ہوں کہ اپنی عورتوں اور بچّوں کو بھی پڑھاؤ
تاکہ جس طرح تم اس دنیا میں اکٹھے ہو۔ اگلے جہان میں بھی اکٹھے
ہی رہو۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ مَیں اس کو سختی سے محسوس
کر رہا ہوں اس لئے سخت تاکید کرتا ہوں کہ عورتوں کو پڑھانے
کی طرف جلدی توجہ کرو۔" (الفضل ۵ راگست ۱۹۱۶ء)

اس امر پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہ عورتوں کے تعلیمی ادارے کس قسم کے ہونے چاہئیں جو ان کی کم از کم تعلیمی ضرورتوں کو پورا کر سکیں آپ نے حسب ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی:۔

"عورتوں کے سکول ایسے ہوں کہ لکھائی پڑھائی یا حساب کی
ابتدائی باتیں سکھا کر یکدم عورتوں کو جو دینی باتیں ہیں۔ ان
کی طرف لے جایا جائے۔ قرآن شریف پڑھایا جائے۔ مسائل
سکھائے جائیں تاکہ بچّوں کی تربیت کر سکیں۔ امورِ خانہ داری
سکھائے جائیں۔ اس کے لئے ان کے واسطے کتابیں لکھی جائیں"
(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۲ء صفحہ ۶۳)

مخلوط تعلیم کے اگرچہ آپ خلاف تھے لیکن اس امر کے خلاف نہیں تھے کہ ایک ہی کمرہ میں اگر لڑکے لڑکیوں کا علیحدہ با پردہ نشست کا انتظام ہو تو انہیں اکٹھی تعلیم دے دی جائے۔ جب ۱۹۲۹ء میں پہلی بار یہ سوال پیدا ہوا تو چونکہ ہائی سکول کے طلبہ اور طالبات کا معاملہ تھا جن کی عمریں ناپختہ ہوتی ہیں بلکہ وہ عمر کے ایسے دور میں سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ نفسیاتی لحاظ سے ٹھوکر کھانے کے احتمالات بہت زیادہ ہوتے ہیں آپ نے اس امر کی اجازت نہیں دی اور فرمایا:۔

"میرے نزدیک اس میں تو کوئی حرج نہیں کہ اگر ضرورت ہو تو
درمیان میں پردہ ڈال کر ایک طرف لڑکے بیٹھے ہوں اور
دوسری طرف لڑکیاں۔ اور تعلیم حاصل کریں۔ لیکن خرابیاں

کمرۂ تعلیم میں نہیں پیدا ہوا کرتیں بلکہ کمرہ سے باہر پیدا ہوتی ہیں
لڑکے لڑکیوں کا اکٹھے آنا جانا، ملنا جلنا اس سے نقائص پیدا
ہو سکتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ جب
تک لڑکیوں کے لئے علیحدہ تعلیم کا انتظام مکمل نہیں ہوتا ہائی
سکول کی اعلیٰ کلاسوں کے ساتھ لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کریں
اور علیحدہ پردہ میں تعلیم پاتی رہیں مگر اسی نقص کی وجہ سے
کہ ان کا ملنا جلنا مناسب نہیں اس تجویز کو منظور نہیں کیا گیا۔"

(الفضل ۲۵ر جنوری ۱۹۲۹ء صفحہ ۵)

بعد ازاں تقسیم ملک کے بعد ربوہ میں جب یہی سوال ایم۔اے عربی کی تعلیم کے سلسلہ میں اُٹھایا گیا تو چونکہ ایسے لڑکے اور لڑکیوں کا سوال تھا جو ایک پختہ عمر کو پہنچ چکے ہوتے ہیں اور تعلیم کا دائرہ بھی نسبتاً محدود تھا اس لئے آپ نے بشرح صدر اس کی اجازت دے دی۔ مستورات کے تعلیمی معیار کو بڑھانے کی طرف آپ کی گہری توجہ بہت جلد باثمر ثابت ہوئی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۱ء تک ان کوششوں کے جو نیک نتائج ظاہر ہوئے ان کا ذکر کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں آپ نے اطمینان کا اظہار فرمایا:۔

"ہماری جماعت میں عورتوں کی تعلیم اس سُرعت سے پھیل
رہی ہے خصوصاً قادیان میں کہ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد
عورتوں کی جہالت کی بلا سے ہم لوگ بچ جائیں گے۔"

(الفضل ۲۹ر ستمبر ۱۹۳۱ء صفحہ ۵-۶)

جہاں تک تعلیم قرآن کا تعلق ہے اس کی غیر معمولی اہمیّت کے پیش نظر اور مستورات میں قرآن دانی کا اعلیٰ ذوق پیدا کرنے کے لئے آپ ابتداء میں ایک دن چھوڑ کر باقاعدگی سے قرآنِ کریم کا درس دیتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۸ء تک اسی طرح جاری رہا۔ لیکن اس سال انفلوئنزا کے شدید حملہ کے باعث کچھ عرصہ کے لئے اس میں تعطّل ہو گیا۔ مگر آپ کو قرآن کریم سے جو محبت تھی اس کے نتیجہ میں آپ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ زیادہ دیر تک اس اہم کام میں تعطّل رہے۔ لہذا ابھی صحت پوری طرح بحال بھی نہیں ہوئی تھی کہ آپ نے دوبارہ یہ درس جاری فرما دیا۔ البتہ خلافت کی

بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث اب یہ درس ہفتہ میں تین دن کی بجائے صرف ایک دن بروز ہفتہ ہونے لگا۔ ماسوا اس کے کہ آپ قادیان سے باہر تشریف لے گئے ہوں یا بسبب بیماری درس دینا ناممکن ہو بڑے التزام کے ساتھ آپ آخر عمر تک ہمیشہ یہ درس دیتے رہے۔ قادیان کے زمانہ میں درس کا انتظام اس گھر میں ہوتا رہا جہاں راقم الحروف کا بچپن گزرا۔ نماز فجر کے ساتھ ہی منتظم خواتین ہمارے گھر پر قبضہ کر لیا کرتی تھیں اور جو بچے اس وقت تک سوئے ہوتے انہیں بھی اُٹھا کر ان کے بستر لپیٹ دیئے جاتے۔ ناشتہ کے بعد حضور درسِ قرآن کے لئے تشریف لاتے۔ مستورات کو اس درس میں شامل ہونے کا اتنا شوق تھا کہ دُور دُور کے محلوں سے جوق در جوق حاضر ہوتیں یہاں تک کہ بعض اوقات صحن میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے سیڑھیوں اور چھتوں پر بیٹھنا پڑتا۔

تقسیم ملک کے بعد بھی یہ سلسلہ دارالہجرت ربوہ میں اسی طرح باقاعدگی سے جاری رہا۔ اور آخری علالت تک اِلّا ماشاء اللہ آپ باقاعدہ ہر ہفتہ درس دیتے رہے یہاں تک کہ جس دن آپ نے آخری درس دیا وہی دن آپ کی آخری طویل علالت کا پہلا دن تھا۔

طبیعت مضمحل ہونے کے باوجود آپ درس کے لئے تشریف لے آئے لیکن درس کے معًا بعد ہمت نے جواب دے دیا۔ اچانک بیماری کا شدید حملہ ہوا جس کے باعث تادمِ واپسیں آپ صاحبِ فراش رہے۔

مجلسِ شوریٰ میں عورتوں کی نمائندگی

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ رفتہ رفتہ احمدی مستورات ٹھوس تربیت حاصل کر کے اس بلند مقام کو حاصل کر لیں جو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عظیم رہنمائی۔ تربیت اور قوتِ قدسیہ کے نتیجہ میں آج سے چودہ سو برس پہلے عورت کو حاصل ہوا تھا۔ آپ احمدی عورت میں ایسی عظمتِ کردار دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ پوری خود اعتمادی سے اپنی عصمت کی مکمل حفاظت کے ساتھ ساتھ تمام اہم ملی خدمات میں برابر کی حصہ دار بن جائے۔ اور جس طرح قرونِ اُولیٰ

میں پردہ کی تعلیم صحابیات کے لئے ایسی زنجیر نہ بن سکی کہ وہ گھروں میں مقید ہو کر قومی خدمات سے محروم ہو جائیں اسی طرح اس زمانہ میں بھی پردہ کی تعلیم عورت کو قومی مسائل میں عملی کردار ادا کرنے سے باز نہ رکھ سکے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر پردہ کی حکمت کو اور کون سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ آپؐ کے زمانہ میں عورت کی طرزِ زندگی پر نظر دوڑاتے ہوئے یہ مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں کہ زمانۂ نبویؐ میں مسلمان عورت عصمت اور پاکیزگی کی فصیل میں قلعہ بند ہونے کے باوجود اہم قومی اور ملی خدمات سے محروم نہ رہتی تھی۔ اگر ایک طرف جہاد بالسیف کے دوران وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور متفرق ہنگامی خدمات سرانجام دیتی تو دوسری طرف زمانۂ امن میں جہاد بالقرآن کے اہم فریضہ میں مصروف ہو جاتی۔ بچوں ہی کی نہیں بڑوں کی بھی تربیت کرتی۔ عورتوں ہی کی نہیں مردوں کو بھی تعلیم دیتی۔ ضرورت پڑتی تو مردوں سے خطاب کرتی اور وقت آنے پر امورِ مہمہ میں راہنمائی کے فرائض بھی سرانجام دیتی۔ انہی میں سے وہ عظیم اور بلند پایہ خاتون بھی تھیں جن کے متعلق بڑے بڑے علماء دین اور فقہاء اور مفسرین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے جو دین سیکھا اس میں سے آدھا دین ہمیں اس عظیم خاتون یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وساطت سے پہنچا۔

جب مجلسِ شوریٰ جماعتِ احمدیہ میں عورت کی نمائندگی کا سوال پیدا ہوا تو یہی وہ تصور تھا جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ذہن میں تھا اور عورت کا یہی وہ مقام تھا جس پر آپ احمدی خاتون کو فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ کئی سال تک یہ سوال مجلس مشاورت میں اٹھتا رہا اور بڑی زوردار علمی بحثوں کا محرک بنا رہا۔ جہاں بعض علماء کی طرف سے شرعی بنیادوں پر اس کی شدید مخالفت ہوتی رہی کہ عورتیں بحیثیت نمائندہ مجلس مشاورت خود مردوں کی موجودگی میں اپنی رائے کا اظہار کیا کریں۔ وہاں بعض علماء نے شرعی بنیادوں ہی پر عورت کے حق نمائندگی اور حقِ تخاطب کی پُرزور تائید کی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ وقتاً فوقتاً اس بحث پر تبصرے فرماتے رہے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ جہاں ایک طرف اس مسئلہ کے شرعی پہلوؤں پر ہر طرح کی بحث و تمحیص کے بعد اس کے حسن و قبح

کے سب پہلو نکھر کر سامنے آجائیں وہاں مردوں کو بھی ذہنی طور پر اس امر پر تیار کیا جا سکے کہ وہ عورت کو سوسائٹی میں وہ مقام دینے پر آمادہ ہو جائیں جو اس کا جائز اسلامی مقام ہے۔ جب بحث راستے سے بھٹک کر ایسی پگڈنڈیوں پر چل پڑتی جن کا رُخ کسی دوسری طرف ہوتا تو آپ مقررین کو واپس اصل راستے کی طرف کھینچ لاتے اور نہایت پاکیزہ اور واضح تبصرہ فرما کر اصل مبحث کی طرف ذہنوں کو منتقل فرما دیتے۔ زیر نظر مسئلہ کے وقتی پہلو پر ہی آپ کی نظر نہ تھی بلکہ بار بار آپ بحث میں حصّہ لینے والوں کی توجہ مستقبل کی طرف بھی مبذول کرواتے اور انہیں خبردار کرتے کہ آج کے فیصلے کی غلطی یا درستی اسلام کے مستقبل پر بہت دیرپا اور دُور رس اثر ڈالنے والی ہوگی۔ اس لئے پوری احتیاط اور باریک بینی کے ساتھ اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا جائے۔ آپ نے اس اجلاس میں مستورات کو بھی بولنے کی اجازت دی اور روایتی جھجک کی بنا پر جب کوئی بولنے پر آمادہ نہ ہوا تو آپ نے بار بار اصرار کے ساتھ انہیں اس بحث میں حصّہ لینے پر آمادہ کیا۔ غرضیکہ اس موضوع پر آپ کے ارشادات اور فیصلے مسلمان عورت سے متعلق صحیح اسلامی تصور کو بڑی عمدگی سے واضح کرتے ہیں اور یقیناً ان میں سے بعض اقتباسات کو پیش کرنا قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوگا[1] حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے ممبرانِ مجلس مشاورت کی اصولی راہنمائی کرتے ہوئے فرمایا:۔

> ”مَیں دوستوں کو نصیحت کرتا ہُوں کہ وہ رائے دیتے وقت .....
> یہ بات مدِنظر رکھیں کہ ان کے فیصلہ کا نتیجہ انہی کے آگے آئیگا اگر عورتوں کو مجلس مشاورت میں رائے دینے کا حق دینا نقصان کا موجب ہوگا تو ان کی غلطی انہی کے لئے نقصان دِہ ہوسکتی ہے اور اگر حق نہ دینا اسلام کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہوگا تو اس کا خمیازہ بھی انہی کو بھگتنا پڑے گا ....

مسلمان عورتوں کے حالات میں تغیّر

> مَیں جہاں تک سمجھتا ہُوں اس وقت تک مسلمان عورتوں کی زبان نہیں۔ وہ خاموش گھروں میں بیٹھی ہیں مگر اس میں بھی شک

---

[1] تفصیلات کے لئے رپورٹ ہائے مجلس مشاورت سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۳۱ء کا مطالعہ کیا جائے۔

نہیں کہ وہ خموش گھر اور تاریک گھر اور ان میں رہنے والا بے زبان حصۂ انسانی بہت سے تغیرات میں مبتلا ہے۔ ان تاریک کونوں میں علم کا نور پہنچ رہا ہے۔ ان بند گھروں کے دروازے کھل رہے ہیں۔ بے زبان عورتیں زبان حاصل کر رہی ہیں۔ اگرچہ ابھی بہت کمزور حالت ہے۔ بہت چھوٹی سی تحریک ہے۔ بہت معمولی سی رَو ہے۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ یہ رَو بڑھ کر رہے گی اور طاقتور ہو کر سامنے آجائے گی۔

اسلام کیا کہتا ہے

پس ہمیں کوئی فیصلہ کرنے سے قبل یہ سوچ لینا چاہیئے کہ اگر اسلام صریح طور پر یہ کہتا ہے کہ عورت کو مجلسِ شوریٰ میں مشورہ دینے کا حق نہیں تو ہم اس بات کے لئے آمادہ اور تیار ہیں کہ عورتوں کی ترقی کے تمام ذرائع استعمال کریں۔ مگر انہیں مجلس میں مشورہ دینے سے روکے رہیں گے۔ لیکن اگر اس بارہ میں شک ہو ہمارے نفوس ہمیں علیحدگی میں کہیں کہ عورتوں کو یہ حق نہ دینے کی نص تو نہیں اور باوجود اس کے گھروں میں امن اور سوسائٹی کے تعلقات کو تباہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو اس دن سے ڈرنا چاہیئے جبکہ یہ رَو جو دوسروں میں چل رہی ہے۔ ہماری جماعت اور ہمارے گھروں میں بھی چلنے لگے اور ہمارے نصف حصّہ کو یہ کہنے پر مجبور کر دے کہ ہم اس مذہب سے تعلق نہیں رکھنا چاہتیں جو عقل تو دیتا ہے لیکن رائے دینے کا حق نہیں دیتا۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ پرسوں نہیں تو اترسوں یہ سوال اُٹھے گا اور اس زور سے اُٹھے گا کہ کوئی اسے دبا نہیں سکے گا۔ . . . .

ہمیں اس بارے میں جو کچھ دیکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ نص

صریح ہمیں عورتوں سے مشورہ لینے سے روکتی ہے یا اس کا حکم دیتی ہے اگر حکم دیتی ہے تو ہم کہیں گے آؤ ہمارے سر آنکھوں پر بیٹھو اور ہم ان سے ضرور مشورہ لیں گے۔ لیکن اگر نصِ صریح روکتی ہے تو کہیں گے جاؤ جو چاہو کر لو ہم تمہیں مشورہ میں شریک نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر یہ نہیں تو پھر استنباط سے کام لیں گے اور اسے نصِ صریح قرار نہیں دیں گے یہ استنباط غلط بھی ہو سکتا ہے اور درست بھی۔

یہ نصِّ صریح نہیں

کہا گیا ہے کہ رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو شاورھم فی الامر میں شریک نہیں کیا اور یہ نصِ صریح ہے کہ ان کو مشورہ میں شامل نہیں کرنا چاہیئے مگر مَیں کہہ چکا ہوں اس بارے میں جو استدلال پیش کرکے نصوص قرار دی گئی ہیں وہ دراصل نصوص نہیں ہیں۔ اگر ایسی باتوں کو نصوص قرار دیا جائے تو دین میں بڑے رخنے پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۳۸ تا صفحہ ۱۴۴)

دَورانِ بحث آپ نے زائرین کے باپردہ احاطہ میں موجود خواتین کو صرف اس بحث میں حصّہ لینے کی اجازت ہی نہ دی بلکہ ان کی مسلسل خاموشی کو توڑنے کے لئے بار بار اصرار کے ساتھ انہیں آمادہ کیا کہ وہ ضرور اپنا مافی الضمیر خود واضح کریں چنانچہ آپ کی حسب ذیل پُر زور تحریک کے بعد عملاً ایک خاتون مکرمہ استانی میمونہ صوفیہ صاحبہ نے بحث میں حصّہ لیتے ہوئے دَورِ نَو کی وہ پہلی احمدی عورت ہونے کا تاریخی اعزاز حاصل کیا جس نے باقاعدہ مجلس شوریٰ کو مخاطب کیا ہو۔

آپ کے اس پُر اثر خطاب میں سے جس کے نتیجہ میں احمدی عورت کو رسم و رواج کی کئی صدیوں میں کھویا ہوا اپنا حقِ تخاطب از سرِ نو حاصل ہوا ایک اقتباس حسبِ ذیل ہے:۔

"مَیں زبانی طور پر پھر اس بات کو دُہراتا ہوں تاکہ دُوسرے بھی اس امر کے شاہد ہو جائیں کہ اگر کوئی عورت بولنا چاہے تو بول سکتی ہے۔ اگر ہمارے خاندان کی کوئی عورت بولنا چاہے تو مَیں اُسے اجازت دیتا ہُوں۔ اگر کسی اور خاندان کی ہو تو وہ اپنی بہتری اور بھلائی سوچ لے۔ شرعی طور پر مَردوں کو مخاطب کر کے کچھ کہنا منع نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کھڑی ہو کر لیکچر دیتی تھیں۔ جنگِ صفین[1] اور دوسرے مواقع پر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت ایک رنگ میں عورت کی قسمت کا فیصلہ درپیش ہے۔ جو چاہیں بول سکتی ہیں۔" (رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۲۹ء)

بالآخر مجلس مشاورت میں عورت کی حقِ نمائندگی کی بحث بہت طول پکڑ گئی اور آپ نے محسوس فرمایا کہ نمائندگان کا ایک قابلِ ذکر حصّہ جس میں سِلسلہ کے بعض جیّد علماء بھی شامل تھے فی الوقت ذہنی طور پر اس بات کو بھی قبول کرنے پر تیار نظر نہیں آتا کہ عورت پَردہ کی پابندی کے ساتھ باقاعدہ نمائندہ کے طور پر مجلس مشاورت میں شامل ہو کر مَردوں کے ساتھ بحث اور غور و فکر میں حصّہ لے۔ تو آپ نے مستقل فیصلہ محفوظ رکھتے ہُوئے وقتی طور پر حسب ذیل فیصلہ صادر فرمایا جس پر تا حال اسی طرح عمل ہو رہا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اب مَیں دوسری تجاویز کو آئندہ کے لئے ملتوی کرتا ہُوں۔ لیکن عورتوں کے حقِ نمائندگی کے متعلق یہ عارضی فیصلہ کرتا ہوں کہ جہاں جہاں لجنہ اماء اللہ قائم ہیں، وہ اپنی لجنہ رجسٹرڈ کرا لیں یعنی میرے دفتر سے اپنی لجنہ کی منظوری حاصل کر لیں۔ پھر اُن کو جنہیں میری اجازت سے منظور کیا جائیگا مجلس مشاورت کا ایجنڈا بھیج دیا جایا کرے گا۔ وہ رائے لکھ کر پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس بھیج دیں۔ مَیں جب ان امور کا فیصلہ کرنے لگوں گا تو ان کی آراء کو بھی مدِّنظر

[1] سہو ہے۔ جنگِ جمل

رکھ لیا کروں گا۔ اس طرح عورتوں، مردوں کے جمع ہونے کا
جھگڑا ابھی پیدا نہ ہوگا اور مجھے بھی پتہ لگ جائے گا کہ عورتیں
مشورہ دینے میں کہاں تک مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان کی
رائیں فیصلہ کرتے وقت مجلس میں سُنا دی جائیں گی یہ عارضی
طور پر اُن کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں باقی گفتگو اگلے سال
کر لی جائے گی "

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۲۷ بحوالہ تاریخ لجنہ اماء اللہ جلد اوّل صفحہ ۲۶۳)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے اس فیصلہ کے بعد گو مجلس مشاورت میں تبادلہ خیالات کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن اس اہم قومی اور معاشرتی سوال نے ذہنوں میں جو ہیجان پیدا کر دیا تھا اس کی صدائے بازگشت قادیان کی فضاء میں دیر تک سُنائی دیتی رہی۔ نجی تبادلہ خیال کے علاوہ مدارس میں بھی یہی مسئلہ مباحثوں کا عنوان بن گیا۔ اور اخبارات میں بھی مضامین لکھے جانے لگے۔ نشرو اشاعت کے اداروں پر چونکہ مردوں کا غلبہ تھا اس لئے عورتوں کو بجا طور پر حق تلفی کا اندیشہ ہؤا اور انہوں نے اپنے پیارے امام کی خدمت میں اس بارہ میں دردمندانہ فریاد کی۔ اس پر حضور کا جواب الفضل میں شائع ہؤا۔ جس میں آپ نے فرمایا:۔

" الفضل میں ایک مضمون ان کے حق نمائندگی کے خلاف جب
چھپا تو لجنہ کی طرف سے میرے پاس شکایت آئی کہ اب ہم کیا
کریں۔ جامعہ احمدیہ میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی اور وہاں حق
نمائندگی کے مخالفین کو کامیاب قرار دیا گیا ہے۔ مَیں نے کہا
تم بھی میٹنگ کرو جس میں اس مسئلہ پر بحث کرو کہ مردوں کا
مجلسِ مشاورت میں حق نمائندگی ہے یا نہیں اور پھر فیصلہ کر دو
کہ نہیں "

(الفضل ۷ر جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۴)

عورت کے حقوق اور معاشرہ میں اس کے کردار کے بارہ میں حق نمائندگی کے سوال کے دَوران جو بحثیں شروع ہوئیں اگرچہ وہ بڑی فکر انگیز تھیں مگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے نزدیک مسئلہ کی اہمیت اس سے بہت

زیادہ تھی کہ چند دن یا چند سالوں کی ذہنی ورزش کا سامان مہیا کر کے یہ مسئلہ نظر سے اوجھل ہونے دیتے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے ایک بار پھر جماعت کو اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا اور حسب ذیل الفاظ میں اہل فکر کو جھنجوڑا۔ آپ نے فرمایا۔

"اب گزشتہ دو سال سے پردہ کے خلاف جو تحریک شروع ہو گئی ہے میں نے کئی سال قبل اس کے متعلق خبر دی تھی اور مجلس شوریٰ میں اسی وجہ سے حقوق رائے دہندگی کا سوال اُٹھایا تھا کہ جس حد تک شریعت عورتوں کو حق دیتی ہے، ہمارا فرض ہے کہ دیں تا انہیں اسلامی تعلیم سے ہمدردی پیدا ہو اور جب تک ان کے اندر یہ جذبہ پیدا نہ ہو وہ عورتوں کو اسلامی احکام پر چلنے کی دعوت نہیں دے سکتیں اور عورتوں میں تبلیغ نہیں کر سکتیں ...... لیکن جو عورت خود اپنے کو مظلومہ سمجھے وہ دوسری کو کیا تبلیغ کر سکے گی۔ پس دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ عورتوں کو تعلیم بھی دی جائے، اور ان کے حقوق بھی۔ جو حقوق اسلام نے انہیں دیئے ہیں ہمیں چاہیئے کہ خود ہی دے دیں تا ان کے اندر جوش پیدا ہو اور وہ اسلام کی جنگ اپنی جنگ سمجھ کر لڑیں۔"

(الفضل ۲۴ر جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۸)

احمدی عورت نے آپ کی قیادت میں ترقی کی جو منازل طے کیں اس کی تفصیل بڑی دلچسپ اور اہل اسلام کے لئے بہت ہی حوصلہ افزا ہے۔ عورتوں کے خصوصی تعلیمی اداروں کا قیام۔ جامعہ نصرت کے ذریعہ کالج کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام جس میں دینی تربیت کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ پھر لجنہ اماء اللہ کی تنظیم کے ذریعہ مختلف دستکاریوں کی تربیت۔ عورتوں کی علیحدہ کھیلوں کا انتظام، ان میں مباحثوں اور تقاریر کا ذوق وشوق پیدا کرنا مضمون نگاری کی طرف انہیں توجہ دلانا۔ ان کے لئے علیحدہ اخبارات اور رسالوں کا اجراء اور جلسہ سالانہ جماعت احمدیہ میں عورتوں کے علیحدہ اجلاس جن میں خواتین مقررین کا خواتین کو خود خطاب کرنا۔ ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں اس رنگ

میں مہیا کرنا کہ غریب سے غریب احمدی بچی بھی کم از کم بنیادی تعلیم سے محروم نہ رہے۔ ان تمام امور کا ذکر ایک الگ کتاب کا متقاضی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اپنے باون سالہ دَورِ خلافت میں آپ نے ہندوستان کی پسماندہ عورت کو ایک ادنیٰ مقام سے اُٹھا کر ایک ایسے بلند مقام پر فائز کر دیا جسے دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت کے نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور بعض امور میں وہ دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ اور آزاد ممالک کی عورتوں کے لئے بھی ایک مثال بن گئی قومی اور ملی امور میں قربانیوں کی چند مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔ عام تعلیمی معیار کو بھی دیکھیں تو احمدی عورت نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے خلافت کے آخری ایام میں ایک موقع پر جب ربوہ کی مردم شماری کی گئی تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ اگرچہ مَردوں میں سے ایک معمولی تعداد ناخواندگان کی بھی پائی گئی لیکن عورتیں خدا تعالےٰ کے فضل سے سو فیصدی خواندہ نکلیں۔

ان متفرق تعمیری۔ انتظامی اور فلاحی کوششوں کے علاوہ آپ کی ان تقاریر کا اثر جو بالخصوص مستورات کو مخاطب کر کے کی جاتیں اتنا گہرا اور وسیع تھا کہ اُسے کسی پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔ لجنہ اماء اللہ کی طرف سے ایک کتاب "الازہار لذوات الخمار" آپ کے ایسے ہی خطابات سے اقتباسات اخذ کر کے شائع کی گئی ہے جو آپ نے مستورات کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں فرمائے ان کا مطالعہ نہایت بصیرت افروز ہے قارئین یقیناً ان کے مطالعہ سے ایک خاص حظ اُٹھائیں گے۔

عموماً ناصح سے لوگ بھاگا کرتے ہیں اور تربیتی تقریروں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ لیکن احمدی مستورات کا یہ عالم تھا کہ آپ کے پاکیزہ کلمات سننے کے لئے ناسازگار حالات میں بھی سفر اختیار کر کے پہنچتیں اور ایسے اخلاص اور جذبہ کے ساتھ ان نصائح کو سنتیں اور ان پر عمل پیرا ہوتیں کہ اس کی مثال غالباً دنیا کی کسی اَور انجمن کسی اَور قوم اور کسی اَور مُلک میں نظر نہیں آئے گی۔ مکرم و محترم حاجی محمد الدین صاحب تہال ضلع گجرات کی ایک روایت اس ضمن میں احمدی عورتوں کی قلبی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ ایک دفعہ جب حضور سیالکوٹ ایک لیکچر کے سلسلہ میں تشریف لائے اور حاجی صاحب نے تقریر سننے کے شوق میں سیالکوٹ کا رختِ سفر باندھا تو انکے بیان کے مطابق:۔

"بیوی سے بھی نہ رہا گیا اور بمنّت مجھ سے التجا کی کہ اگرچہ بچے بیمار ہیں اور مَیں خود بھی کمزور ہوں مگر کیا ہی اچھا ہو اگر مجھے ہمراہ لے چلیں تا کہ مَیں بھی حضور کا رُوح پرور کلام سُن سکوں۔ زندگی کا اعتبار نہیں نہ معلوم پھر موقع ملے یا نہ ملے۔ حالات اجازت تو نہ دیتے تھے مگر اس کے اخلاص کے مدّنظر مع بال بچّہ اسے بھی ساتھ لے لیا اور سیالکوٹ پہنچا۔ حضور کا پُر شوکت لیکچر جو دن کو مَردوں میں قرار پا چکا تھا سُنکر ہم محظوظ ہُوئے۔ مگر رات کو مستورات میں حضور کی جو تقریر ہونی تھی بوجہ علالتِ طبع اس کے متعلق اعلان ہو گیا کہ نہیں ہو گی۔ اس اعلان کو سُنکر مرحومہ کو ناقابلِ برداشت صدمہ ہؤا اور طبیعت کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ناچار اس کے اصرار و ایماء سے ایک درخواست اس کے نام سے بحضور خلیفۃ المسیح الثانی فضل عمر رضی اللہ عنہ لکھی گئی کہ مستورات بھی حضور کی تقریر سُننے کے لئے سخت بے قرار ہیں براہِ نوازش ہمیں بھی کچھ نہ کچھ سُنایا جائے جسے ازراہِ شفقت حضور نے شرفِ قبولیت بخش کر پنجابی زبان میں وہ تقریر دلپذیر فرمائی جو فرائضِ مستورات کے نام سے اُردو کا لباس پہن کر کتابی صورت میں مدت سے شائع ہو چکی ہے اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مرحومہ مرض الموت سے بیمار ہُوئی اور چند روز کے بعد مجھے اور تین بچوں کو جن میں سب سے بڑا ڈاکٹر محمد احمد ہے[۱] اور جو آجکل قابل اور کامیاب ڈاکٹر کی حیثیت سے عدن میں اپنے فن کی پریکٹس کر رہا ہے ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے کر اپنے مولیٰ سے جا ملی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"

(الفضل ۱۳ر فروری ۱۹۴۱ء صفحہ ۶)

---

[۱] ڈاکٹر محمد احمد صاحب موصوف جو اپنے والدین کی طرح نہایت مخلص اور فدائی احمدی تھے۔ وفات پا چکے ہیں۔

احمدی عورت کے دل میں آپ کی جو قدر و منزلت تھی اور جس طرح وہ آپ کو دل و جان سے عزیز جانتی تھیں اس کے پُر خلوص اور بے ساختہ اظہار کا ایک موقع اس وقت پیدا ہوُا جب قبل از تقسیمِ مُلک آپ ایک مرتبہ شدید بیمار ہو گئے۔ طبعًا ساری جماعت سخت فکر مند تھی اور متواتر دعاؤں اور صدقات میں مشغول تھی لیکن اس موقع پر قادیان کی عورتوں نے اپنی دعاؤں میں زیادہ سوز و گداز پیدا کرنے کے لئے جو خاص طریق اختیار کیا وہ عہدِ خلافت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ بہت سی ماؤں نے رات کے وقت اپنے بچوّں کو دودھ پلانا چھوڑ دیا۔ تاکہ جب وہ بھوک سے بلبلائیں تو ان کی چیخ و پکار کو سُنکر ماؤں کے دل بھی تڑپ اٹھیں۔ اور وہ اس شدید کرب کی حالت میں اپنے پیارے امام کے لئے پُر درد دعائیں کر سکیں۔

ایسا ہی ہوتا رہا۔ اور کئی راتوں تک قادیان کی فضا میں ماؤں کی پُر درد دُعاؤں کے ساتھ ملی ہوئی بچوں کے رونے اور بلبلانے کی آواز ایک عجیب دردانگیز ارتعاش پیدا کرتی رہی۔ ؎

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

حصُولِ مقاصد میں لجنہ کی کامیابی کا مختصر ذکر

احمدی مستورات کی عالمی تنظیم لجنہ اماء اللہ نے آپ کی عظیم الشان قیادت میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان کے تفصیلی ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں محض بعض خصوصی سرگرمیوں کی ایک مختصر سی فہرست پیش کرنے پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔

(۱) لجنہ اماء اللہ کی سرکردگی میں احمدی مستورات کے چندہ سے "مسجد فضل" لندن کے علاوہ یورپ میں دو اور مساجد تعمیر ہوئیں۔ ایک ہالینڈ کی مسجد مبارک اور دوسری ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن کی مسجد "نصرت جہاں"۔ ان دونوں مساجد پہ جو بھی خرچ اٹھا وہ سارے کا سارا احمدی عورتوں کے چندہ سے جمع ہوُا۔ قادیان سے ہجرت کے بعد جماعت کے مرکزِ ثانی ربوہ میں مجلسی اور تنظیمی سرگرمیوں کو زیادہ منظم کرنے کے لئے لجنہ اماء اللہ مرکزیہ نے اپنے دفاتر کے علاوہ ایک ہال بھی تعمیر کرایا۔ جس میں ایک عرصہ تک مجلسِ شوریٰ کے اجلاس بھی منعقد ہوتے رہے۔ اب دفاتر لجنہ

کے احاطہ میں مستورات کا سالانہ اجتماع اور جلسہ سالانہ ہوتا ہے۔ عورتوں کی اس تعمیری ترقی پر اظہارِ خوشنودی کرتے ہوئے سیدنا حضرت امیرالمومنین خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ایک مجلس مشاورت کے موقع پر فرمایا:۔

"اس وقت ہم لجنہ اماء اللہ کی مہربانی سے ان کے ہال میں بیٹھے ہیں۔ گویا مجلس شوریٰ کا اجلاس جو یہاں ہو رہا ہے اس کے لئے ہم عورتوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ مَیں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ عورتیں، مَردوں سے چندوں کے معاملہ میں پیش پیش ہیں۔ اور ان میں بیداری پائی جاتی ہے۔ .... مَیں نے ایک دفعہ مَردوں کو طعنہ دیا تو ایک دوست نے کہا کہ عورتیں آخر ہم سے ہی لے کر دیتی ہیں۔ مَیں نے کہا عورتیں پھر بھی ہمت والی ہیں۔ تمہارے پاس روپیہ ہوتا ہے لیکن تم دیتے نہیں ان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا پھر بھی وہ تم سے لے کر دے دیتی ہیں۔ یہ کیا ہی شاندار عمارت ہے جو عورتوں نے بنائی ہے۔ یہ ہال میرے مشورہ سے بنا ہے۔ اور عمارت کو اس طرز سے بنایا گیا ہے، کہ ضرورت پڑے تو اسے وسیع کر لیا جائے۔"

(رپورٹ مجلس مشاورت ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱)

(۲) لجنہ اماء اللہ کی سرپرستی میں ۱۹۲۶ء سے ایک ماہنامہ "مصباح" باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے جو احمدی مستورات کا بین الاقوامی رسالہ ہے۔

(۳) عورتوں میں شوقِ مطالعہ اور ان کی دینی اور دنیوی معلومات میں اضافہ کے لئے لجنہ اماء اللہ نے ۱۹۲۷ء سے ایک لائبریری قائم کی ہوئی ہے۔ جس کا نام لجنہ کی پہلی سیکرٹری جنرل اور حضورؓ کی حرم دوم سیّدہ امۃ الحیؓ کی یادگار کی بنا پر "امۃ الحی لائبریری" رکھا گیا ہے۔ یہ مرکزِ کتب دن بدن رُو بہ ترقی ہے۔ اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنے مقصدِ قیام کو پورا کر رہا ہے۔

(۴) لجنہ اماء اللہ کی سرکردگی میں جماعت کی مستورات تمام دینی اور قومی خدمات میں مَردوں کے ساتھ ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہیں۔ مثلاً تحریک سیرت النبیؐ۔ تحریک

کشمیر۔ تحریک جدید، جس کے بارہ میں حضور نے مستورات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتیں بھی اپنے آپ کو تحریکِ جدید کی والنٹیرز سمجھیں۔ اسی طرح ملکی انتخابات اور تقسیم ملک کے وقت کے فسادات میں مصیبت زدگان کی امداد کے سلسلہ میں لجنہ اماء اللہ نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ خدمتِ اسلام کی خاطر تحریک وقفِ زندگی میں بھی مستورات نے اپنے حالات اور دائرۂ عمل کے مطابق پُرجوش حصّہ لیا۔

جماعتی نظام کے تابع مستورات کی تعلیم کے لئے جو ادارے قائم کئے گئے اُن کے علاوہ خالصتہً لجنہ اماء اللہ کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ ہر تعلیم یافتہ عورت کم ازکم ایک اَن پڑھ عورت کو لکھنا پڑھنا سکھا وے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً لجنہ اس اہم تحریک کی طرف توجّہ دیتی رہی۔ جس کے نتائج خدا تعالےٰ کے فضل سے بہت خوشکن اور حوصلہ افزا ہیں

(۵) ۱۹۲۶ء سے پہلے جلسہ سالانہ کے موقع پر عورتیں اپنا الگ جلسہ نہیں کرتی تھیں۔ لیکن حضورؓ کے ارشاد کے مطابق اسی سال سے عورتیں اپنا الگ جلسہ سالانہ کرنے لگیں۔ جس سے عورتوں کو اپنے مسائل پر سوچنے اور تقریریں کرنے کے بہترین مواقع ملے۔ اس کے علاوہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ خود بھی عورتوں کے جلسہ میں ایک تقریر ضرور فرماتے۔ جس میں عورتوں کے دینی، تمدنی، معاشرتی مسائل زیرِ بحث لاتے۔ اور عورتوں کو موقع ملتا کہ وہ اپنے حقوق و فرائض کو سمجھیں اور اس طرح زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کی جدوجہد میں صنفِ نازک کی بہترین راہ نمائی کر سکیں۔

(۶) گھریلو دستکاری کے فروغ کی غرض سے جلسہ سالانہ کے موقع پر زنانہ دستکاری نمائش بھی لگائی جاتی ہے جس میں مختلف مقامات کی لجنات بڑے شوق سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہیں اور اپنی مساعی سے تیار کردہ اشیاء مقابلہ کے لئے رکھتی ہیں۔ اور اس طرح اسے فنی معلومات کے تبادلے کا بہترین ذریعہ بنانے کی پُوری پُوری کوشش کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کچھ عرصہ سے لجنہ کے شعبہ دستکاری کے زیرِ نگرانی ایک انڈسٹریل سکول بھی جاری کیا گیا ہے جو بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے مقامات کی بعض لجنات نے بھی انڈسٹریل ہوم جاری کر رکھے ہیں۔

(۷) جلسہ سالانہ کے علاوہ لجنہ اماء اللہ ہر سال اپنا تین روزہ سالانہ اجتماع بھی منعقد کرتی ہے جس نے اب لجنہ اماء اللہ کی سرگرمیوں کے ایک بہت بڑے مظہر کی صُورت

اختیار کر لی ہے۔ اس اجتماع کے موقع پر جو بالعموم اکتوبر کے مہینہ میں ہوتا ہے۔ مستورات کی مجلس شوریٰ منعقد ہوتی ہے۔ جس میں سالانہ بجٹ کے علاوہ سال بھر کے عمومی پروگرام دنیا بھر کی لجنات کے باہمی روابط کے ذرائع اور مقامی مجالس کی مشکلات کے متعلق غور و خوض کیا جاتا ہے۔ مرکزی لجنہ کی مساعی کی مفصل رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔ اسی طرح علمی اور تقریری مقابلے کروائے جاتے ہیں۔ عام اصلاحی اور علمی تقاریر کا پروگرام بھی بڑا مفید اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح بھی مستورات کو خطاب فرماتے ہیں۔ جس میں انہیں ان کے مقصدِ زندگی اور جماعتی فرائض کی طرف عارفانہ انداز میں توجہ دلائی جاتی ہے۔

غرض عورتوں کی بیداری اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے میں اس اجتماع کو ایک نمایاں دخل حاصل ہوتا جا رہا ہے اور دن بدن اس کی دلچسپیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

(۸) دینی کتب کے امتحانات لینا۔ تربیتی کلاسز منعقد کرنا اور عورتوں کی بہبود کے دوسرے پروگرام بنانا بھی اس مجلس کی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ ۱۹۲۵ء سے لجنہ اماء اللہ کی زیرِ نگرانی چھوٹی بچیوں کی بھی ایک مجلس قائم ہے۔ جس کا نام بعد میں حضورؓ نے "ناصرات الاحمدیہ" رکھا۔ اس مجلس میں سات سے پندرہ سال کی عمر تک کی بچیاں بطور ممبر شامل ہوتی ہیں جو اپنے عہدہ دار خود چنتی ہیں اور لجنہ اماء اللہ کی زیرِ نگرانی اپنے الگ الگ اجتماع منعقد کرتی ہیں اور دوسری علمی و دینی دلچسپیوں میں حصہ لیتی ہیں۔ ابتدائے عمر سے ہی بچیوں میں دینی اور علمی شوق پیدا کرنے کے لحاظ سے یہ مجلس بہت مفید کام کر رہی ہے۔ شروع سے بچیوں کی تربیت اس انداز میں کی جاتی ہے، کہ بڑی ہو کر جب وہ لجنہ اماء اللہ کی ممبر بنیں تو اپنے تجربہ اور تربیت کی بناء پر مجلس کی بہترین کارکن ثابت ہوں۔

لجنہ اماء اللہ کی تنظیم اغیار کی نظر میں

بلاشبہ اس تنظیم کا روشن ماضی اور درخشندہ حال ایک خوش آئند مستقبل کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دن دُور نہیں جب خلفائے سلسلہ کی رُوحانی قیادت کے تابع مستورات کی یہ انجمن دنیا بھر کی سب دوسری خواتین کی انجمنوں

سے زیادہ وقیع اور وسیع اور طاقتور اور حقوقِ نسواں کی سب سے زیادہ اور سچّی علمبردار بن جائے گی۔ یہ بات محض خوش فہمی نہیں بلکہ حقائق کا رُخ اور جماعت احمدیہ کا کردار بتا رہا ہے کہ لازمًا ایک دن ایسا ہو کر رہے گا۔

اب تو خدا تعالیٰ کے فضل سے جماعت کی تعداد اور وقار پہلے سے بہت بڑھ چکے ہیں جب ابھی ابتدائی دَور تھا اور جماعت ہر لحاظ سے نسبتًا بہت کمزور اور غیر معروف تھی۔ اس وقت بھی جماعتی تنظیموں کا بہ نظرِ غور جائزہ لینے والوں نے اس تنظیم میں عظمت کے ایسے آثار دیکھے تھے جن کا نوٹس لئے بغیر وہ نہ رہ سکے۔ تحریکِ سیرت کے مشہور لیڈر مولانا عبدالمجید قرشی نے اپنے اخبار "تنظیم" امرتسر میں لکھا:۔

"لجنہ اماء اللہ قادیان" احمدیہ خواتین کی انجمن کا نام ہے۔ اس انجمن کے ماتحت ہر جگہ عورتوں کی اصلاحی مجالس قائم کی گئی ہیں۔ اور اس طرح پر ہر وہ تحریک جو مَردوں کی طرف سے اٹھتی ہے خواتین کی تائید سے کامیاب بنائی جاتی ہے اس انجمن نے تمام خواتین کو سلسلہ کے مقاصد کے ساتھ عملی طور پر وابستہ کر دیا ہے۔ عورتوں کا ایمان مَردوں کی نسبت زیادہ مخلص اور مربوط ہوتا ہے۔ عورتیں مذہبی جوش کو مَردوں کی نسبت زیادہ محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ لجنہ اماء اللہ کی جس قدر کارگزاریاں اخبار میں چھپ رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ احمدیوں کی آئندہ نسلیں موجودہ کی نسبت زیادہ مضبوط اور پُرجوش ہوں گی اور احمدی عورتیں اس چمن کو تازہ دم رکھیں گی۔ جس کا مرورِ زمانہ کے باعث اپنی قدرتی شادابی اور سرسبزی سے محروم ہونا لازمی تھا۔"[1]

اسی طرح لجنہ کے ماہنامہ "مصباح" کو پڑھ کر ایک آریہ سماجی اخبار "تیج" کے ایڈیٹر نے یہ لکھا:۔

"میرے خیال میں یہ اخبار اس قابل ہے کہ ہر ایک آریہ سماجی اس کو دیکھے۔ اس کے مطالعہ سے انہیں احمدی عورتوں کے متعلق جو

---

[1] اخبار "تنظیم" امرتسر ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۶ بحوالہ "تاثرات قادیان" صفحہ ۲۳۱

یہ غلط فہمی ہے کہ وہ پردہ کے اندر بند رہتی ہیں اس لئے کچھ کام نہیں کرتیں فی الفور دُور ہو جائے گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ عورتیں باوجود اسلام کے (نعوذ باللہ۔ ناقل) ظالمانہ حکم کے طفیل پردہ کی قید میں رہنے کے کس قدر کام کر رہی ہیں۔ اور ان میں مذہبی اخلاص اور تبلیغی جوش کس قدر ہے ہم استری سماج قائم کر کے مطمئن ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ احمدی عورتوں کی ہر جگہ باقاعدہ انجمنیں ہیں اور جو وہ کام کر رہی ہیں اس کے آگے ہماری استری سماجوں کا کام بالکل بے حقیقت ہے۔ مصباح کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ احمدی خواتین ہندوستان۔ افریقہ۔ عرب۔ مصر۔ یورپ اور امریکہ میں کس طرح اور کس قدر کام کر رہی ہیں۔ ان کا مذہبی احساس اس قدر قابلِ تعریف ہے کہ ہم کو شرم آنی چاہیئے۔ چند سال ہوئے ان کے امیر نے ایک مسجد کے لئے پچاس ہزار روپے کی اپیل کی اور یہ قید لگا دی کہ یہ رقم صرف عورتوں کے چندہ سے ہی پوری کی جائے۔ چنانچہ پندرہ روز کی قلیل مدت میں ان عورتوں نے پچاس ہزار کی بجائے پچپن[1] ہزار روپیہ جمع کر دیا۔"[2]

---

[1] صحیح یہ ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ جمع ہوا۔ [2] "تیج" ۲۵ر جولائی ۱۹۲۷ء